1



اہلحدیث اور سیاست

تصنیف

مولانا نذیر احمد رحمانیؒ

ناشر

ادارۃ البحوث الاسلامیۃ والدعوۃ والافتاء بالجامعۃ السلفیۃ بنارس

اہلِ حدیث

اور

سیاست

تالیف

حضرت مولانا نذیر احمد رحمانی رح

ناشر

ارۃ البحوث الاسلامیۃ والدعوۃ والافتاء

جامعة سلفية - بنارس - الهند

طبع اول: ۱۹۷۲ء ایک ہزار
طبع دوم: ۱۹۸۶ء ایک ہزار

کتابت: انور جمالی بنارس
طباعت: سلفیہ پریس بنارس

پتے:
(۱) مکتبہ سلفیہ، ریوڑی تالاب وارانسی ۲۲۱۰۱۰
(۲) مکتبہ ترجمان ۱۱۱۶، اردو بازار جامع مسجد دہلی۔

عرضِ ناشر

کتاب "اہلحدیث اور سیاست" کو اپنے مؤلف اور موضوع کے اعتبار سے جو اہمیت حاصل ہے، اس سے لوگ واقف ہیں۔ لیکن ساتھ ہی بعض دوسرے اعتبارات کی وجہ سے یہ کتاب ہمارے لیے "یادگار تاریخی تصنیف" کا درجہ رکھتی ہے۔

افرادِ جماعت اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہیں کہ جامعہ سلفیہ (مرکزی دارالعلوم) کے قیام کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد نئے حالات میں کتاب و سنت پر عمل کی اس دعوت کو تحریر و تقریر کے ذریعہ عام کیا جائے، جس کے لیے ہمارے اسلاف نے تن من دھن کی قربانی پیش کی تھی، اور ماضی قریب میں انگریزوں اور دیگر اسلام دشمن طاقتوں سے نبرد آزما ہوئے تھے۔ سرزمینِ بالاکوٹ پر ۱۸۳۱ء میں شہادت کا جو واقعہ پیش آیا وہ جہاد فی سبیل اللہ کی انتہا نہ تھی، بلکہ دعوتِ عمل بالکتاب والسنۃ کے لیے ایک نئے رخ کا آغاز تھا، اور تاریخ اس بات کی صداقت پر شاہد ہے۔ علمائے حق نے اس مدت میں جو خدمتیں انجام دی ہیں، ان کا تعارف وقت کی ضرورت ہے، اور جامعہ سلفیہ اس کی تکمیل کے لیے کوشاں ہے۔ جامعہ سلفیہ نے اسلاف کی خدمات کے تعارف کا آغاز "اہلحدیث اور سیاست" سے کیا، اور خدا کا شکر ہے کہ یہ آغاز بابرکت ثابت ہوا اور تصنیف و ترجمہ کے میدان میں اس نے محسوس

پیش رفت کی۔ فالحمد للہ علی ذلک۔

زیرِ نظر کتاب کی اشاعتِ اول، تقدیم و تزئین اور تصحیح و طباعت کے لیے محترم مولانا آزاد رحمانی رحمہ اللہ کی مرہونِ منت ہے۔ جامعہ کے لیے موصوف کا اخلاص اور جہدِ مسلسل از بس غنیمت تھا، ابتدائی مرحلوں میں انھوں نے جس جانفشانی و دماغ سوزی سے اس ادارہ کی ترقی کے لیے کوشش کی، اس کو یاد کر کے آنکھیں آج بھی نم ہو جاتی ہیں۔ اس کتاب کو پیش کرتے ہوئے ہم مولانا موصوف کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں، اور ان کی مغفرت کے لیے دعا کرتے ہیں۔

اہلِ نظر جانتے ہیں کہ علم و تحقیق کے میدان میں جمود نہیں، ہم کسی چیز کو حرفِ آخر نہیں کہہ سکتے۔ اس کتاب میں بھی بعض ایسے امور تھے جن پر نئے مآخذ کی روشنی میں نظرِ ثانی کی ضرورت تھی، ہمیں خوشی ہے کہ اس خدمت کو رفیقِ کار محترم مولانا صفی الرحمن صاحب مبارکپوری استاذِ جامعہ نے انجام دیا، اور اس طرح ان کی محنت و توجہ سے یہ اشاعت ہر اعتبار سے قابلِ وثوق اور بہتر ہو گئی ہے۔ جزاہ اللہ خیرا۔

مؤلفِ کتاب رحمہ اللہ تعالیٰ سے متعلق کچھ عرض کرنے کی تاب میرے قلم میں نہیں۔ انھوں نے اپنی اس گراں قدر تصنیف کے ذریعہ ہمیں جو راہ دکھائی ہے، اس پر آگے بڑھنا اور تاریخ اہلحدیث کے اس حصہ کو تکمیل تک پہونچانا ہمارا فرض ہے۔ مؤلف مرحوم کے لیے جنت الفردوس کی دعا کرتے ہوئے ہم اس عزم کا اظہار کرتے ہیں کہ اس مبارک سلسلہ کی تکمیل کے لیے جامعہ سلفیہ پوری کوشش کرے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق مرحمت فرمائے، اور اخلاص کی دولت سے نوازے۔ آمین

وصلی اللہ علی خیر خلقہ محمد و آلہ وصحبہ اجمعین۔

(مقتدیٰ حسن ازہری)

جامعہ سلفیہ بنارس ۴/۵/۱۴۰۵ھ

فہرست مضامین "اہلحدیث اور سیاست"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت مولانا نذیر احمد صاحب رحمانی رحمہ اللہ

ماحول ـــــ اور ـــــ اشارے

زیر نظر کتاب استاذ الاساتذہ حضرت مولانا نذیر احمد صاحب رحمانی رحمہ اللہ تعالیٰ کی آخری تصنیف ہے۔ مرحوم نے اس کتاب میں اہلحدیثوں پر لگائے جانیوالے اس الزام کا جائزہ لیا ہے کہ:

"ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور ملک کی سیاسی زندگی میں جماعت اہلحدیث کا کوئی کردار یا حصہ نہیں ہے!"

ہم مرحوم کی اس کتاب کا تعارف کرانے سے پیشتر آپ کی حیاتِ طیبہ کا ایک اجمالی خاکہ ناظرین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ چونکہ مرحوم کی یہ کتاب "تحریکِ اہلحدیث" "آزادیِ وطن" اور "مجاہدینِ وطن" سے تعلق رکھتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ آپکے حالاتِ زندگی پیش کرنے سے پہلے اس ماحول پر بھی مختصر سی روشنی ڈال دی جائے، جس میں حضرت مولانا نذیر احمد صاحب رحمانی رحمہ اللہ کی پرورش و پرداخت ہوئی۔ تاکہ ناظرین اس بات کو بآسانی سمجھ سکیں کہ اس موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے "تحریکِ آزادیِ وطن" اور "تحریکِ اہلحدیث" کے سلسلہ میں آپ کے رجحانات کیا ہو سکتے ہیں۔ اور آپکے دل میں "اخلاصِ وطن" کی تڑپ کتنی شدت سے جاگزیں رہی ہوگی۔؟

یہ موضوع ایک ایسا موضوع ہے جو پوری شدت کے ساتھ "تحریکِ مجاہدینِ آزادی" کی منظر کشی اور عکاسی کا متقاضی ہے، تاکہ یہ بات پوری طرح واضح ہو سکے کہ "تحریکِ اہلحدیث" کا ایک بڑا مقصد کتاب و سنت کے احیاء

کے ساتھ ساتھ غیر ملکی جور و استبداد اور اغیار کے استثمار و استحصال سے ملک کو آزادی دلانا بھی تھا۔ لیکن طوالت کا خوف دامنگیر ہونے کے سبب سے ہم مختصر نگاری سے کام لیں گے اور صرف چند جزئی واقعات کا ذکر کر کے مولانا رحمانی مرحوم کے حالاتِ زندگی سے ناظرین کو روشناس کرائیں گے۔

ماحول اور ولادت:

حضرت مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم کی جائے ولادت ضلع اعظم گڈھ کا ایک موضع ہے جسے اُملو کے نام سے جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ یہ موضع شہر اعظم گڈھ سے جانب مشرق سات آٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ اعظم گڈھ کے مشہور قصبات میں ایک قصبہ مبارک پور بھی ہے، جہاں عرصۂ دراز سے مشہور اساطینِ علم و فن اور یگانۂ روزگار اعاظم رجال پیدا ہوتے رہے ہیں۔ (جامعِ ترمذی کے مشہور شارح) خاتم المحدثین، علامۂ زماں حضرت مولانا ابو العلی عبد الرحمٰن صاحبؒ مبارکپوری صاحبِ تحفۃ الاحوذی و ابکار المنن و مصنفِ تصانیفِ کثیرہ، مبارکپور ہی کے تھے۔ حضرت مولانا عبد السلام صاحب مبارکپوری مرحوم و مغفور مصنف سیرۃ البخاری و صاحب تاریخ التمدن (تاریخ المتوال) کا تعلق بھی اسی مبارکپور سے تھا۔ اور اس وقت تو حضرۃ الشیخ، استاذ الاساتذہ مولانا عبید اللہ صاحب رحمانی حفظہ اللہ و رعاہ مصنف مرعاۃ المفاتیح (شرح مشکوٰۃ المصابیح) کی مغتنم ہستی ایسی ہے کہ آپ کے باعث قصبہ مبارکپور خواص و عوام کے لیے اپنے اندر ایک خاص کشش اور جاذبیت رکھتا ہے۔

قصبہ مبارکپور کا پنچایتی نظام عرصہ دراز سے ۲۸ محلّوں پر مشتمل چلا آتا ہے، اس حیثیت سے موضع املو بھی اس کے پنچایتی نظام کا ایک جزء ہے۔ گویا موضع املو اپنی جداگانہ حیثیت رکھتے ہوئے بھی مبارکپور ہی کا ایک حصہ ہے۔

موضع املو، مبارک پور سے عین جانبِ مشرق کم و بیش ایک میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس موضع پر "تحریک اہلحدیث" اور "تحریک حریت و استخلاصِ وطن" کا سایہ اسی وقت سے پڑنا شروع ہو گیا تھا جب ہندوستان میں یہ تحریکیں شروع ہوئیں، اسی لیے جب ملک کی خاطر قربانیوں کی ضرورت تھی، مجاہدین آزادی کی

سپاہ تیار ہو رہی تھی اور لام بندی کا بگل بج رہا تھا، تو غازی محمد اسماعیل، غازی عبدالسبحان پسر بابو اور غازی محمد اکبر مرحوم مجاہدینِ آزادی کی صفوں میں شامل ہو کر میدانِ کارزار کے لیے روانہ ہو گئے۔

واقفِ حال لوگوں کا بیان ہے کہ غازی عبدالسبحان نے رات میں یہ خواب دیکھا کہ وہ مجاہدین آزادی کا کھانا تیار کر رہے ہیں، اسی اثنا میں ان کو غنیم کی فوج کی گولی لگتی ہے اور وہ جاں بحق ہو جاتے ہیں۔ دوسرے دن ان کے ساتھ بعینہٖ یہی واقعہ پیش آیا اور اس طرح وہ جام شہادت نوش کر کے شہیدوں میں شامل ہو گئے۔

غازی محمد اسمٰعیل محاذِ جنگ پر گئے، تو آج تک ان کی کوئی اطلاع نہ مل سکی کہ انھوں نے جام شہادت کب نوش کیا، اور اپنی جان جانِ آفریں کو کب سونپی؟ غازی محمد اکبر مرحوم البتہ دو مرتبہ محاذ جنگ سے واپس آئے۔ تیسری مرتبہ جاتے ہوئے پٹنہ میں گرفتار ہو گئے، تو شہادت کے لیے اہلو سے جناب محمد موسیٰ، عبدالقدیر اور عبدالغفار صاحبان پٹنہ گئے۔ ان لوگوں کی شہادت پر غازی صاحب موصوف کو قید فرنگ سے رہائی تو مل گئی مگر ان کی پیشانی کو جلتے ہوئے سرخ لوہے سے داغدار بنا کر انھیں حریت پسندی کا تمغہ دیدیا گیا۔

اس کے بعد غازی محمد اکبر مرحوم کا سرحد جانا مشکل ہو گیا، لیکن اپنے وطن میں رہ کر بھی وہ مجاہدین حریت کی امدادی خدمات انجام دیتے رہے۔ سچ ہے من المؤمنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ (۲۱ : پ)

غازی محمد اکبر مرحوم کا تنہا یادگار ان کے ایک صالح فرزند حاجی محمد یحییٰ مرحوم تھے جو نہایت پرہیزگار متقی، دیندار اور خدا رسیدہ انسان تھے۔ ان کی پوری زندگی علم دین کی خدمت میں گزری، ان کی موت بھی اپنے مسکن سے دور، موضع شاہ پور میں ہوئی، جہاں وہ تعلیم کے فرائض انجام دیتے تھے۔ اس طرح ان کی تدفین بھی وطن سے دور عمل میں آئی۔ غازی محمد اسماعیل اور غازی عبدالسبحان کے خاندان اور رشتہ دار آج تک موضع اہلو اور بوہیا میں آباد ہیں۔

مالی تعاون:

ملک میں جذبۂ جہاد و حریت پیدا کرنے اور غازیوں کے سامانِ جہاد کی تیاری کے لیے کثیر مال و دولت کی ضرورت تھی

اس بارے میں جہاں ملک کے بہت سے حریت پسندوں نے مجاہدین آزادی کی اعانت وکفالت کا بار اٹھایا موقیع الجو بھی اپنی حیثیت کے مطابق اس تعاون میں برابر شریک رہا۔ رأس العلماء، استاذ الاساتذہ حضرت مولانا حافظ عبد اللہ صاحب غازیپوری رحمہ اللہ مجاہدین سے بڑی محبت رکھتے تھے "سرگوشت مجاہدین" کے ص ۶۴۳ پر مولانا غلام رسول مہر مرحوم لکھتے ہیں:

"مولانا رحیم آبادی جب دہلی تشریف لاتے تو شیخ عطاء الرحمٰن کے یہاں پھاٹک حبش خان میں قیام فرماتے۔ جمعہ پڑھاتے تو خطبے میں سورہ قٓ اول سے آخر تک پڑھتے اور مختصر سی تقریر فرماتے پھر وہ اور حافظ عبد اللہ صاحب غازیپوری اور دوسرے علماء و رؤساء اوکھلا میں جمع ہوتے وہاں بنوٹ کے کرتب دکھائے جاتے۔ جنھیں دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ انھیں اور حافظ صاحب غازیپوری کو مجاہدین سے بڑی الفت بھی اور جہاد کا بہت شوق تھا۔ اسی خیال سے وہ موزوں جوانوں کو منتخب کرکے ان کے لیے سپاہیانہ فنون کے سیکھنے کا انتظام فرما دیا کرتے تھے۔"

پھر مہر صاحب ص ۶۵۳ پر لکھتے ہیں:

"صوفی صاحبؒ کے بیان کے مطابق مندرجہ ذیل حضرات جماعت مجاہدین کی امداد و استعانت کے ستون تھے۔"

ؔ صوفی صاحب سے مراد صوفی عبد اللہ صاحب ہیں جو مولوی ولی محمد فتوحی والا اور مولوی فضل الٰہی کی تقریروں سے متاثر ہوکر جماعت مجاہدین میں شامل ہوگئے۔ اس کے بعد مولوی فضل الٰہی کے ساتھ چندہ اکٹھا کرنے کے لیے دورے کیا کرتے تھے، ان کے قید ہوجانے پر اس خدمت کو تنہا انجام دیتے رہے۔ بعد میں چمرکنڈ جاکر وہاں کے مجاہدین کی خدمت کو خود پر لازم کرلیا۔ وہاں سے واپس آکر ستمبر ۱۹۳۱ء رجب ۱۳۵۰ھ میں ماموں کانجن میں جماعت المجاہدین کی ایک درسگاہ قائم کی۔ رفتہ رفتہ اس درسگاہ کا حلقہ فیض بہت وسیع ہوگیا۔ صوفی صاحب سرگرم، مخلص پاکباز اور حرکت و عمل کا پیکر ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سرگزشت مجاہدین ص ۶۵۲، ۶۵۳۔

مذکورہ بالا عبارت کے بعد موصوف نے ۲۲ آدمیوں کے نام تحریر فرمائے ہیں، ان میں دوسرا نام حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب رحیم آبادی کا ہے، گیارھواں نام جناب شیخ عطاء الرحمٰن مرحوم مہتمم مدرسہ دارالحدیث رحمانیہ دہلی کا اور بائیسویں نمبر پر حضرت حافظ صاحب غازی پوری ہیں۔ رحمہم اللہ اجمعین۔

ان اقتباسات اور تفصیلوں کے پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ حضرت علامہ حافظ صاحب غازیپوری رحمہ اللہ نے موضع املو کو اپنی تشریف آوری سے بارہا نوازا۔ ایک ایسے دور میں جب فضا میں ہر طرف آزادی وطن اور جہاد کے دلنواز نغمے گونج رہے ہوں، فداکاری و جاں نثاری کا جذبہ ہر رگ و ریشہ میں سمایا ہوا ہو، اللہ کی راہ میں جان و مال کو نثار کر دینا اور حق کے غازیوں کو دولت دنیا سے بے نیاز بنا کر جہاد فی سبیل اللہ کے لیے آمادہ کرنا ہی سب سے بڑی سعادت ہو تو ایسے حالات میں حضرت حافظ صاحب غازیپوری جیسے مخلص پاکباز اور مجاہد فی سبیل اللہ کا املو اور مبارکپور جیسے مقامات . . . میں بار بار تشریف لانا مصلحت سے خالی نہیں ہو سکتا تھا، آپ کی انہی مساعی کا نتیجہ تھا کہ غازی محمد اسمٰعیل اپنے رفقاء کے ساتھ عازم میدان کارزار ہوئے۔ مبارکپور، املو اور لوہیا سے مستقل اعانتی رقمیں عرصۂ دراز تک مرکز مجاہدین کو بھیجی جاتی رہیں۔ حضرت غازیپوری رحمہ اللہ کے علاوہ ابھی میرے ہوش سنبھالنے تک مولوی اسداللہ صاحب ردانوی مجاہدین سرحد کی مالی اعانت کے سلسلہ میں برابر مذکورہ مقامات کے دورے کیا کرتے اور مخیر حضرات سے تعاون کی رقوم حاصل کر کے معینہ مقامات کو بھیجتے رہے ہیں۔ لیکن چوں کہ اس وقت اس طرح کا ہر کام انتہائی رازداری سے انجام پاتا تھا، اس لیے آج ان کی تفصیل سے پردہ اٹھانا آسان کام نہیں ہے۔

املو میں علمی اور دینی سرگرمیاں:

موضع املو علمی اور دینی اعتبار سے بھی ایک نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ مولانا عبداللہ صاحب چھاؤ دالہ آبادی نے ایک عرصہ تک اس بستی کو اپنا مستقر بنائے رکھا۔ موصوف املو میں مقیم رہ کر یہاں اور اس سے متصل دوسری بستیوں میں عمل بالکتاب والسنۃ کا بیج بوتے رہے۔ آپ شیخ الکل فی الکل حضرت

میاں سید نذیر حسین صاحب رحمہ اللہ دہلوی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ دینداری اور تقویٰ شعاری میں آپ کی مثال کم ہی ملے گی۔ فرض نمازوں میں موضع الموو لوہیلکے عاملین بالحدیث کے اندر امام کے پیچھے رکوع کے بعد جہری تحمید (ربنالک الحمد الخ) کا جو دستور ہے، وہ آپ ہی کی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ بنگال میں بھی جہاں جہاں آپ مقیم رہے وہاں کے لوگوں میں جہری تحمید کا رواج ابتک موجود ہے۔

ان کے علاوہ مولانا عبدالحق مدنی[۱] مرحوم بھی یہاں تشریف لاکر فریضۂ تبلیغ دین ادا فرما چکے ہیں۔ حضرت مولانا سیف بنارسی مرحوم کی تبلیغی سرگرمیاں تقریباً یہیں سے شروع ہوئیں۔ آپ کی سب سے پہلی تقریر اس کے قریب موضع جکیا میں ہوئی جسے مولانا سیف اپنے آخری ایام تک موقع موقع سے یاد دلایا کرتے تھے۔

فتاویٰ نذیریہ میں بہت سے سوالوں کے جواب میں مجیب کا نام "العبد عبدالحق اعظم گڈھی" یا "ابو محمد عبدالحق اعظم گڈھی" مرقوم ہے۔ یہ مولانا عبدالحق صاحب موضع الموو کے باشندے تھے تحصیل علم کے بعد سند فراغت کی خاطر حضرت میاں صاحب رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو مدت العمر کے لیے دہلی ہی کو اپنا مستقر بنالیا اور اپنے وطن لوٹ کر واپس نہ آئے۔ بزرگوں سے سنا ہے کہ خانگی الجھنوں سے مجبور ہوکر انھوں نے ایسا کیا تھا واللہ اعلم۔

میاں صاحب نور اللہ[۲] تحصیل علم کے شوق میں الموو سے پا پیادہ دہلی گئے اور عرصہ تک حضرت میاں صاحب دہلوی مرحوم کی خدمت میں حاضر رہ کر علمی تربیت و تعلیم حاصل کرتے رہے۔ واپسی کے

---

[۱] مولانا عبدالحق مدنی ایک عرب تاجر تھے جو قیمتی پتھروں اور موتیوں کی تجارت کرتے تھے۔ کسی طرح الموو آئے تو یہاں عمل بالکتاب والسنہ کا جذبہ و شوق دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور ایک عرصہ تک یہاں مقیم ہو گئے۔ میرے والد محترم ان کے فیض یافتگان میں ابتک موجود ہیں۔

[۲] میاں صاحب نور اللہ موضع الموو کے ایک بزرگ تھے جن کو علوم شرعیہ سے بڑا شغف تھا۔ تعلیم زیادہ نہیں تھی مگر علماء کی صحبت بہت خوب اٹھائی تھی اسی شوق میں وہ دہلی تشریف لے گئے اور عرصہ تک حضرت میاں صاحب دہلوی کی خدمت میں رہے

بعد ان سے قرب وجوار کے علماء بحث و مناظرہ کی تاب نہ لاتے تھے اس لیے مخالفت کے باوجود کسی کو ان سے گفتگو کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

غرض کہ موضع اہلوا اسی دور سے تحریک اہلحدیث اور تحریک آزادی وطن کا ایک مضبوط مقام رہا ہے۔ جب ہندوستان میں سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید رحمہما اللہ کی زیر قیادت استخلاص وطن اور احیائے توحید و سنت کا شعور پورے شباب پر تھا۔

اس طرح کی دینی اور اصلاحی تحریکیں مرور ایام کے باعث چاہے دھندلی پڑ جائیں لیکن ان کے اثرات اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ فوراً مٹائے نہیں جاسکتے۔ حضرت مولانا نذیر احمد صاحب رحمانی مرحوم نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں اور جس آب و ہوا میں آپ کی پرورش و پرداخت ہوئی وہ تحریک استخلاص وطن کا وہ پختہ ماحول اور احیائے کتاب و سنت کی وہ پاکیزہ اور عطر بیز آب و ہوا تھی جس میں للّٰہیت، خلوص، ایثار، حق پسندی و باطل شکنی پوری طرح سرایت کیے ہوئے تھی۔ آپکے گھرانہ عمل بالکتاب والسنہ کی روایت کو معلوم نہیں کب سے گلے لگا چکا تھا، اس لیے یہ باتیں مولانا کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی اور آپ اپنی وضع پر اخیر عمر تک بڑی شدت سے قائم رہے۔

جن لوگوں نے مولانا کو قریب سے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ آپکے اندر ایمانی غیرت اور اسلامی حمیت کتنی زیادہ تھی۔ معمولی بات کو بھی آپ سنت کے خلاف دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ حق گوئی میں بڑے بے باک اور جری تھے۔ حالات کتنے ہی مختلف ہوں اغیار کی کتنی ہی کثرت ہو، مجمع خواہ کیسا ہی ہو۔ حق کے اعلان میں کبھی آپ کو تردد نہ ہوا، سچی بات علی رؤس الاشہاد کہتے اور کبھی اس کی پروا نہ کرتے کہ اس سے کسی کو خوشی ہوگی یا ناخوشی ؎

کیوں کر خس و خاشاک سے دب جائے مسلماں
مانا کہ تب و تاب نہیں اس کے شرر ۔ میں!

مولانا کی زندگی کے اس پس منظر میں ہم مولانا کے حالات زندگی اختصار کے ساتھ ہدیۂ ناظرین کر رہے ہیں۔

ترجمۂ مؤلف

ولادت ۶ فروری ۱۹۰۶ء مطابق ۱۰ ذی الحجہ ۱۳۲۳ھ کو ہوئی، اور سانحۂ ارتحال ۳۰ مئی ۱۹۶۵
مطابق ۲۸ محرم الحرام ۱۳۸۵ھ روز یکشنبہ کو ۳ بجے دن میں پیش آیا۔ والد کا نام عبد الشکور اور دا
کا نام شیخ جعفر علی تھا۔ آپ کا گھرانا یہاں کے مقتدر گھرانوں میں شمار ہوتا تھا۔

خاندانی حالات :

مولانا عراقی برادری سے تھے کسی زمانہ میں اس برادری کے لوگ تجارت پیشہ، نیل سازی اور نیل
کی کاشت کرانے میں مشہور تھے، ان کے یہاں نیل سازی کے بڑے بڑے گودام اور کارخانے چلتے تھے
یہ لوگ زمینداریوں کے بھی مالک ہوا کرتے تھے۔ خود مولانا کے دادا شیخ جعفر علی مرحوم کے متعلق تحقیق سے
معلوم ہوا کہ کسی وقت موضع الوکی زمینداری میں ۴/۱ حصہ کے مالک و زمیندار تھے۔ ان تمام باتوں کے باوجو
مولانا کے والد شیخ عبد الشکور شہر اعظم گڈھ کے مشہور علاقہ دار قادر بخش کی حین حیات تک ان کے علاقہ
کے کارپرداز اور ان کی وفات کے بعد ان کے نابالغ لڑکے احسان اللہ کے مختارِ عام تھے، اسی طرح
شیخ عبد الشکور کے بھائی حاجی عبد السلام مرحوم علاقہ رسڑا (ضلع بلیا) کے رئیس امجد علی، امانت علی
کے علاقہ کے کارپرداز تھے اور ان کا قیام موضع ہجولی (اسٹیشن چلکہر ضلع بلیا) میں رہا کرتا تھا۔ مولانا کے
والد شیخ عبد الشکور مرحوم کی تقریباً ۱۲ بیگھہ مقامی زمین بھی اعظم گڈھ سے متصل واقع تھی۔ جس کی پیداوار
ابھی حال تک مولانا اور ان کے بھائی نصیر احمد کو ملتی تھی۔ زمینداریوں کے الٹ پھیر کے دور میں وہ
ساری زمین انھی کاشتکاروں کے ہتھے چڑھ گئی جو اس پر کاشت کرتے تھے۔

مولد و منشأ:

مولانا کا مولد و منشأ اَلو ہے یہ موضع قصبہ مبارکپور سے سمت مشرق ایک میل اور شہر اعظم گڈھ سے سات آٹھ میل کی دوری پر ہے ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ یہ قصبہ عرصۂ دراز سے علم و فن کا گہوارہ رہا ہے اور یہاں بڑے بڑے علماء دین اور اساتذۂ علم و فن گزرے ہیں گویا یہ جگہ اپنی ممتاز علمی خصوصیات کے اعتبار سے عرصۂ دراز سے مرجع خلائق ہے۔

موضع اَلو مبارکپور سے ٹھیک مشرق میں واقع ہے یہاں کے توحید و سنت کے شیدائی اپنے دینی مسائل میں جس طرح مقامی اہل علم سے مستفیض ہوتے رہے ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ فیض ان کو مبارکپور کے ممتاز ارباب فضل و کمال سے پہنچا ہے اور پہنچ رہا ہے۔ ایک میل کی مسافت کوئی مسافت نہیں ہے، اس لیے اگر ایک جگہ کسی طرح کی کوئی مختلف بات پیش آجائے تو اس کے اثرات دوسری جگہ فوراً نمایاں ہو جاتے ہیں گویا یہ دونوں مقامات ایک دوسرے سے پوری طرح وابستہ ہیں۔

تعلیم و تربیت:

مولانا نذیر احمد صاحب رحمانی مرحوم کی ابتدائی تعلیم مبارکپور میں ہوئی اس کے بعد آپ نے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں داخلہ لے لیا۔ یہاں سے کچھ ہی دنوں کے بعد مدرسہ فیض عام مئو میں داخل ہو گئے۔ مدرسۃ الاصلاح کی بہ نسبت فیض عام کے قیام کی مدت زیادہ ہے۔ یہاں آپ کو صدر المدرسین حضرت مولانا محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ کی تعلیم و تربیت سے مستفیض ہونے کا موقع ملا۔ حضرت مولانا محمد احمد صاحب مرحوم مئو کے ان برگزیدہ اعاظم رجال میں ہیں جن کی وجہ سے مئو میں علم و فن کو زندگی ملی۔

آپ کی شان میں یہ کہنا زیادہ موزوں ہے کہ ؎

آناں کہ خاک را بنظر کیمیا کنند

گویا دار الحدیث رحمانیہ دہلی کے قیام کے اعلان تک آپ کی تعلیم آپ ہی کے ضلع (اعظم گڈھ) کے

مختلف مقامات میں ہوتے رہے۔

دار الحدیث رحمانیہ دہلی کا قیام:

شوال ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۱ء میں مدرسہ دار الحدیث رحمانیہ دہلی کے قیام کا اعلان ہوا۔ اس وقت مولانا کی عمر ۱۵-۱۶ سال تھی، آپ نے اسی سال دہلی جاکر دار الحدیث رحمانیہ دہلی میں داخلہ لے لیا۔ اور اس ممتاز علمی مرکز کی ابتدائی زندگی سے لیکر انتہا تک اس سے وابستہ رہے۔ آپکے بقیہ تعلیمی ایام یہیں گزرے الا یہ کہ شیخ عطاء الرحمن مرحوم کے مشورے سے آپنے معقولات کی تکمیل کے لیے تھوڑے دنوں تک رامپور، بدایوں میں قیام کیا جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

دہلی کے مشہور تاجر جناب حاجی شیخ عبدالرحمن و عطاء الرحمن برادران کو حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب محدث رحیم آبادی (صاحب حسن البیان) سے بڑی عقیدت تھی۔ مولانا غلام رسول مہر کے حوالے سے ہم اوپر ذکر کرآئے ہیں کہ مولانا رحیم آبادی جب دہلی تشریف لاتے تو آپ کا قیام پھاٹک حبش خاں میں شیخ عبدالرحمن و عطاء الرحمن مرحومین کے یہاں ہوا کرتا تھا۔

مولانا رحیم آبادی اپنے وقت کے بے مثال عالم، عدیم النظیر مناظر، جلیل القدر مقرر اور قادر الکلام خطیب و واعظ تھے۔ دوران قیام دہلی میں خطبہ جمعہ کے علاوہ عموماً مجالس وعظ و تذکیر بھی منعقد ہوا کرتی تھیں اور فن سپہ گری کی تربیت کے لیے اکھاڑے بھی جمتے تھے۔ مولانا کے صحبت یافتگان اور ہم جلیسوں میں فن سپہ گری کا شوق اتنا غالب تھا کہ جس زمانہ میں میں دار الحدیث رحمانیہ دہلی میں زیر تعلیم تھا ۱۹۳۳ تا ۱۹۳۹ء کا زمانہ اس کے مہتمم جناب شیخ عطاء الرحمن مرحوم نے فن سپہ گری اور ورزش کے لیے باقاعدہ ایک استاد کا انتظام کر رکھا تھا جو جماعت مجاہدین کی یادگار تھے اور بعد نماز عصر طلباء کو دار الحدیث کے وسیع ہال میں بنوٹ وغیرہ کی عملی تعلیم دیتے تھے۔

بعض لوگوں کے بیان کے مطابق دار الحدیث رحمانیہ دہلی کا قیام مولانا رحیم آبادی مرحوم کے ایماء سے عمل میں آیا تھا۔ لیکن اس مرکز علم و فن کی بنیاد آپ کی حیات مستعار میں نہ پڑ سکی، اس لیے کہ بعض وقائع نگاروں

کے بیان کی رو سے آپ کی وفات ۱۳۳۶ھ میں ہوئی اور رحمانیہ کا قیام ۱۳۳۹ھ[1] میں عمل میں آیا۔ بہرکیف اس بیان کی صحت کو تسلیم کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ آپ ہی کی رہ نمائی اس کے قیام کی اصل محرک ہوئی اور آپ ہی کے ارشاد کے مطابق الحاج شیخ عبدالرحمٰن مرحوم نے اسے قائم کیا جو آگے چل کر ملک میں تحریک اہلحدیث اور احیائے کتاب وسنت کا ایک مضبوط مرکز بن گیا اور اس نے علم دین کی حفاظت کے لیے ملک میں اتنے جلیل القدر علماء پیدا کیے کہ جن سے تحریک اہلحدیث ایک نئے دور میں داخل ہوگئی۔

حضرت مولانا نذیر احمد صاحب رحمانی مرحوم اس عظیم علمی ادارہ سے مبدء سے لے کر لحد تک وابستہ رہے اور اس کی پوری تاریخ آپ کی نگاہوں کے سامنے مرتب ہوتی رہی۔ رحمانیہ دہلی میں مولانا کے تحصیل علم کا مشغلہ سات سال تک جاری رہا یعنی ۱۳۳۹ھ میں وہاں آپ نے داخلہ لیا اور ۱۳۴۶ھ میں سند فراغت حاصل کی۔ اپنے داخلہ کی بابت مولانا خود رقم طراز ہیں:[2]

"مدرسہ رحمانیہ دہلی کا افتتاح شوال ۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۱ء میں ہوا اور اسی سال تقریباً دو مہینے کے بعد ذی الحجہ میں میں مدرسہ میں بغرض تعلیم داخل ہوگیا۔ ابتدا سے انتہا تک اپنی دینی تعلیم کا بیشتر حصہ یہیں مکمل کرنے کے بعد شعبان ۱۳۴۶ھ میں میں نے مدرسہ سے سند فراغت حاصل کی اور پھر اسی سال مدرس کی حیثیت سے مدرسہ کی خدمت پر مامور ہوگیا، اور اب تک بحمداللہ اسی درجے پر فائز ہوں۔ اس اٹھارہ سالہ زندگی میں شاید ایک آدھ سال میں مدرسہ سے غیر حاضر رہا ورنہ اکثر حصہ اسی گلشن علم کی بلبلوں

لہ رحمانیہ کے قیام کی بابت مولانا کی تحریر کا اقتباس پیش کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی مرحوم کی بعض تحریروں میں کاتب کی لغزش سے دارالحدیث رحمانیہ دہلی کا سن تاسیس ۱۳۲۹ھ تحریر ہو گیا ہے۔ آگے چل کر یہ معمولی سی لغزش ایک تاریخی غلطی بن سکتی ہے، اس لیے اس کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔

ٹہ مولانا کی اس تحریر سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قیام رحمانیہ کے صرف دو ماہ بعد آپ نے وہاں داخلہ لیا۔

باغِ حکمت کے پھولوں اور ریاضِ ملت کی کیاریوں میں گزرا ہے۔“

(رسالہ محدث جولائی ۱۹۳۹ء / جمادی الاول ۱۳۵۸ھ)

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ دار الحدیث رحمانیہ دہلی میں داخلہ کے وقت آپ کے زیرِ درس عربی کی کون سی کتابیں رہی ہوں گی؟

بہرکیف دار الحدیث رحمانیہ دہلی میں آپ نے جلیل القدر اساتذۂ علم وفن کے زیرِ تربیت اپنے تعلیمی مشاغل جاری رکھے، اس وقت رحمانیہ میں جید علمائے درس وتدریس اکٹھا تھے۔ استاذ الاساتذہ حضرت مولانا احمد اللہ صاحب پرتاب گڈھی شیخ الحدیث دار الحدیث رحمانیہ دہلی، جامع المعقول والمنقول مولانا غلام یحییٰ صاحب پنجابی کانپوری، ادیب شہیر مولانا عبد الرحمن صاحب نگرنہسوی جیسی گرانمایہ اور سرآمدِ روزگار شخصیتیں مسندِ درس وتدریس کی زینت تھیں۔ ان کے زیرِ سایہ تربیت پانے والا ہر جوہرِ قابل فضل وکمال کی جن بلندیوں تک نہ پہنچ جائے تھوڑا ہے۔ حضرت الشیخ مولانا عبید اللہ صاحب مبارکپوری مدظلہ کا سنِ تکمیل ۱۳۴۵ھ ہے اور مولانا نذیر احمد رحمانی مرحوم کا ۱۳۴۶ھ یعنی صرف ایک سال کے تفاوت سے دار الحدیث رحمانیہ دہلی نے ملک کو دو ایسے انمول جوہر دیئے جو تقسیم ہند کے بعد ملک کی تحریکِ اہلحدیث کی روح اور کتاب وسنت کی خدمت اور دینِ خالص کی ترویج واشاعت میں حرفِ آخر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مولانا املوی مرحوم نے مسندِ درس وتدریس سنبھالی تو علم دین کی خدمت کے لیے ملک کے کونے کونے کو علمائے دین سے نہال اور آسودہ کردیا۔ حضرت مولانا عبید اللہ صاحب رحمانی نے تصنیف وتالیف کے میدان میں قدم رکھا تو مرعاۃ المفاتیح میں علم ومعرفت کے وہ دریا بہائے جس سے برصغیر ہند وپاک کے شائقینِ علم ودانش کے علاوہ عرب اور دوسرے ملک کے لوگ بھی مستفیض ہورہے ہیں۔ خدا اس شرح کو جلد اتمام تک پہنچانے کے اسباب فراہم کرکے امتِ مرحومہ کی اصلاح وہدایت کا سامان بہم پہنچائے۔

○

امتیازی شان:

دارالحدیث رحمانیہ دہلی کا یہ امتیاز تھا کہ امتحانات کے اندر جماعت میں اول آنے والے طلبہ کو نقد انعامات دیے جاتے۔ اسی طرح جو پورے مدرسہ میں ممتاز ہوتا یا سال کے اندر نماز باجماعت کی پابندی میں سبقت لے جاتا اسے بھی انعامات سے نوازا جاتا۔ حضرت مولانا اعظمی مرحوم کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ آپ رحمانیہ کے اندر جماعت میں ہمیشہ اول آتے اور انعامات حاصل کرتے رہے، جس سال آپ نے وہاں سے تکمیل کی ہے آپ کو دارالحدیث کی طرف سے بخاری شریف کا سیٹ کے علاوہ مبلغ چالیس روپے نقد اور ایک جیبی گھڑی سے بطور انعام مشرف کیا گیا۔

مولانا تکمیل کے بعد جب دہلی سے اپنے وطن واپس آئے تو فراغت کی خوشی میں آپ کے والد محترم جناب شیخ عبدالشکور نے ایک جلسہ وعظ و تبلیغ منعقد کیا۔ اس جلسہ میں علامہ زماں مولانا عبدالرحمان صاحب محدث مبارکپوری رحمہ اللہ کے علاوہ آپ کے استاذ مولانا عبدالغفور صاحب جیراجپوری مرحوم اور مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی مرحوم نے بھی شرکت فرمائی۔ احقر کی عمر اس وقت ۱۲ سال کی تھی اس کے باوجود اس جلسہ میں موجود تھا۔ جلسے کی کارروائی ۱۲ بجے رات تک چلتی رہی پھر شیخ الکل مولانا مبارکپوری کی دعاؤں پر اس کا اختتام ہوا۔

مولانا کی ڈائری کی تحریر سے معلوم ہوا کہ شعبان ۱۳۴۹ھ میں فراغت کے بعد اسی سال شوال سے جب عربی مدارس کا نیا تعلیمی سال شروع ہوتا ہے۔ آپ نے مشہور زمانہ درسگاہ دارالحدیث رحمانیہ دہلی میں مسند تدریس سنبھال لی اور آپ کے اوپر تعلیم و تدریس کی ذمہ داریاں ڈال دی گئیں۔ اس وقت آپ عمر کی تئیسویں منزل میں تھے

آپ کو معقولات سے فطری لگاؤ تھا اور اس میدان میں آپ کی طبیعت کا جوہر [illegible] کھلا تھا۔ اس لیے دارالحدیث رحمانیہ میں مسند تدریس سنبھالنے کے بعد کتب احادیث کے ساتھ ساتھ نورالانوار اور رشیدیہ وغیرہ کی تعلیم بھی آپ کو سونپی گئی۔ لیکن عالیجناب شیخ عطاءالرحمن مرحوم کی خواہش و وصیت

دارالحدیث رحمانیہ دہلی کے مہتمم تھے، یہ خواہش تھی کہ مولانا معقولات میں پوری دسترس اور کمال حاصل کرکے کبار کتب معقولات مروجہ کا بوجھ سنبھال لیں۔ اسلیے آپ نے انھیں معقولات کی تعلیم کے لیے رامپور بھیج دیا۔[1]

بدایوں میں تحصیل علم:

عالی جناب شیخ عطاء الرحمان مرحوم کی خواہش کے مطابق مولانا نذیر احمد رحمانی رامپور اسٹیٹ میں مولانا فضل حق خیر آبادی کی خدمت میں تشریف لے گئے جو اس وقت مدرسہ عالیہ رامپور کے پرنسپل اور خیر آبادی سلسلے کے ایک نامور عالم تھے مگر وہاں ریاضی کی تعلیم نہ ہونے کے باعث آپ مدرسہ شمس العلوم بدایوں چلے گئے۔ یہاں جامع العلوم مولانا عبدالسلام صاحب قندھاری افغانی معقولات وریاضی میں یگانہ روزگار تھے اور بڑے نظم واہتمام سے فنون کی تعلیم ہوتی تھی یہاں ایک سال قیام فرماکر آپ نے معقولات وریاضی کی بہت سی درسی اور غیر درسی کتابوں کی تکمیل فرمائی۔

شمس العلوم بدایوں کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ تمام طلبہ واساتذہ افغانی تھے۔ صرف مولانا ہی ایک ایسے تھے جو ہندوستانی ہوکر افغانیوں کی بستی میں مقیم تھے۔ آپ نے یہاں کے دوران قیام کا ایک واقعہ ایک روز درس میں بیان فرمایا جو دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ پُرمذاق بھی ہے۔ آپ فرمایا کہ

---

[1] اگست ۱۹۵۲ء سے مارچ ۱۹۶۲ء تک میرا تعلق "اخبار الہدیٰ" لہریا سرائے دربھنگہ کی ادارت سے تھا اپریل ۱۹۵۵ء "دارالعلوم نمبر" کے نام سے اس کا ایک خاص شمارہ شائع کیا گیا۔ اس میں بہت سے علماء موجودین، ومرحومین کے تراجم بھی شائع ہوئے تھے میری درخواست پر استاذ محترم مولانا نذیر احمد صاحب رحمانی نے مجھے اپنی زندگی کے حالات پر مشتمل ایک خودنوشت یادداشت مرحمت فرمائی تھی؛ اسی کی روشنی میں میں نے موصوف کا ترجمہ ترتیب دیا تھا جو آپ کے ملاحظے گزرنے کے بعد دارالعلوم نمبر میں شائع ہوا تھا۔ رام پور اور بدایوں کی تمام تر تفصیلات اسی سے ماخوذ ہیں۔

ایک روز بعد نماز عصر میں کتابوں کے مطالعہ میں مشغول تھا کہ کچھ افغانی لڑکے کمرے میں داخل ہوئے اور مجھے مطالعے میں مشغول دیکھ کر انتہائی حیرت سے بولے۔ آپ اس وقت مطالعہ کر رہے ہیں ؟

آپ نے کہا : آخر اس میں حرج ہی کیا ہے ؟

یہ سن کر ایک افغانی نے انتہائی جوش کے عالم میں کہا :

"کیا آپ کو معلوم نہیں کہ خاص امام اعظم رحمہ اللہ کا قول ہے کہ جو شخص بعد عصر مطالعہ کرے وہ کند ذہن ہو جاتا ہے" مولانا کو ان کی اس گفتگو سے حیرت ہوئی۔ لیکن ان اکھڑ مزاجوں سے الجھتا کون ؟ اس لیے آپ نے کتاب بند کر دی اور کمرے سے باہر نکل آئے۔ ان حالات میں آپ نے ایک سال ان کی صحبت میں گزارا۔ غنیمت تھی کہ مدرسہ شمس العلوم میں اساتذہ کی تقریریں اردو میں ہوتی تھیں۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس مدرسہ کا اہتمام ملک کے نامور لیڈر جناب عبدالماجد بدایونی کے سپرد تھا اور جب کبھی وہ مدرسہ میں تشریف لاتے تو مولانا سے بڑی شفقت و محبت سے پیش آتے تھے۔ دستار بندی اور سند فراغت دیتے وقت تو انھوں نے آپ کو بہت سی دعائیں بھی دیں۔ آپ کو مدرسہ کی جانب سے جو سند دی گئی اس میں چند وصیتیں بھی ہیں آخری وصیت میں آپ کو تلقین کی گئی ہے کہ

ولیشتغل حسب استطاعتہ فی اشاعۃ الاسلام واحیاء سنن الدین والرد علی الکفرۃ واھواء اھل الضلال من النیاشرۃ والرافضۃ والنجدیۃ وغیر المقلدین، (یعنی ہم ان کو وصیت کرتے ہیں کہ یہ اپنی حسب استطاعت اسلام کی اشاعت اور دین کی سنتوں کے احیاء میں مشغول رہیں، نیز نیچریوں، رافضیوں، نجدیوں اور غیر مقلدوں کی جو گمراہ فرقے ہیں برابر تردید کرتے رہیں۔)

بدایوں میں بدعتیوں کا خاصا زور رہے، مولانا عبدالماجد خود اپنے حلقہ کے پیر تھے، ان حالات میں آپ نے اتنے دنوں کسی طرح گزر گیا یہ مولانا ہی سمجھ سکتے تھے۔ رہا وصیت کا معاملہ تو الحمد للہ، اللہ نے آپ کو جتنی توفیق اور وسعت بخشی تھی اس کے مطابق درس و تدریس اور تقریر و تحریر کے ذریعہ اشاعت اسلام اور احیاء سنت کی خدمت انجام دیتے ہے، نیچریوں اور رافضیوں کے خلاف ایسے ٹھوس اور مدلل مضامین

لکھے جن پر آپ کو قارئین نے مبارک باد کے خطوط لکھے جن میں سے بعض میری نظروں سے بھی گزرے ہیں۔ اسی طرح جامد اور غالی مقلدین پر بھی آپ پوری طرح اتمام حجت فرماتے رہے، وصیت میں نجدیوں اور غیر مقلدین کے بارے میں بڑی بے انصافی کی گئی ہے، اس لیے قرآن کی ہدایت کے مطابق اس میں اصلاح ضروری تھی کہ

فمن خاف من موص جنفا او اثما فاصلح بینھم فلا اثم علیہ

دارالحدیث میں مراجعت اور مسندِ تدریس :

بدایوں سے فراغت کے بعد آپ مستقل طور سے دارالحدیث رحمانیہ دہلی میں اپنی مسند تدریس پر واپس آگئے اور اکتوبر ۱۹۴۷ء کے انقلاب تک جب تک دارالحدیث قائم رہا، آپ بھی اس سے برابر وابستہ رہے۔ رحمانیہ کی ۲۷ سالہ زندگی میں سے اگر آپ کی طالب علمی کے ۷ سالہ زمانہ کو وضع کر دیا جائے تو گویا مستقل طور پر آپ نے ۲۰ سال تک دارالحدیث رحمانیہ دہلی کی خدمت کی ہے۔ مشغلہ درس و تدریس کے علاوہ اس دوران میں آپ کے فرائض میں رحمانیہ کے عظیم و جلیل القدر کتب خانہ کی دیکھ ریکھ اور اس کی نگرانی بھی تھی۔ علاوہ ازیں دارالحدیث کا مشہور ماہنامہ "محدث" بھی اس کے ایڈیٹر مولانا عبدالحلیم ناظم صدیقی کے انتقال[1] کے بعد آپ کی ادارت میں آگیا۔ اس وقت سے اخیر تک آپ برابر اس کے مدیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ آپ کی ادارت کے زمانہ میں اس میں دوسرے اہل قلم کے بیش قیمت مضامین کے علاوہ آپ کے اثر انگیز اور ولولہ انگیز اداریے اور مختلف مسائل پر محققانہ مضامین نے محدث کی قدر و قیمت کو بہت بڑھا دیا آپ کی ادارت کے زمانہ میں محدث کے اندر فتاویٰ کے باب کا اضافہ ہوا۔ استفسارات کے جواب میں حضرت مولانا عبیداللہ صاحب رحمانی مدظلہ العالی کی جامع اور پر از تحقیق نگارشات نے اس رسالہ کی افادیت کو اس قدر وسیع کر دیا تھا کہ ایک موقع سے مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی مرحوم جیسے صاحب علم اور اہل قلم کو

---

[1] آپ کا انتقال ۲۲ اگست ۱۹۳۵ء کو ہوا ہے یعنی دو سال دو مہینے کے بعد محدث کی ساری ذمہ داری مولانا علوی مرحوم پر آگئی۔ یوں ناظم مرحوم کی علالت کے دوران بھی آپ ہی ادارت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔

فرماتے ہوئے میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے کہ:

"میں جب تک محدث کے استفسارات اور ان کے جوابات پڑھ نہیں لیتا مجھے نیند نہیں آتی۔"

مولانا کے زمانہ میں جہاں دارالحدیث رحمانیہ کے کتب خانہ میں بیش قیمت علمی نوادرات اور جلیل القدر شہ پاروں کا اضافہ ہوتا رہا وہاں رسالہ محدث نے بھی بڑی ترقی کی، مولانا کی مشہور تصنیف "رد عقائد بدعیہ" کی تخلیق مع تسوید محدث کے دوران ادارت ہی میں عمل میں آئی تھی بعد میں مزید اضافے کے ساتھ آپنے اسے کتابی شکل دیدی۔

تعلیمی امور میں مولانا کی ہمہ گیر انتظامی صلاحیتیں مسلّم تھیں۔ طلبہ کی اخلاقی تربیت اور تعلیم کی دیکھ دیکھ جس طرح دارالحدیث رحمانیہ دہلی میں آپ کے سپرد تھی اسی طرح جامعہ رحمانیہ بنارس میں بھی ان امور میں آپ کو پورا اختیار حاصل تھا اور سچی بات یہ ہے کہ آپنے ان امور کو جس دلسوزی، خلوص اور للہیت کے ساتھ انجام دیا وہ آپ ہی کا حصہ تھا۔ لیجزیہم اللہ احسن ما کانوا یعملون۔ (پ ۱۱-۴)

شیخ عطاء الرحمٰن کی وفات اور نئی ذمہ داریاں:

یکم جون ۱۹۳۸ء میں آپ کے مربی اور محسن جناب شیخ عطاء الرحمٰن نے جب دار آخرت کا سفر اختیار کیا تو دارالحدیث رحمانیہ دہلی کے فرزندوں اور ہمدردوں پر کیا گزری، اس کے بیان کرنے سے قلم کی زبان قاصر ہے، محدث کے جولائی ۱۹۳۸ء کے شمارہ میں مولانا نے اپنی قلبی واردات کو جن الفاظ میں قلمبند کیا ہے آج بھی اسے پڑھ کر آنکھیں نمناک ہو جاتی ہیں۔ ہم نے دارالحدیث کے افتتاح کے سلسلہ میں اوپر محدث کا جو اقتباس پیش کیا ہے وہ مولانا کی اسی تحریر کا ایک حصہ ہے، مہتمم دارالحدیث رحمانیہ دہلی کی وفات کے بعد مولانا املوی مرحوم اور مولانا مبارکپوری مدظلہ پر نئی ذمہ داریاں عائد ہو گئیں۔ موصوف کی وفات کے وقت میں رحمانیہ میں زیر تعلیم تھا، اس حادثہ فاجعہ کے بعد دارالحدیث میں دو ایک روز تعلیم بند رہی، اسکے بعد شیخ عبدالوہاب اور شیخ حبیب الرحمٰن (پسران جناب شیخ عطاء الرحمٰن مرحوم) رحمانیہ تشریف لائے، صبح آٹھ بجے کا وقت رہا ہوگا۔ پورے ماحول پر اداسی طاری تھی، طلبہ اور اساتذہ

یکساں غم واندوہ کا شکار تھے، ان کے آتے ہی مدرسہ کا گھنٹہ بجا اور رحمانیہ کا ہر متنفس خاموشی کے ساتھ شیخ الحدیث کی درس گاہ میں سمٹ آیا۔ مولانا نے غم واندوہ میں ڈوبی ہوئی ایک اثر انگیز تقریر کی جس میں طلبہ اور اساتذہ سے مرحوم کی شفقت اور محبت کا ذکر تھا۔ ان سے فرزندوں اور عزیزوں کی طرح مرحوم کے برتاؤ کی یاد تھی، ان کی لغزشوں اور معمولی معمولی غلطیوں پر مرحوم کے عفوو درگزر کے تذکرے تھے، مرحوم کی نوازش واکرام کے نہ بھلائے جانے والے واقعات کا اعادہ تھا۔ آپ کی وفات سے ملت اسلامیہ کو جو صدمہ پہنچا تھا، اس کے واضح اشارے تھے اور مرحوم کے حق میں دعاء مغفرت تھی۔ غرضیکہ مولانا کی اس تقریر نے ہر شخص کو آبدیدہ کر دیا۔ شیخ عبدالوہاب، اور شیخ حبیب الرحمٰن کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسوؤں کا منظر اب تک میری نگاہوں میں گھوم رہا ہے۔

مولانا کی تقریر کے بعد شیخ عبدالوہاب نے گلوگیر اور بھرائی ہوئی آواز میں فرمایا:

"اب صبر وشکر کے سوا چارہ نہیں، ہم یہاں اس لیے آئے ہیں کہ کل سے مدرسہ کی تعلیم سابقہ معمول کے مطابق شروع کر دی جائے۔ میں مدرسہ کے لیے اتنا وقت تو نہیں دے سکتا جتنا والد مرحوم دیا کرتے تھے، لیکن کوشش کروں گا کہ ہر روز کسی نہ کسی وقت آکر یہاں کے انتظامات کی دیکھ بھال کیا کروں، سابقہ معیار اور انتظام میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہونے دی جائے گی۔ ان شاء اللہ۔"

اس کے بعد دعاؤں پر اس جلسے کا اختتام ہوا۔ اور دوسرے دن سے رحمانیہ معمول کے مطابق اپنے کام میں لگ گیا، لیکن شیخ عبدالوہاب اپنی کاروباری مصروفیات سے اتنا وقت نہ نکال سکے کہ ہر روز رحمانیہ تشریف لاتے، تیسرے چوتھے دن تشریف لاتے۔ اس لیے مدرسہ سے متعلق ساری ذمہ داریاں مولانا مبارکپوری مدظلہ اور مولانا الٰہی مرحوم پر آپڑیں اور آپ حضرات نے اس بار کو اس طرح اٹھایا کہ دارالحدیث رحمانیہ کے معمول میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ وما تقدموا لانفسکم من خیر تجدوہ عند اللہ ھو خیرا واعظم اجرا۔

دورِ ابتلا و آزمائش:

اگست و ستمبر ۴۷ء میں دہلی کا ہولناک انقلاب وہاں کے مسلمانوں کے لیے قیامت صغریٰ سے کم نہ تھا، اس وقت دہلی کے مسلمان جس مصیبت سے گزرے اس کا ایک مختصر سا خاکہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی مشہور کتاب۔ "انڈیا ونس فریڈم" (India wins freedom) یا اس کے ترجمہ "ہماری آزادی" (شائع کردہ جامعہ ملیہ دہلی) میں دیکھا جاسکتا ہے۔ دارالحدیث رحمانیہ دہلی بھی اس انقلاب سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اس سلسلہ میں میں نے دارالعلوم نمبر کے لیے مولانا کی اپنی سوانح حیات سے متعلق عنایت کی ہوئی تحریر کی بنیاد پر جو مضمون مرتب کیا تھا۔ (اور جو مولانا کے ملاحظہ کے بعد شائع ہوا تھا۔) اس کا اقتباس یہاں درج کر رہا ہوں۔

اگست ۴۷ء میں جب ملک تقسیم ہوا اور اس کے نتیجہ میں دہلی کے مسلمانوں پر قیامت ٹوٹی تو اس زمانہ میں مولانا دہلی ہی میں تھے۔ مدرسہ کا اٹھائیسواں سال شروع تھا۔ تعطیل کلاں کے بعد آپ مدرسہ پہنچ چکے تھے، کیوں کہ طلبہ کے داخلے کا کام آپ ہی کے ذمہ تھا، دوسرے مدرسین ابھی نہیں پہنچے تھے۔ ستمبر کے شروع ہی میں مختلف محلوں سے گڑبڑ کی خبریں ملنے لگیں یہاں تک کہ ۶ ستمبر کو ۹ بجے رات میں خود مدرسہ پر جنوبی طرف سے ہندوؤں نے خشت باری شروع کی۔ مدرسہ کے لوگوں نے بھی اپنی مدافعت کی۔ دیر تک معرکہ آرائی رہی۔ مدرسہ کا پھاٹک بند تھا، آپ دوسرے لوگوں کے ساتھ مدرسہ کی چھت پر تھے اور وہیں سے مدافعت کر رہے تھے۔ نعرہ تکبیر کی صدا سن کر ملیٹری پہنچ گئی، اس نے مدرسہ کے باہر ہی سے کئی مرتبہ اشک آور گیس چھوڑی، گولیاں چلائیں، مگر الحمد للہ کہ کوئی زخمی نہیں ہوا۔ جب ہنگامہ فرو ہوا تو آپ عشاء کی نماز کے لیے مسجد تشریف لے گئے جو مدرسہ سے قریب مگر اس کے احاطے سے باہر تھی۔ آپ کے ساتھ دو آدمی اور تھے۔ یہ لوگ نماز سے جوں ہی فارغ ہوئے مسلح پولیس پہنچ گئی اور اس نے مسجد کو گھیر لیا۔ محلہ کے کچھ دوسرے آدمیوں کی

گرفتاری بھی ہوئی۔ سب کو پولیس لاری میں بٹھا کر تھانہ پہنچایا گیا۔ تھانہ والے شہر کے ہنگاموں کی وجہ سے اس قدر مصروف تھے کہ ان کو ان اسیرانِ بلا کے متعلق ضابطہ کی کوئی کارروائی کرنے کی فرصت ہی نہ ملی، چنانچہ دوسرے دن ۸ بجے صبح کو ان لوگوں کے پتے وغیرہ لکھے گئے اور پھر یہ لوگ دوپہر کے بعد حوالات میں بند کیے گئے۔ سنا ہے کہ ۲۴ گھنٹے سے زیادہ حوالات میں رکھنے کا قانون نہیں ہے، لیکن یہ لوگ تین روز تک حوالات ہی میں رہے۔ حوالات کی لمبائی زیادہ سے زیادہ چار گز اور چوڑائی ڈھائی گز رہی ہوگی۔ شہر میں برابر گرفتاریاں ہو رہی تھیں اور سب کو اسی میں لاکر بند کیا جارہا تھا۔ کمرہ بالکل بھر گیا۔ ۲۴ گھنٹوں میں صرف ایک مرتبہ صبح کے وقت قضائے حاجت کے لیے باہر نکالا جاتا تھا، پیشاب کے لیے ایک مٹی کی چھوٹی سی ناند رکھی ہوئی تھی جو پیشاب سے بھر جاتی تھی تو سارا کمرہ گندہ اور متعفن ہو جاتا تھا، تین دن میں صرف ایک وقت حوالاتیوں کی چیخ پکار کے بعد پولیس نے انھیں چنے ابال کر کھانے کو دیا۔ طلبہ بیچارے صبح کے وقت جب کرفیو کھلتا تھا تو کچھ روٹیاں پہنچا جاتے تھے، مگر دوسرے حوالاتیوں کے گھروں سے کچھ نہیں آتا اس لیے وہ سب بیچارے بھی بھوکے تھے انھیں چند روٹیوں کو ٹکڑے ٹکڑے بانٹ کر تسکین کر لیا کرتے تھے۔"

"ایسی گندی اور بدبودار جگہ میں آپ کو لیٹنے کی ہمت نہ ہوتی۔ جب نیند کے غلبے سے مجبور ہو جاتے تھے تو ایک کونے میں ٹیک لگا کر سہارا لیا کرتے تھے اور کچھ دیر تک غفلت ہو جاتی تھی۔ حوالاتیوں میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اس سے پہلے جیل جا چکے تھے اور وہاں کی زندگی کا تجربہ رکھتے تھے انھوں نے آپ سے کہا کہ مولوی صاحب! تھانیدار سے کہیے کہ ہم لوگوں کو جیل بھیج دیا جائے وہاں آرام رہے گا۔ چنانچہ سب لوگوں نے باتفاق اور باصرار مطالبہ کیا کہ ہم کو یہاں سے نکال کر جیل بھیج دیا جائے۔ اس کے بعد سب کو دہلی سنٹرل جیل بھیج دیا گیا۔"

"ایک مہینہ کے بعد جب عدالتیں کھلیں تو ان زندانیوں کا مقدمہ پیش ہوا۔ عدالت کے سامنے جب آپ لائے گئے تو اس نے آپ کا نام لے کر کہا کہ آپ پر چھ ہنادؤں کے قتل کا الزام ہے۔ اتنا کہہ کر عدالت خاموش ہوگئی، اور آپ بھی چپ رہے۔ دو منٹ کی خاموشی کے بعد عدالت نے خود کہا، لیکن پولیس کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اس لیے میں آپ کو بری کرتا ہوں۔ ہتھکڑیاں کھول دی جائیں، چنانچہ آپ کے ہاتھوں کی ہتھکڑیاں کھول دی گئیں۔ اور مجسٹریٹ کے اشارہ سے آپ ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔

"رہائی کے بعد جب آپ مدرسہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ مہتمم صاحب مدرسہ اور ان کے کتب خانہ کو جامعہ ملیہ کے حوالہ کر کے مع اہل و عیال کراچی چلے گئے۔ چنانچہ چند دنوں کے بعد جامعہ کی لاری آئی اور کتابیں بھر بھر کرلے گئی۔"

اوپر کی تحریر سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ذمہ داروں میں مولانا مرحوم ہی کی ایک ہستی ایسی تھی جو اس اجڑے اور لٹے ہوئے گلستان علم وفن پر آنسو بہاتی۔ ان شدائد و مصائب میں تپ کر مولانا کی امانت و دیانت اور نکھر گئی۔ آپ کا یہ حال تھا کہ پورے کتب خانہ کو از اول تا آخر جامعہ کے سپرد فرما دیا۔ اگر کسی نے کام کی کوئی کتاب یا کاغذ کا کوئی ٹکڑا رکھنا چاہا اور آپ کو اس کی خبر ہوگئی تو بڑی سختی کے ساتھ اس حرکت سے روک دیا۔ گویا اس وقت آپ ان اللہ یامرکم ان تؤدوا الامنٰت الی اھلھا کی پوری عملی تفسیر تھے۔

رہائی کے بعد دار الحدیث رحمانیہ کی خانہ ویرانی کو آپ کس دل و جگر سے دیکھتے؟ اس کا بچپن شباب اور اس کی اخیر دور کی تمام بہاریں آپ کے سامنے گزری تھیں۔ یہاں آپ نے اپنی عربی تعلیم کا ابتدائی دور بھی گزارا تھا، وسط دور بھی اور اخیر زمانہ بھی، اس کے ذرے ذرے سے آپ کو محبت تھی، اس لیے اسیری سے رہائی کے بعد اپنے گھر میں اجنبی بن کر رہنا کیسے گوارا ہوتا۔ مجبوراً آپ نے دھڑکتے دل اور نمناک آنکھوں کے ساتھ اسے الوداع کہا اور گھر جانے کے لیے روانہ ہوئے۔ اللہ کی جانب سے آپ کا جسمانی اور ذہنی امتحان تو ہو چکا تھا مگر ابھی مالی امتحان باقی تھا۔ ایک دن سب سامان لے کر

اسٹیشن پہنچے تو ریلوے افسران نے کہا کہ آگے کا راستہ محفوظ نہیں ہے، ٹرینیں لوٹ لی جاتی ہیں۔ اور مسافروں کو قتل کر دیا جاتا ہے، اس لیے ٹکٹ نہیں ملے گا۔ مجبوراً مدرسہ واپس آنے کے لیے ایک تانگہ پر سامان بار کیا اور اسٹیشن سے واپس ہوئے۔ تانگہ والا شاید گنڈوں سے ملا ہوا تھا، واپسی میں وہ آپ کو اسٹیشن سے کمپنی باغ لایا جہاں گنڈوں نے آپ کو گھیر لیا اور چشم زدن میں سارا سامان لوٹ لے گئے اس طرح تباہی کی رہی سہی داستان پوری ہو گئی اور آپ کے پاس بدن کے کپڑوں کے سوا اور کچھ نہیں رہ گیا۔

ایک مہینہ کے بعد جب ٹرینوں میں مسلمانوں کے لیے ڈبے مخصوص کیے گئے اور حفاظتی پولیس کا انتظام ہو گیا، تب آپ نومبر ۱۹۴۷ء میں اپنے وطن واپس پہنچے۔

ایک دوسری آزمائش:

مولانا کو ایک دوسری آزمائش سے اس وقت گزرنا پڑا، جب جامعہ رحمانیہ مذکورہ بنارس میں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے، کسی دشمن کی غلط اطلاع پر حکومت نے آپ کو پاکستانی قرار دیکر آپ پر کسٹوڈین میں مقدمہ دائر کر دیا۔ حالانکہ متحدہ ہندوستان میں بھی آپ کو شاید کبھی ان علاقوں میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا جو آج پاکستان کے زیرنگیں ہیں، تقسیم کے بعد پاکستان جانا تو بہت دور کی بات تھی، مولانا پر اگر پاکستان جانے کا الزام ثابت ہو جاتا تو اس کا صاف اور واضح مطلب یہ ہوتا کہ آپ کے مکان جائداد اور باغات سب کی مالک حکومت ہو جاتی اور نیلام پر چڑھا کر انھیں اونے پونے فروخت کر دیا جاتا۔ اس کے علاوہ آپ پر وطن دشمنی کا داغ الگ سے لگ جاتا۔

اعظم گڈھ میں کسٹوڈین عدالت اندرون شہر ایک عظیم کوٹھی میں قائم تھی، اس عدالت میں پبلک کیسوں کے خاص پیروکار ایک مشہور وکیل شاہ عبدالخالق مرحوم تھے، مولانا کا کیس بھی انھی کے سپرد تھا۔ حاکم ایک رفیوجی سندھی تھا، جس کے بارے میں مشہور تھا کہ جلاوطنی کی زندگی گزارنے کے باعث وہ اعصابی اور ذہنی تناؤ کا شکار ہے اور کسی مسلمان کے حق میں اس نے تعصب سے بری ہو کر حق وانصاف کے مطابق کبھی کوئی فیصلہ نہیں دیا۔

دہلی کی واپسی کے بعد سے تاریخِ مقدمہ تک مولانا کو اپنے ہندوستان میں رہنے کا ثبوت دینا تھا، یعنی ۱۹۴۷ سے ۵۳، ۵۴ ۱۹ء تک ہندوستان میں رہنے اور اس سے باہر نہ جانے کا بارِ ثبوت آپ کے ذمہ تھا۔ چھ سات سال کی طویل مدت اور یہ ثابت کرنا کہ اس پورے زمانہ میں اپنے ایک دن کے لیے بھی ملک نہیں چھوڑا کس قدر دردسری کی بات تھی؟ لیکن مولانا اس مشکل کے وقت بھی ثابت قدم رہے۔ آپ نے عدالت میں گیارہ سو سے زیادہ خطوط منی آرڈر کی ابتدائی اور واپسی کی رسیدیں اور دوسرے ثبوت کے کاغذات اتنی وافر مقدار میں پیش کیے کہ حاکم کے ہوش اڑ گئے۔ ان خطوط میں ملک کی مشہور ہستیوں سے لے کر غیر معروف لوگوں تک کے خطوط تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک خط جب عدالت کو پڑھ کر سنایا گیا تو اس نے کہا کہ اس مقدمہ میں ثبوت کے جو کاغذات داخل کیے گئے ہیں ان سے ان چھ سات سالوں کی ملک کی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔ میری خواہش ہے کہ میں ان تمام خطوط کو پڑھوں، لیکن میں اردو سے ناواقف ہوں، اس لیے اصل کے ساتھ ان تمام کاغذات کے انگریزی یا ہندی ترجمے بھی داخلِ عدالت ہوں۔

راقم الحروف کو بھی اس مقدمہ میں بطورِ گواہ پیش ہونا تھا اس لیے کہ مولانا ۱۹۴۸ء، ۱۹۴۹ء میں ایک سال تک دارالعلوم احمدیہ سلفیہ میں مقیم رہ چکے تھے۔ وہاں کا رجسٹر حاضری، رجسٹر قبض الوصول اور معائنہ کا وہ رجسٹر جس پر اسلامک اسٹڈیز صوبۂ بہار کے رجسٹرار کے معائنہ کے وقت کے دستخط تھے سب داخلِ عدالت تھے اور میں اس وقت سلفیہ میں ملازم تھا۔ مولانا نے مہتمم سلفیہ کو لکھا کہ تاریخ مقدمہ سے دو روز پیشتر مجھے ان رجسٹروں کی تصدیق کے لیے بھیج دیں، اس طرح وہاں سے میں آیا۔ بنارس سے ماسٹر عبدالمجید صاحب جونپوری جامعہ رحمانیہ کے بہت سے کاغذات لے کر پہنچے۔ اس طرح عدالت پر کاغذات اور گواہوں کی ایک یلغار ہو گئی اور حاکم حیران و ششدر ہو کر کہنے لگا کہ آج تک میرے سامنے ایسا کوئی کیس نہیں پیش ہوا جس میں اتنے ثبوت پیش کیے گئے ہوں۔

حاکم نے اپنے فیصلہ میں مولانا کو ان پر لگائے گئے الزام سے بے داغ بری کر دیا اور مولانا اس دردسری آزمائش سے بھی بحمداللہ پوری طرح کامیاب ہو کر نکلے۔

زندگی کے یہ دو واقعات آپ کی زندگی میں بڑے دشوار گزار، پریشان کن اور اضطراب انگیز تھے لیکن جب خدا کی امداد شامل حال ہو تو دہکتے ہوئے انگارے اور بھڑکتی ہوئی آگ بھی گلزار بن جاتی ہے۔ ان حالات میں جس طرح رحمت خداوندی نے آپ کی دستگیری کی اس پر بے اختیار دل سے اللہ کی تعریف اور اس کی سپاس گزاری کی دعائیں نکلتی ہیں۔

وطن کو واپسی اور بیکاری:

نومبر ۴۷ء میں جب آپ دہلی سے وطن واپس آئے تو تقریباً ایک سال تک گھر رہے۔ یہاں کوئی علمی مشغلہ نہیں تھا، اس لیے یہ وقت بیکاری میں گزرا، آپ کے برادر نسبتی نے ہمدرد کی ایجنسی لے رکھی تھی، آپ کا بیشتر وقت اسی میں گزرتا تھا۔ اواخر ۴۸ء میں جناب ڈاکٹر سید محمد فرید صاحب مرحوم کی خواہش اور طلب پر آپ دارالعلوم احمدیہ سلفیہ تشریف لے گئے اور دسمبر ۱۹۴۹ء تک یہاں درس و تدریس کی خدمات انجام دیتے رہے۔ پھر جنوری ۱۹۵۰ء سے جامعہ رحمانیہ بنارس تشریف لائے۔ تو اخیر عمر تک اسی سے متعلق رہے۔ یہاں تک کہ ۳۰ رمئی ۱۹۶۵ء کو جان جان آفریں کو سونپ دی۔

تعلیم کی خصوصیات:

مولانا کی زندگی علم دین کی خدمات کے لیے وقف تھی، آپ کے تربیت یافتہ علماء ملک کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں، ان میں کتنے ایسے ہیں جن کے زور بیان اور خطابت کا سکہ ہر طرف جما ہوا ہے کتنے ایسے ہیں جو صاحب قلم اور اچھے انشاء پرداز اور اہل تحریر ہیں نہ معلوم کتنوں نے مسند درس و تدریس کو زینت دے رکھی ہے۔ کتنے صاحب محراب و منبر ہیں۔ کچھ صاحب تصنیف و تالیف بھی ہیں۔ یہ سب آپ کی للہیت اور خلوص کا کرشمہ تھا کہ ۳۹ سال کی تدریسی زندگی میں آپ نے اتنے اہل علم اور صاحب فضل و کمال پیدا کیے، آپ کی تعلیم کی خصوصیات میں یہ بات داخل تھی کہ طلبہ کو ہمیشہ مطالعہ کی تاکید فرماتے، اگر طلبہ دوران درس جاندار سوالات نہ کریں تو بڑے کبیدہ خاطر ہوتے

اور یہ سمجھتے کہ یہ لوگ مطالعہ نہیں کرتے، ان کی عبارتوں پر خاص توجہ دیتے، مجال نہیں کہ کوئی طالب علم غلط عبارت پڑھ کر آگے بڑھ جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی تربیت پر خاص نگاہ رکھتے۔ راتوں کو ان کے مطالعہ اور کتب بینی کی نگرانی فرماتے۔ دورانِ درس اگر کسی طالب علم کے بارے میں یہ محسوس ہوتا کہ وہ استاد کی تقریر کی طرف دھیان نہیں دیتا تو سرزنش کے ساتھ ساتھ بسا اوقات اسے جسمانی سزا دینے سے بھی گریز نہیں کرتے، ہمیشہ یہ کوشش فرماتے کہ کتاب کا کوئی گوشہ تشنۂ تشریح نہ رہ جائے اور طلبہ پوری طرح کتاب کو سمجھ کر سبق سے اٹھیں۔ حدیث و تفسیر کے اسباق میں مذاہب اور ان کے مدار و ماخذوں کی تشریح کے ساتھ مسلک کے دلائل ہمیشہ بیان فرماتے۔ طلبہ کے لباس و وضع قطع اور نماز با جماعت کی حاضری پر ہمیشہ آپ کی نظر رہا کرتی تھی اور ان باتوں کے لیے ہمیشہ انھیں فہمائش کیا کرتے تھے۔ غرضیکہ مولانا ایک شفیق مربی اور عاقبت اندیش استاد کی حیثیت سے ہمیشہ طلبہ کی نگرانی فرمایا کرتے اور ان کی فلاح و کامرانی میں برابر کوشاں رہتے۔

تقریر و تحریر:

آپ کی تقریریں بلا کی اثر انگیزی تھی جو بات کہتے دلوں میں اترتی جاتی، زورِ بیان ایسا کہ سننے والے دم بخود رہ جاتے۔ اظہارِ حق میں کبھی آپ نے مداہنت نہیں کی۔ نہ تو ملامت گروں کی ملامت کا ڈر اور نہ کسی کی خوشی اور ناخوشی کی پرواہ۔ غیروں کے بھرے مجمعوں میں اظہارِ حق سے باز نہ رہتے۔ بنارس کی مسجد اہلحدیث میں جب آپ نے پہلا خطبہ دیا تو سمجھدار اور سنجیدہ لوگ کہنے لگے کہ تقریریں تو بہت سی سنی ہیں لیکن مولانا کا اندازِ بیان جداگانہ اور نرالا ہے۔ ایسی تقریر زندگی میں پہلی بار سننے کا اتفاق ہوا ہے۔

مولانا لکھنؤ کی دینی تعلیمی مجلس کے ممبر تھے۔ علی میاں، مولانا منظور نعمانی، قاضی عدیل عباسی اور دوسرے نامور اہلِ علم کے ساتھ آپ بھی اس کی نشستوں میں شریک ہوتے رہے۔ بچوں کے لیے ابتدائی نصاب تعلیم کی ایسی کتابوں کی تصنیف کا مسئلہ درپیش تھا جو بچے کے لیے قابلِ قبول ہوں۔ بات یہ چل رہی تھی کہ دینیات کی تصنیف کس ڈھنگ سے کی جائے؟۔

کسی ممبر نے مشورہ دیا کہ دیوبندی عقائد کے مطابق انہیں لکھوایا جائے۔ مولانا نے فرمایا کہ اس میں تمام مذاہب کی نمائندگی نہیں ہوتی اس لیے یہ کتابیں دوسرے اہلِ مذاہب کے لیے قابلِ قبول نہ ہوں گی۔ اس پر یہ ترمیم پیش ہوئی کہ دوسرے مذاہب کی باتیں حاشیہ پر لکھ دی جائیں۔

مولانا نے فرمایا کہ سب سے بہتر یہ ہے کہ کتابیں قرآن و سنت کے مطابق لکھوائی جائیں۔ دیوبندی اور دوسرے مکتبۂ فکر کی وضاحت اس کے حاشیہ پر کر دی جائے۔ بالآخر بات اس پر ختم ہوئی کہ ہر مکتبۂ فکر کو آزادی دے دی جائے کہ وہ اپنے مسلک کے مطابق اپنی کتابیں تصنیف کر کے داخلِ نصاب کر لے۔

مولانا کی تحریر بھی بڑی دلگداز اور پُر اثر ہوا کرتی تھی۔ زیرِ نظر کتاب سے ناظرین آپ کے اندازِ تحریر کا بخوبی پتہ چلا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ مولانا کی متعدد دیگر تصنیفات ہیں۔ تراویح سے متعلق آپ کی معرکۃ الآرا تصنیف ایسی مسکت دندان شکن اور پُر از معلومات ہے کہ اس بحث کو آپ نے آخری حد تک پہنچا دیا ہے۔

اس کے علاوہ "رد عقائد بدعیہ" اپنے موضوع پر ایک نرالی کتاب ہے۔ جب آل انڈیا اہلحدیث کانفرنس میں بچوں کی درسی کتابوں کی تصنیف کا مسئلہ پیش ہوا تو یہ خدمت آپ کو سونپی گئی۔ آپ نے جمیل اسلام کے متعدد حصوں کو رمضان کی تعطیل میں مرتب فرما کر اسے کانفرنس کے حوالے فرما دیا۔ اور احتیاط یہ کی کہ مصنف کی حیثیت سے آپ کا نام کہیں نہ آنے پائے۔ جس زمانے میں آپ اس کی تصنیف فرما رہے تھے۔ مجھ سے فرمایا کہ بچوں کے معیار کے مطابق کچھ نظمیں لکھوں تاکہ ان کو شاملِ کتاب کیا جا سکے۔ میں نے چند نظمیں آپ کی خدمت میں پیش کیں۔ فرمایا کہ اس کی زبان بچوں کے معیار سے کچھ بلند ہے لیکن مضائقہ نہیں۔ دو نظموں کو آپ نے تیسرے حصہ میں شامل فرما لیا۔ اس حصہ کے ابتدا کی حمد و نعت آپ ہی کی فرمائش پر لکھی گئی تھی۔

مولانا کی تحریر حشو و زوائد سے پاک ہوا کرتی تھی۔ جب کسی کی بات کی گرفت کرتے تو اس کے فرار کے تمام راستے مسدود ہو جایا کرتے۔ تردید میں دلائل کے انبار لگا دیتے تھے اور تمام دلیلیں مستند و معتبر ہوا کرتی تھیں۔ حوالوں میں بڑی احتیاط برتتے۔ کسی کی کوئی بات کسی دوسرے شخص کی تحریر سے ثبوت میں پیش کرنی ہوتی تو جب تک اصل مرجع سے اس کا مقابلہ نہ کر لیتے مطمئن نہ ہوتے۔ ایک

مرتبہ ایک بڑے مصنف کے بارے میں فرمایا کہ ان کے حوالوں پر مجھے اعتماد نہیں ہے۔ بار بار کے تجربوں کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں، تم بھی اصل سے مقابلہ کیے بغیر ان کے حوالوں پر اعتماد نہ کرو۔

غرضیکہ مولانا اپنی خصوصیات کے اعتبار سے یگانۂ روزگار شخصیت کے مالک تھے۔ مجھ سے بار بار فرمایا کہ جب کسی کے رد میں مجھے کوئی جوابی مضمون لکھنا ہوتا ہے تو جب تک تمام دلائل نہ لکھ لوں مجھے چین نہیں آتا۔ مختصر الفاظ میں ایسا ٹھوس، معقول اور دندان شکن جواب دیتے کہ آپ کی قادر الکلامی پر حیرت ہوتی۔

حالات اور وقت کے تقاضوں کے مطابق مولانا کے بہت سے قیمتی مضامین ملک کے مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ دار الحدیث رحمانیہ دہلی کا ماہنامہ "محدث" محرم ۱۳۵۲ھ مطابق مئی ۱۹۳۳ء سے ستمبر ۱۹۳۷ء تک برابر شائع ہوتا رہا۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانہ میں جب کاغذ کی نایابی شباب پر پہنچ گئی تو مجبوراً جنوری ۱۹۴۳ء سے اس کی اشاعت ملتوی کر دینی پڑی۔ پھر جب حالات کچھ سازگار ہوئے، تو اپریل ۱۹۴۶ء سے اس کی اشاعت دوبارہ شروع ہوئی۔ اس میں مولانا کے قلم سے جو مضامین شائع ہوئے ان کی جامعیت اور افادیت کا فیصلہ ناظرین خود فرما سکتے ہیں۔ دار العلوم احمدیہ سلفیہ دربھنگہ میں قیام کے دوران آپ نے "الہدی" کی خدمت بھی کی ہے، اس میں کتنے مضامین ایسے ہیں جن پر موصوف کا نام نہیں ہے۔ مثلاً ۱۲ رمئی ۱۹۴۹ء کا افتتاحیہ بعنوان "تذکار شہیداں اور اہلحدیث" یا ۱۶ رمئی ۱۹۴۹ء کی اشاعت میں "فتنۂ اشتراکیت" کے عنوان سے جو مضمون شروع ہوا ہے، اور پانچ قسطوں میں اختتام پذیر ہوا ہے وہ بھی آپ ہی کا لکھا ہوا ہے۔

ملک کے دوسرے اخبارات و رسائل مثلاً "زندگی" رام پور، اخبار "مدینہ" بجنور، "معیار"، "ترجمان" دہلی، "الاعتصام" لاہور، اخبار "محمدی" مرحوم وغیرہ میں بھی وقتاً فوقتاً آپ کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔

جماعتی درد:

انقلاب ۱۹۴۷ء کے بعد جماعتِ اہلحدیث کا واحد تبلیغی ادارہ "آل انڈیا اہلحدیث کانفرنس" انحطاط کی زد میں آگیا۔ تقسیم کی وجہ سے جماعت کے بہت سے جید علماء ہندوستان سے کٹ گئے۔ جو لوگ یہاں رہ گئے تھے ان میں سے بھی بہت سے لوگ ترک وطن کرکے پاکستان کے شہری بن گئے۔ دہلی شہر جو جماعت کا علمی گہوارہ تھا۔ تقریباً قابلِ ذکر علماء سے خالی ہوگیا۔ یوپی اور بہار وغیرہ میں چند گنی چنی شخصیتیں رہ گئی تھیں۔ اس لیے کانفرنس بھی انحطاط کا شکار ہوگئی یہاں تک کہ اس کی تمام سرگرمیاں موقوف رہیں بالآخر مولانا اور آپ کے کچھ رفقاء نیز حضرت مولانا عبدالوہاب آروی، مدظلہ کو کانفرنس کے احیاء کا خیال پیدا ہوا۔ کافی جدوجہد کے بعد اس کا دستورِ اساسی مرتب ہوا، ممبرسازیاں ہوئیں۔ نئے انتخابات عمل میں آئے اور حرکت وعمل کے آثار پیدا ہوئے۔ مولانا نے اس سلسلہ میں زبان وقلم اور دوادوش سے کانفرنس کی جو خدمتیں انجام دی ہیں ان کی تفصیلات ایک مستقل عنوان کی طالب ہیں۔ مختصر یہ کہ آپ کو جماعت کا جتنا درد تھا اور اجتماعی حیثیت سے عملی جدوجہد کے آپ جتنے خواہش مند تھے اب وہ درد اور خواہش دوسروں میں بہت کم نظر آتی ہے۔

اتفاق کی بات ہے کہ ۳۰ رمئی ۱۹۶۵ء کو جب "صوبائی جمعیتہ اہلحدیث یوپی" کا انتخابی اجلاس بنارس میں ہورہا تھا عین کارروائی کے دوران مولانا کی خطرناک علالت کی اطلاع بذریعہ ٹیلیفون و ٹیلی گرام بنارس پہنچی اور مقامی وغیر مقامی تمام شرکائے اجلاس انتخابی کارروائی کو تشنہ چھوڑ کر بسوں اور ٹیکسیوں کے ذریعہ آپ کے وطن الو روانہ ہوگئے۔ بالآخر اسی دن آپ کا وصال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرکزی دار العلوم اور نصاب تعلیم کمیٹی:

مولانا کو مرکزی دار العلوم کے قیام سے جو لگاؤ تھا، اس کی لکھائی ہمارے حیطۂ امکان سے باہر ہے

دعلوم جمعہ کے کتنے خطبات میں آپ نے اس کی ترغیب وتحریض دلائی۔ اس کی میٹنگوں میں برابر شریک ہوتے رہے۔ اس سے متعلق شائع ہونے والے تمام پوسٹر اشتہارات اور اعلانات آپ کی نگاہوں سے گزرے۔

مولانا مرکزی دارالعلوم کی نصاب تعلیم کمیٹی کے کنوینر تھے اور سخت علالت کے باوجود اس کی پوری نشستوں میں شرکت فرمایا کرتے۔ تکلیف کی وجہ سے بیٹھنا دوبھر ہوتا لیکن تکیہ کے سہارے لیٹ کر اس کی کارروائی میں حصہ لیتے۔ اس طرح آپ کی سرگرمی میں دارالعلوم کا پہلا نصاب تعلیم مرتب ہوا۔

علالت اور وفات:

مولانا کی علالت بہت پہلے شروع ہوئی، بیماری کی پہلی تکلیف اس وقت محسوس ہوئی جب آپ رمضان کی تعطیل میں گھر تھے۔ پھر کچھ افاقہ ہوگیا۔ تعطیل ختم کرکے جب آپ عازم بنارس ہوئے تو راستہ میں پھر یہ تکلیف عود کر آئی۔ ایک جانب کے پہلو میں شدید قسم کا درد اٹھتا جو آپ کو بے چین بنا دیتا۔ سینکنے اور مالش کرنے سے کچھ کم ہوجایا کرتی تھی۔ بنارس میں یونانی اور ایلوپیتھک علاج برابر ہوتا رہا۔ جامعہ رحمانیہ کے سرپرستوں نے مولانا کے علاج ومعالجہ کے سلسلہ میں جو خدمات انجام دی ہیں، وہ ناقابلِ فراموش ہیں، اللہ انھیں اس کا اجر دے۔

علاج کے ساتھ ساتھ مرض بڑھتا گیا۔ جامعہ رحمانیہ کے طلبہ اور اساتذہ بیشتر اوقات آپ کی خدمت میں حاضر رہتے اور آپ کی خدمت کو اپنی سعادت سمجھتے۔ جب بیماری نے بہت طول کھینچا تو لوگوں کی رائے ہوئی کہ آپ کو ہندو یونیورسٹی کے سرسندر ہسپتال میں داخل کردیا جائے۔ اس کے لیے ایک پرائیوٹ کمرہ لیا گیا اور مولانا کو کار کے ذریعہ وہاں پہنچایا گیا۔ ڈاکٹروں نے پہلے ہی معائنہ میں شبہ ظاہر کیا کہ آپ کو کینسر کی شکایت ہے۔ یہ سن کر لوگوں کے ہوش اڑ گئے۔ بہرصورت وہاں علاج ہوتا رہا۔ ڈاکٹروں نے آپ کے آپریشن کی تجویز رکھی اور آخر وہ تاریخ آگئی جب مولانا کا آپریشن ہونا تھا۔ آپ کو آپریشن کے تھیٹر روم میں لے جایا گیا اور گھنٹوں کے بعد واپس لایا گیا۔ تھوڑی ہی دیر

کے بعد لوگوں میں یہ خبر گشت کرنے لگی کہ مقام ماؤف کو کھول کر ڈاکٹروں نے آپ کا مرض دیکھا اور کسی عملی جراحی کے بغیر اسی طرح ٹانکے لگا دیے، اس لیے کہ مرض لا علاج حد تک ترقی کر گیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

مولانا آپریشن کا زخم بھرنے تک ہسپتال کے نرسنگ ہوم میں زیر علاج رہے۔ جب ڈاکٹروں نے جانے کی اجازت دیدی تو آپ دار الاقامہ منتقل ہو گئے۔ نقاہت اور کمزوری حد سے زیادہ تھی کچھ دنوں دار الاقامہ میں رہنے کے بعد آپ اپنے وطن آنے کے لیے پریشان ہو گئے۔

آپریشن سے لے کر گھر آنے تک آپ کو آپ کے مرض کی اطلاع نہیں دی گئی کہ مبادا آپ کی پریشانی بڑھ جائے۔ ویسے ملاقات کے لیے آنے والے مختلف حضرات کی زبانی آپ کو معلوم ہو گیا کہ میرا مرض ڈاکٹروں نے کینسر بتایا ہے اور بغیر کسی عملی جراحی کے مجھے ہسپتال سے رخصت کیا گیا ہے۔

ہسپتال کی ایمبولینس کار کے ذریعہ آپ کو راتوں رات بنارس سے گھر لایا گیا اور چند ہی دنوں کے بعد آپ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

شادی اور اولاد:

مولانا نے اپنی زندگی میں تین شادیاں کیں۔ پہلی شادی کاٹھ گراؤں ہوئی، جس کا ریلوے اسٹیشن بلتھرا روڈ ہے، جو بلیا کی لائن میں مئو سے تین چار اسٹیشن آگے ہے۔ اس شادی سے مولانا کے ایک لڑکی پیدا ہوئی جو سات آٹھ سال کی ہو کر انتقال کر گئی۔ اس بیوی کے انتقال کر جانے کے بعد دوسری شادی بھوجاپور ہوئی۔ جو ضلع غازی پور کا ایک موضع ہے اور اس کا اسٹیشن پیری ڈیہہ ہے، اس شادی سے بھی ایک لڑکی تھی جس کا نام زیب النساء تھا، لیکن یہ بچی بھی کم عمری ہی میں انتقال کر گئی۔ یہ بیوی خوش آئند ثابت نہ ہو سکی۔ اس لیے مولانا نے طلاق دے کر اسے علیحدہ کر دیا۔ تیسری شادی گاؤں میں شیخ عبد الرحمن کی لڑکی صالحہ خاتون سے ہوئی جو اب تک بقید حیات ہیں۔ ان سے مولانا کی تین اولاد نرینہ اور دو لڑکیاں ہیں۔ لڑکوں کے نام علی الترتیب آفتاب احمد، ہلال احمد اور نہال احمد ہیں۔ بڑی لڑکی کا نام عابدہ خاتون اور چھوٹی کا رضیہ خاتون ہے۔

آفتاب احمد مئوناتھ بھنجن میں ایک جگہ ملازم ہیں[ا] اور نہال احمد تحصیلِ معاش کے لیے دوکانداری میں مصروف۔ البتہ ہلال احمد جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے فراغت کے بعد جامعہ ہی[۲] کے تبلیغی مشن پر نیجیریا (افریقہ) میں مامور ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں مولانا کا صحیح جانشین بنائے۔ آمین۔

زہد و تقویٰ، حق گوئی و بے باکی:

پہلے ہم ذکر کر چکے ہیں کہ مولانا بڑی شدت کے ساتھ سنّت کی پابندی فرماتے تھے۔ کتاب و سنت کے خلاف کوئی بات گوارا نہ کرتے۔ فرائض، واجبات و سنن کی رعایت میں ہمیشہ سبقت فرماتے۔ میں نے دسیوں سال سے زیادہ سفر و حضر میں آپ کی خدمت کی ہے اور آپ کے ساتھ رہا ہوں۔ بلکہ فارسی کے کچھ حصہ کی تعلیم سے لے کر عربی کی تکمیل تک مجھے آپ کی شاگردی کا فخر حاصل ہے۔ جامعہ رحمانیہ، بنارس میں تدریسی خدمات انجام دیتے وقت بھی میں مولانا ہی کے سایۂ عاطفت میں رہا۔ اس لیے میں نے مولانا کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ آپ کے اندر ایمانی حرارت اور دینی گرمی اتنی زیادہ تھی کہ لوگ آپ کے سامنے جاتے گھبراتے تھے۔ آپ کی شخصیت بڑی پُروقار تھی، کم گوئی عادت میں داخل تھی، مگر جب کوئی ناگوار بات دیکھتے یا سنتے تو خاموش نہ رہ سکتے اور کھل کر اس کی مذمت کرتے۔ اتباعِ حق ہی ایک مسلمان کی سب سے بڑی سعادت ہے، اس لیے مولانا جیسا متقی اور پرہیزگار مشکل سے ملے گا۔

مولانا کی حق گوئی و بے باکی کے بہت سے واقعات ہیں۔ ان تمام کی تفصیل طوالت کا سبب ہوگی اس لیے صرف ایک بات کے ذکر پر اکتفا کرتا ہوں۔ مولانا حفظ الرحمٰن کے انتقال پر بنارس میں ایک تعزیتی جلسہ ہوا۔ صدر مولانا عبد المتین صاحب مرحوم رئیسِ بنارس تھے۔ مقررین میں ہر طبقہ اور ہر خیال کے لوگ تھے اس لیے یہ جلسہ ہر فرقہ کا نمائندہ جلسہ تھا۔ ایک مقرر نے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے جنگِ آزادی سے متعلق دار العلوم دیوبند کی طرف کچھ غلط باتوں کا انتساب کیا۔ اس کے بعد مولانا کی باری تھی۔ آپ نے جنگِ آزادی کی پوری تاریخ ادھیڑ کر رکھ دی اور اچھی طرح واضح کر دیا کہ فرطِ عقیدت میں لوگ کتنی غلط بیانیاں کرتے ہیں۔؟

ا۔ اگست ۱۹۷۲ء سے جامعہ سلفیہ کے ہیڈ اکاؤنٹنٹ ہیں۔ ۲۔ جامعہ ہی میں دار الافتاء کے مبلغ تھے۔

آپ کی تقریر سے جلد کی فضا بدل گئی اور لوگوں کو جنگ آزادی کی صحیح تاریخ معلوم ہو گئی۔ یہ تقریر ریکارڈ ہو کر اٹینگ اصحاب موجودہ کے پاس محفوظ ہے۔

مولانا نے جس ماحول میں پرورش پائی اور آپ کی زندگی پر جو باتیں اثر انداز ہوئیں اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ حق پسندی، صدق شعاری، آپ کی طبیعت ثانیہ بن جاتی، ایسی حالت میں یہ تہمت اور اتنا بڑا الزام کہ ہندوستان کی تحریک آزادی اور ملک کی سیاسی زندگی میں جماعت اہلحدیث کا کوئی کردار کوئی حصہ نہیں ہے، کس طرح برداشت کر سکتے تھے یہ تہمت آپ کی غیرت کے لیے ایک کھلا ہوا چیلنج تھی۔ اس لیے آپنے اس الزام کو دفع کرنے کے لیے قلم اٹھایا۔ موجودہ کتاب مولانا کے اسی جواب کی لکھائی کتابی ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد ناظرین کرام خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ الزام دینے والوں کی بات میں کتنا وزن ہے؟۔

دارالحدیث رحمانیہ دہلی اور اس کے مہتمم جناب شیخ عطاء الرحمن مرحوم اس تحریک جہاد و حریت وطن کے علمبرداروں میں تھے۔ اس لیے مولانا کی روح کو یہاں سے بھی ہی غذا ملی اور مولانا اس میدان کے مجاہد بن گئے۔ مولانا کی ہستی ایک مغتنم ہستی تھی اگر آپ کی زندگی اور صحت کچھ دنوں اور ساتھ دیتی تو معلوم نہیں آگے آپ دین و ملت کی کتنی خدمتیں انجام دیتے۔ اللهم اغفرله وارحمه واکرم منزله ووسع مدخله واغسله بالماء والثلج والبرد۔

آزاد رحمانی

۷ جولائی ۱۹۷۲ء / ۲۵ جمادی الاولی ۱۳۹۲ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

الحمد للہ رب العلمین والعاقبۃ للمتقین۔ والصلوٰۃ والسلام علیٰ خاتم الانبیاء والمرسلین محمد والہ وصحبہ واتباعہ اجمعین۔

امّا بعد:

متحدہ ہندوستان کی سب سے پہلی وہ انقلابی تحریک جس کی بابت یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ وہ اپنے نصب العین اور مقاصد کے لحاظ سے صحیح معنی میں دینی بھی تھی اور سیاسی بھی، وہ ہے سید احمد بریلوی اور مولانا اسماعیل الشہیدین کی تحریک جہاد وتجدید دین۔ یہ تحریک اب کافی متعارف ہو چکی ہے۔ اس پر اخبارات اور رسائل میں بھی مضامین لکھے گئے ہیں اور کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں۔ کسی نے بسط وتفصیل سے لکھا ہے اور کسی نے تلخیص واختصار کے ساتھ۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس تحریک کے قائدین میں بھی اور اس کے متبعین و معاونین میں بھی احناف اور اہلحدیث دونوں مسلک کے افراد شامل تھے۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس تحریک کو چلانے اور اس کو ایک عرصہ تک باقی رکھنے

کے لیے اہلحدیثوں کی جانی اور مالی قربانیاں ایک نمایاں شان رکھتی ہیں۔ بالخصوص بالاکوٹ میں شہادت کا حادثہ (۱۸۳۱ء/۱۲۴۶ھ) پیش آجانے کے بعد تو اس کے جھنڈے کو اونچا رکھنے کی سعادت جن بزرگوں کو حاصل ہوئی وہ صادق پور (پٹنہ) کے اہلحدیث ہی تھے۔ یہاں تک کہ انگریز حکومت کے دور استبداد میں جب اس تحریک کا ظاہری سطح پر باقی رکھنا دشوار ہوگیا تو وہ اہلحدیث ہی تھے جن کے سینوں میں اس کے شرارے سلگتے رہے۔ انھوں نے کبھی بھی اس تحریک سے کلی طور پر اپنا تعلق منقطع نہیں کیا۔ وہ نہایت خفیہ طریقے پر سرحد کے پار بقیۃ السیف مجاہدین کو برابر ہر قسم کی امداد پہنچاتے رہے۔ اس کے علاوہ بھی انگریزی حکومت کے خلاف ملک میں جب کبھی کوئی شورش برپا ہوئی اور کوئی سیاسی تحریک چلائی گئی تو اہلحدیث اپنے تناسب آبادی کے لحاظ سے برابر اس میں شریک ہوتے رہے۔ متحدہ ہندوستان کی کوئی ایسی انقلابی تحریک نہیں بتائی جاسکتی جس میں اہلحدیث افراد شامل نہ رہے ہوں۔ مگر تاریخ کے ساتھ یہ بے انصافی اور تنگ نظری دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ اہلحدیث کی جہادی اور سیاسی خدمات کو چھپانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اتنا ہی نہیں کہ متعصب تاریخ نگار ان کا ذکر نہیں کرتے، بلکہ نوبت یہاں تک آگئی ہے کہ کہنے والے نے برملا کہہ دیا کہ:

"۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے لے کر اب تک اہلحدیث کے علماء و مشائخ نے سیاست اور عملی جہاد میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ نہ سیاست سے از آں دم تا ایں دم ان کو کوئی لگاؤ ہے۔ بہت عرصہ ہوا جماعت اہلحدیث سیاست سے الگ ہو چکی ہے۔ اس کو بالاکوٹ سے آج کچھ بھی لگاؤ اور نسبت نہیں

رہ گئی ہے۔" (اخبار اہلحدیث دہلی بابت یکم دسمبر ۱۹۶۱ء)

میں نے اس مکروہ اور غلط الزام کے خلاف اخبار میں پرزور احتجاج کیا اور جواب میں "اہلحدیث اور ریاست" کے عنوان سے مسلسل کئی قسطوں میں مضامین لکھے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ان مضامین کے حق میں بہت سے اہل علم اور اصحاب ذوق حضرات نے صدائے تحسین بلند کی۔ زبانی اور خطوط کے ذریعہ میری حوصلہ افزائی کی۔ اور مطالبہ کیا کہ یہ مضامین کتابی شکل میں مرتب کرکے شائع کیے جائیں۔ چنانچہ اس مشورے کے بعد میں نے اخبار میں اس مضمون کی اشاعت بند کردی اور کتابی ترتیب کی طرف متوجہ ہوگیا۔

•••

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اہلحدیث اور سیاست

اخبار اہلحدیث دہلی بابت یکم دسمبر ۱۹۶۱ء میں "سفر بالیر کوٹلہ پنجاب" کے عنوان سے مولانا عبدالرؤف صاحب رحمانی جھنڈا نگری کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے دہلی کے مشہور محلہ پھاٹک حبش خاں کی مسجد محتسب میں ایک کشمیری فاضل سے اپنی ملاقات اور کشمیری صاحب کے "گہرے تاثرات"، "اور قیمتی علمی افادات" سے مستفیض ہونے کا تذکرہ بڑے شاندار الفاظ میں کیا ہے۔ کشمیری فاضل نے مولانا جھنڈا نگری کی معرفت جماعت اہلحدیث کے نام اپنا ایک "پیغام" بھی بھیجا ہے جس کو بڑی سعادت مندی کے ساتھ ہمارے عزیز محترم مولانا جھنڈا نگری نے اخبار اہلحدیث کے ذریعہ جماعت کو پہنچایا ہے۔ مولانا جھنڈا نگری لکھتے ہیں:

"۱۰ اپریل کی شب میں مسجد محتسب میں جماعت اہلحدیث کے ایک ممتاز اور بابصیرت عالم و ممبر پارلیمنٹ مولانا عبدالرحمٰن صاحب کشمیری سے ملاقات ہوئی۔ آپ نے خاکسار سے جماعتی حالات پر بہت دیر تک بہت دلچسپ باتوں کا سلسلہ قائم رکھا .... ازاں جملہ فرمایا کہ آج کے موجودہ بے عمل اہلحدیث افراد کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ شیخی اڑاتے ہوئے بالاکوٹ سے اپنی انبت ی

لن ترانیاں سناتے رہیں ...... مولانا کشمیری نے کہا کہ سرخیل جماعت سید الطائفہ مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی نے بھی سیاست سے کنارہ کشی کرلی۔ انگریزوں کے خلاف فتویٰ جہاد پر دستخط نہیں کیے ...... اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مولانا نے ایک میم کی جان بچائی تھی اور اس کے معاوضہ میں ان کو کئی کئی بار انعام ملا۔ یہ بھی فرمایا کہ یہ تمام حالات اشاعۃ السنۃ میں موجود ہیں۔ سرخیل علماء مولانا سید نذیر حسین کے وقت سے لے کر ابتک آپکے علماء و مشائخ نے سیاست اور عملی جہاد میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ ...... نہ سیاست سے ازاں دم تا ایں دم کوئی لگاؤ ہے۔ کہنے لگے میرا پیغام پہنچا دیا جائے کہ جماعتِ اہلحدیث بہت عرصہ ہوا سیاست سے الگ ہو چکی ہے۔ اس کو بالاکوٹ سے اور سیاست و عملی اقدام سے آج کچھ بھی لگاؤ اور نسبت باقی نہیں رہ گئی۔"

ہم نے اس پیغام رسانی کی خدمت کو مولانا جھنڈا نگری کی سعادتمندی اس لیے کہا ہے کہ انھوں نے کشمیری صاحب کے اس پیغام کو جماعت اہلحدیث تک پہنچا دینے ہی پر اکتفا کر لینا مناسب نہیں سمجھا، بلکہ ساتھ ہی یہ بھی ضروری سمجھا کہ اس کے آخر میں اپنا تائیدی و تصدیقی دستخط بھی ثبت فرمادیں، چنانچہ لکھتے ہیں:

"ممکن ہے ماحول کی عدم مساعدت کا عذر کیا جائے، لیکن بہرحال یہ صحیح ہے کہ میدانِ سیاست و معرکہ بالاکوٹ جیسے عملی اقدام سے جماعت اہلحدیث ایک عرصہ سے علیحدہ ہو چکی ہے۔"

ہم چوں کہ کشمیری صاحب کے متعلق اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہیں کہ وہ اہلحدیث

ہیں اس لیے ان کے تاثرات اور ارشادات کی بابت تو ہمیں کوئی تعجب نہیں ہوا۔ لیکن اپنے عزیز بھائی مولانا جھنڈا نگری کی اس تائید و تصدیق کو پڑھ کر افسوس ضرور رہوا۔ اور کسی کا یہ شعر یاد آیا ؎

خندۂ اہلِ جہاں کی مجھے پروا کیا تھی
تم بھی ہنستے ہو مرے حال پہ رونا یہ ہے،

ہم نہیں کہہ سکتے کہ مولانا جھنڈا نگری کن اطلاعات کی بنا پر محترم ممبر پارلیمنٹ موصوف کو "جماعت اہلحدیث کا ممتاز اور بالبصیرت عالم" سمجھ رہے ہیں۔ حالانکہ وہ صرف انگریزی تعلیم یافتہ ہیں اور اپنے مسلک کی بابت برابر اس کا اظہار کرتے رہتے ہیں کہ "وہ میں اہلحدیث نہیں ہوں"۔ ابھی تین چار مہینے پہلے (ستمبر ۱۹۶۱ء میں) آل انڈیا اہلحدیث کانفرنس کی مجلسِ عاملہ کی ایک میٹنگ میں شرکت کے لیے میرا دہلی جانا ہوا تھا۔ میرے ساتھ رفیق مکرم حضرت مولانا عبیداللہ صاحب مبارکپوری مدظلہ العالی بھی تھے۔ پھاٹک حبش خان دہلی ایک اہلحدیث رئیس کے مکان پر تمام ممبرانِ عاملہ ناشتہ پر مدعو تھے۔ وہیں ممبر پارلیمنٹ موصوف بھی تشریف لائے تھے اور مولانا مبارکپوری سے گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے صاف صاف فرمایا کہ "میں اہلحدیث نہیں ہوں"۔ اس کے علاوہ درایۃً بھی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ سیکولر حکومت کی پارلیمنٹ کا ممبر ہوتے ہوئے موجودہ حالات میں اہلحدیث کہلانا گوارہ بھی کیسے کریں گے؟۔ جبکہ اس جماعت میں نہ جہاد کی روح ہے اور نہ سیاست میں عملی اقدام کی جرأت۔ وہ تو شاید پارلیمنٹ میں اپنے "مجاہدانہ عزائم" کی تکمیل ہی کے لیے تشریف لے گئے ہیں۔ اللہ ان کی مدد فرمائے۔

میں جانتا ہوں کہ باوجود انگریزی تعلیم یافتہ ہونے کے مذہبیات کے متعلق بھی موصوف

کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ عربی کتابوں کے اردو ترجمے انھوں نے خوب پڑھے ہیں۔ بہت سی عربی کتابوں کی نسبت ہم نہیں جانتے کہ ان کا اردو ترجمہ ہوا ہے یا نہیں لیکن وہ پوری بصیرت کے ساتھ بتا سکتے ہیں کہ کب ہوا ہے اور کس نے کیا ہے۔ مذہبی کتابوں کے مطالعہ کا بڑا شوق ہے۔ برابر ایسی کتابوں کی جستجو اور تلاش میں رہتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ بلاشبہ قابلِ قدر اور لائقِ احترام ہیں۔ اگرچہ عربی کی استعداد اتنی نہیں کہ عربی کتابوں سے براہِ راست خاطر خواہ استفادہ کر سکیں۔ تاہم مذہب کے شغف اور شوقِ مطالعہ کی فراوانی کا یہ اثر ہے کہ بعض مسائل کی واقفیت میں وہ ہم سے بہت آگے ہیں۔ مگر ساتھ ہی مجھے اس حقیقت کا اظہار کرنے میں بھی کوئی تامل نہیں ہے کہ ہندوستان[1] کی تحریک اہلحدیث کی بابت موصوف کے خیالات ہرگز صحیح نہیں ہیں، اور اطلاق وعمومیت کے ساتھ ان کا یہ الزام لگا دینا کہ عرصہ ہوا جماعت اہلحدیث سیاسیات سے قطعاً الگ ہو چکی ہے، واقعات کے بالکل خلاف ہے۔ ہم فاضل کشمیری کے اس تاثر پر کیا تعجب کریں کہ شیخ الکل حضرت مولانا سید نذیر حسین رحمۃ اللہ علیہ انگریز کے خلاف نہ تھے، جبکہ کہنے والوں نے خود حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت بھی کہہ دیا کہ وہ انگریز کے مخالف نہیں تھے ان کی تحریک جہاد انگریزوں کے خلاف نہیں، بلکہ صرف سکھوں کے خلاف تھی۔ مولانا ابوالحسن علی میاں نے "سیرت سید احمد شہید" میں اس کا رد کیا ہے اور مولانا غلام رسول مہر نے تو "جماعت مجاہدین" کا پہلا باب خاص اسی مبحث پر لکھا ہے اور "سید احمد شہید" کی پہلی جلد میں اس تحریک کے مقصد اور نصب العین پر بڑی مبسوط گفتگو کی ہے۔

---

[1] ہندوستان سے میری مراد غیر منقسم ہندوستان ہے۔ اس لیے ملک کا وہ حصہ جس کو آج پاکستان کہا جاتا ہے وہ بھی اس میں داخل ہے۔ یہ نکتہ آئندہ بھی ملحوظِ خاطر رہے۔ ۱۲

اہلحدیث کی مجاہدانہ خدمات کو چھپانے کی ناروا کوشش اور تاریخ پر ظلم:

ہندوستان کی سب سے خالص دینی اور اسلامی تحریک کی تاریخ کی بابت جس کا ماضی نہایت شاندار اور درخشاں ہے، مختلف قسم کی ریشہ دوانیاں برابر جاری ہیں۔ اس تحریک کی اصلی دعوت اور اس کے حق پرست داعیوں کے خلاف انگریز مورخوں کی غلط بیانیوں اور علماءِ اہلِ بدعت کی افتراء پردازیوں کا تو شکوہ نہیں کہ ان سے اس کے علاوہ کسی چیز کی توقع ہی کب تھی؟ لیکن اس وقت جذبات پر قابو رکھنا مشکل ہو جاتا ہے، جب ہم دیکھتے ہیں کہ حق و انصاف کے خون کی چھینٹیں ان کے دامن پر بھی ہیں جو آج ہندوستان میں تمام مسلمانوں کے، مذہبی، سیاسی اور تاریخی حقوق کے تحفظ کا دعویٰ رکھتے ہیں۔

جمعیۃ علماءِ ہند کے ایک بڑے عہدہ دار اور ممتاز رکن جناب مولانا سید محمد میاں نے "علماءِ ہند کا شاندار ماضی" لکھا ہے۔ اور تقریباً ایک ہزار صفحات میں پھیلا کر لکھا ہے۔ اس کا تیسرا حصہ "علماءِ حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے" کے عنوان سے معنون کیا گیا ہے۔ جس میں ۱۸۵۷ء کے بعد سے ۱۹۴۶ء تک کے علماءِ کرام کی خدمات اور ان کے سیاسی حالات کا تذکرہ ہے...... لیکن تنگ نظری اور عصبیت کا یہ حال ہے کہ تاریخ ہند کے اس طویل دور میں علماءِ دیوبند کی چند مخصوص شخصیتوں کے سوا ہمارے مولانا کی نگاہ میں نہ تو کوئی اہلحدیث عالم "عالم حق" تھا اور نہ اس کا کوئی کارنامہ مجاہدانہ کارنامہ۔ علمائے صادق پور کا جو حال ہے اس میں اس بات کی پوری احتیاط کی گئی ہے کہ کسی نوع سے ان کا اہلحدیث ہونا ظاہر نہ ہو سکے۔

یاد ہوگا کہ نومبر ۱۹۵۵ء میں نجد و حجاز کے والی جلالۃ الملک سعود بن عبدالعزیز

ہندوستان تشریف لائے تھے اور سترہ روز اس ملک میں قیام کیا تھا۔ اس اثناء میں مختلف مقامات کا دورہ کیا اور متعدد جماعتوں نے ان کی خدمت میں سپاسنامے پیش کیے۔ آل انڈیا اہلحدیث کانفرنس نے بھی ان کا استقبال کیا تھا اور دہلی کے لال قلعہ میں ان کی خدمت میں ایک مختصر سا سپاسنامہ بھی پیش کیا تھا۔ جمعیتہ علماءِ ہند نے جو سپاسنامہ پیش کیا تھا اس کی بابت "مدیر الجمعیتہ" نے ۳ دسمبر ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں لکھا ہے کہ اس "سپاسنامہ" میں نہ صرف اعلیٰ حضرت کا خیر مقدم ہی کیا گیا بلکہ ہندوستان، مسلمانانِ ہند اور جمعیتہ علماءِ ہند کی پوری تاریخ بھی پیش کر دی گئی۔" مگر یہ "پوری تاریخ" کیا ہے؟ وہی مولانا محمد میاں کی مذکورہ بالا کتاب "شاندار ماضی" کا پورا چربہ اور بس۔ بالفاظِ دیگر ہندوستان کی، مسلمانانِ ہند کی اور جمعیتہ علماءِ ہند کی وہ پوری تاریخ، میں جماعت اہلحدیث اور علماءِ اہلحدیث کا کوئی حصہ ہی نہیں۔ بتایئے یہ تاریخ کے ساتھ بے انصافی اور ظلم نہیں تو کیا ہے؟ حالانکہ جمعیتہ علماء کی تاسیس اور اس کی ترقی میں اکابر اہلحدیث کی خدمات کو بھی بہت کچھ دخل ہے جیساکہ ہم آگے بتائیں گے۔ یہاں یہ تاویل بھی نہیں کی جاسکتی کہ یہ جمعیتہ کے کسی فرد کی انفرادی حرکت ہے، کیونکہ یہ سپاسنامہ ادارہ کی طرف سے پیش کیا گیا تھا۔

دیوبندی ہی مکتب فکر کے ایک مشہور عالم مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی گزرے ہیں ان کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد یکم ستمبر ۱۹۵۶ء کے اخبار "نوائے پاکستان" لاہور میں ان کا ایک خط شائع کیا گیا تھا جو انھوں نے فروری ۱۹۵۳ء میں کسی صاحب کو تحریر فرمایا تھا۔ اس خط میں مولانا مرحوم نے سر سید احمد خاں، مرزا غلام احمد قادیانی، عنایت اللہ مشرقی سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریکوں کا ذکر کیا ہے۔ اسی کے ساتھ وہ اہلحدیث کو بھی گھسیٹ

لائے ہیں اور فرماتے ہیں :

ایک بات کہتے کہتے ڈر لگتا ہے مگر حقیقت حال کو چھپایا نہیں جا سکتا کہ اہلحدیث کے نام سے جو تحریک مدراس سے شروع ہوئی تھی اس کا مقصد بھی اس وہابی تحریک کو ختم کرنا تھا جس کو حضرت سید احمد شہید بریلویؒ اور حضرت اسماعیل شہیدؒ نے شروع کیا تھا، جس کا مقصد ہندوستان کو انگریزی اقتدار سے پاک کرنا تھا ..... " (الاعتصام ۶ ستمبر ۱۹۵۷ء)

جس زمانے میں یہ خط شائع ہوا تھا اسی زمانے میں اس کے متعدد جوابات "الاعتصام"، اور ماہنامہ "رحیق"، وغیرہ جماعتی پرچوں میں دیئے گئے تھے۔ اس محولہ بالا اشاعت میں ہی الاعتصام نے لکھا ہے :

" افسوس ہے مرحوم آج اس دنیا میں نہیں اور یہ خط اُن کی موت کے ایک عرصہ بعد شائع کیا گیا ہے ورنہ ہم اُن سے ادب کے ساتھ پوچھتے کہ اہلحدیث کی وہ کون تحریک تھی جو مدراس سے اٹھی تھی اور جس کا مقصد حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت مولانا اسماعیل شہیدؒ کی تحریک کو ختم کرنا تھا؟ یوپی میں اہلحدیث کی کثیر تعداد تھی، بہار اور بنگال میں بیشمار اہلحدیث تھے۔ دہلی اور پنجاب میں وسیع تعداد میں اہلحدیث تھے اور وہ سب کے سب انگریز کے مخالف تھے۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ حضراتِ شہیدین کی تحریک کی مخالفت نہیں کی، بلکہ ان کی حمایت میں ہمیشہ انگریزی اقتدار کے ساتھ ٹکراتے رہے۔ کالا پانی اِن سے آباد ہوا، پھانسیوں پر یہ لٹکے، سرحد پار انھوں نے انگریز کے خلاف دست بدست جنگ لڑی اور حضراتِ شہیدین کی تحریک جہاد کو

بہ پوری ہمت و جرأت سے جاری کیے رکھا۔ لیکن آج آپ فرماتے ہیں، یہ انگریز کے ساتھ تھے۔ فرمایا جائے کس دور میں انھوں نے انگریز کا ساتھ دیا؟ اور کب انھوں نے مدراس سے کوئی تحریک جاری کی۔؟"

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی عصرِ حاضر کے ایک ممتاز فاضل ہیں، کسی زمانے میں وہ اہلحدیث سے بہت قریب تھے، مگر اب وہ دیوبندیت سے کافی متاثر ہیں۔ ان کے اسی تاثر کا نتیجہ ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء قریب قریب دارالعلوم دیوبند کا ضمیمہ بن کر رہ گیا ہے۔ اب اس کے اساتذہ اور طلبہ میں ذہن و فکر کی وہ وسعت نہیں باقی رہی جو کبھی ندوہ کا امتیازی نشان تھا۔ فقہی اعتبار سے اب یہاں بھی عصبیت پیدا ہوتی جارہی ہے۔ اہلحدیث طلبہ کے ساتھ اساتذہ کا سلوک مشفقانہ اور ہمدردانہ نہیں ہے۔ اسی لیے اہلحدیث طلبہ وہاں انبساط اور انشراحِ قلب کے ساتھ نہیں رہتے۔ بلکہ ذہنی طور پر وہ اپنے اندر ایک قسم کی گھٹن اور اجنبیت محسوس کرتے ہیں۔ مولانا علی میاں کے ذہنی انقلاب کا ایک نمایاں اثر ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ وہ عام مجالس میں ہندوستان کے علماء کی دینی، اصلاحی، علمی، سیاسی خدمات کا جب تذکرہ کرتے ہیں تو علماءِ اہلحدیث کی خدمات کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ایک دور تھا کہ ہندوستان میں مذہبی مناظروں کی خوب دھوم تھی۔ عیسائیوں اور آریوں کے ساتھ بڑے اہم اور معرکے کے مناظرے ہوئے ہیں۔ جن کے متعلق بعض علمارِ احناف کی خدمات بھی بلاشبہ قابلِ قدر ہیں، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ علمائے اہلحدیث کی خدمات بھی اس سلسلے میں وزن رکھتی ہیں۔ بالخصوص مولانا ثناء اللہ امرتسری تو اس میدان کے شہسوار ثابت ہو چکے ہیں۔ زبانِ خلق نے آپ کو

"شیرِ پنجاب" کا لقب دیا۔ ایسے بھی موقعے آئے ہیں جہاں علمارِ دیوبند کی موجودگی میں مولانا امرتسریؒ ہی کو مناظر بنایا گیا اور مولانا نے بڑی کامیابی کے ساتھ ان مورچوں کو فتح کیا ہے، مگر حیرت ہے اور انتہائی حیرت ہے کہ مولانا علی میاں اس سلسلے میں مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی وغیرہ کا ذکر تو کرتے ہیں لیکن مولانا امرتسریؒ ان کو یاد نہیں آتے۔

ان کے ایک عربی مضمون کا ترجمہ قاضی محمد اسلم صاحب سیف فیروزپوری نے کیا جو "الاعتصام" لاہور کی متعدد اشاعتوں میں "برصغیر پاک و ہند میں اسلامی دعوت کے مختلف دور" کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس کی آخری قسط ۸ جنوری ۱۹۶۰ء کے "الاعتصام" میں شائع ہوئی ہے اس میں علی میاں نے ان تمام دینی تحریکوں اور دعوتوں کا ذکر فرمایا ہے جو گزشتہ سو سال یعنی ۱۸۵۷ء سے لے کر ہمارے اس زمانے تک برصغیر پاک و ہند میں اٹھیں اور ان سے عوام کو فائدہ پہنچا۔ اس میں مدارس اور اداروں کا ذکر بھی ہے اور افراد کے نام بھی ہیں۔ مگر داد دینی چاہیے علی میاں کی اس "احتیاط" کی کہ اس دور کی مختلف علمی اور سیاسی مساعی کے کسی حصہ میں بھی اہلحدیث کے کسی شخص یا ادارہ کا ذکر انھوں نے نہیں آنے دیا۔ "الاعتصام" نے اپنی ۱۵ جنوری ۱۹۶۰ء کی اشاعت میں اس کے خلاف احتجاجی اداریہ لکھا ہے۔ جس میں تفصیل سے اپنی شکایات علی میاں کی خدمت میں پیش کی ہیں اور اہلحدیث کی دینی، اصلاحی اور سیاسی خدمات کی طرف اشارات بھی کیے ہیں۔ ایک کتاب "ہندوستانی مسلمان" کے نام سے منظر عام پر آئی ہے۔ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ نے اس کو شائع کیا ہے۔ مختلف اخبارات و رسائل نے اس پر تبصرے لکھے ہیں۔ رسالہ "معارف" اعظم گڈھ کے تبصرہ نگار

مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی نے اس کی بابت لکھا ہے کہ: یہ کتاب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی چند عربی تقریروں کا مجموعہ ہے جسے محمود الحسن صاحب ندوی نے "اردو کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ اس کتاب میں گیارہ ابواب ہیں جنمیں ہندوستانی مسلمانوں کے علمی فکری اور تمدنی اثرات اور کارناموں کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔"

معارف نے اس کی بابت اپنی رائے بھی لکھی ہے اور آخر میں بتایا ہے کہ کتاب میں بعض ضروری باتیں چھوٹ گئی ہیں۔ چھوٹی ہوئی باتوں کی نشاندہی کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے:

"دینی و علمی مراکز کے تذکرہ میں انجمن ترقی اردو اور جماعت اہلحدیث اور ان کے اداروں کا ذکر نہ کرنا تعجب خیز معلوم ہوا۔ حالانکہ سید صاحب کے بعد اس تحریک کو واقعی اسی جماعت کے افراد نے زندہ رکھا ....."

(معارف بابت ماہ دسمبر ۱۹۷۱ء)

اس شکوے کے ساتھ ہمیں یہ اعتراف بھی کرنا چاہیے کہ محترم مولانا علی میاں اہلحدیث کے ساتھ یہ بے اعتنائی صرف عام مجالس ہی میں روا رکھتے ہیں۔ اہلحدیث کی مجلسوں اور اداروں میں جب کبھی وہ تشریف لے جاتے ہیں تو وہاں کھل کر اہلحدیث کے بزرگوں کی اصلاحی، تبلیغی اور سیاسی خدمات کا اعتراف اور اعلان کرتے ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ وہ بنارس کئی دفعہ تشریف لائے اور مدنپورہ کی جامع مسجد اہلحدیث میں ان کی تقریر ہوئی تو انھوں نے علماء صادق پور، مولانا عبداللہ الغزنوی، مولانا عبدالجبار الغزنوی، مولانا حافظ عبداللہ صاحب غازیپوری وغیرہ کے متعلق بڑی اثر انگیز تقریر کی۔ یہی بات مدیر "الاعتصام" نے بھی لکھی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

"غالباً دسمبر ۱۹۵۶ء کی بات ہے کہ مولانا ابوالحسن لاہور تشریف لائے

تو طلبہ جامعہ سلفیہ کی طرف سے دار العلوم تقویۃ الاسلام میں ان کے اعزاز میں عصرانہ دیا گیا تھا، جس میں جماعت کے متعدد ارکان اور شہر کے معززین شریک ہوئے تھے۔ مولانا کی خدمت میں ایک سپاسنامہ بھی پیش کیا گیا تھا، جس میں ان کی خدمات کا ذکر تھا۔ اس سپاسنامہ کے جواب میں مولانا نے جو تقریر ارشاد فرمائی تھی، اس میں پوری وضاحت سے اہلحدیث کی دینی خدمات کا تذکرہ فرمایا تھا اور خاندانِ غزنویہ، لکھویہ اور دیگر معروف اہلِ علم کی صاف الفاظ میں تحسین کی تھی اور کہا تھا کہ ان کا قلبی رجحان اور طبعی میلان اہلحدیث کی طرف ہے .....

(الاعتصام ۱۵ر جنوری ۱۹۶۰ء)

دار العلوم احمدیہ سلفیہ دربھنگہ (بہار) اہلحدیث کی مشہور درس گاہ اور ممتاز دینی تعلیمی ادارہ ہے۔ ۳۰ر جون ۱۹۶۱ء کو مولانا موصوف وہاں بھی تشریف لے گئے تھے، اس کی رپورٹ ۱۶ر جولائی ۱۹۶۱ء کے اخبار "الہدیٰ" میں شائع ہوئی ہے۔ ارکین دار العلوم کی طرف سے وہاں بھی مولانا کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا گیا تھا اس کے جواب میں مولانا نے جو تقریر کی تھی اس کا خلاصہ محولہ بالا "الہدیٰ" میں موجود ہے، اس کو ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں۔ حمد و نعت کے بعد موصوف نے فرمایا:

"ہندوستان میں تحریک اہلحدیث جن بنیادوں پر قائم ہوئی وہ بنیادیں چار تھیں۔ عقیدۂ توحید، اتباعِ سنت، جذبۂ جہاد اور انابت الی اللہ۔ جس کی تفصیل آیت هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ (الآیہ) میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ..... جماعت اہلحدیث انھیں چار چیزوں کا مجموعہ تھی۔ دوسرے

لوگوں میں دیکھیے کہ اگر توحید ہے تو اتباعِ سنت میں کوتاہی ہے۔ اگر اتباعِ سنت کا جذبہ ہے تو جذبۂ جہاد مفقود ہے۔ اگر کہیں ذکر و فکر ہے تو اتباعِ سنت نہیں ہے۔ غرضیکہ لوگوں نے خاص خاص چیزوں کو لے کر انھی کو عمل کا دار و مدار بنالیا ہے۔ بخلاف اس کے جماعت اہلحدیث میں چاروں خصوصیتوں کا اجتماع ہو کر شہیدین کی صورت میں نمودار ہوا اور جس جماعت نے ان چاروں کا مظاہرہ بیک وقت کیا وہ جماعتِ صادقپور ہے۔ جن کا خلوص اور جن کا تعلق مع اللہ ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے۔"

"واقعہ یہ ہے کہ ان چاروں خصوصیتوں کی جامعیت کے بغیر کوئی بڑا کام نہیں ہو سکتا اور بڑی سے بڑی تحریکیں ان کے بغیر کسی طرح کے ٹھوس نتائج پیدا نہیں کر سکتیں۔ جو ان سے ہوا، طبیعتوں کو بدلنا، رسموں کو پھیر دینا اور قلوب کو حرارتِ ایمانی سے بھر دینا، نہ تو اعلانات سے ہوتا ہے اور نہ کسی دوسری چیز سے۔ یہ اسی جامعیت سے ہوتا ہے، جس کے متعلق کہا گیا ہے: ھم باللیل رھبان و بالنھار فرسان۔ لوگوں میں جب تک یہ جھلک نظر نہ آئے کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"سید صاحب کی جماعت کے اندر دعوت و عزیمت کا خاص وہی اہتمام تھا جو کئی سو سال پہلے کے مسلمانوں کا امتیاز تھا۔ اصحابِ صادقپور کے حالات پڑھیے جو واقعات "الدر المنثور" میں لکھے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے یہ لوگ جیسے بڑے اہلِ قلوب سے کسی طرح کم نہ تھے۔ مولانا نے بعض بزرگوں (مولانا یحییٰ علی صادق پوری) کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ انھیں قید و بند کی زندگی بھی گزارنی پڑی۔ وہ قید خانوں میں بند رکھے جاتے تھے۔ لیکن وہ وہاں اس طرح رہتے تھے کہ پہرہ کے لیے جو پہریدار مقرر ہوتے جب ان کے

تبادلہ کا وقت آتا تو وہ روتے ہوئے رخصت ہوتے تھے۔ ایک روز ارباب متفرقون خیر ام اللہ الواحد القہار کے عنوان پر ایسی پُراثر تقریر فرمائی کہ اپنی ڈیوٹی ختم کر کے کسی طرح پہرہ دار جانے پر راضی نہ ہوتا تھا۔ جب رخصت ہوا تو بے اختیار رو رہا تھا۔ جیل خانہ میں دوسرے قیدیوں کے اندر بھی ان لوگوں نے دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دیا۔"

"ایک بلوچ تھا جو بڑا سرکش اور شریر تھا۔ اتفاق سے اس کا بستر مولانا کے بستر کے قریب پڑ گیا، معلوم نہیں ایک رات اس پر کیا اثر ڈالا کہ بے اختیار روتا جاتا تھا۔ سید صاحب کے حالات پڑھیے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس پر ان کا سایہ پڑ گیا وہ سدھر گیا، یہ حضرات اتباع سنت کے حامل تھے۔ علاوہ ازیں ایک رنگ مولانا ولایت علی کا تھا اور ایک رنگ مولانا کرامت علی کا تھا۔ مگر دعوت و عزیمت میں سب لوگ متفق تھے اور اندر سے سب کے قلوب منصبغ بصبغۃ اللہ تھے۔"

"یہ ایک بڑا سانحہ ہے کہ اب کچھ کمزوریاں پیدا ہو گئی ہیں اور جو مجموعہ تیار ہوا تھا وہ باقی نہیں ہے۔ کسی نے عقیدۂ توحید کو لے لیا تو کسی نے اعلاء کلمۃ اللہ کو اگر کہیں نعرۂ جہاد ہے تو سنت کی جزئیات کا تتبع نہیں۔ اب کسی میں پہلے جیسا کامل نمونہ نظر آئے، ایسا بہت کم ہے۔"

"ہر جماعت اپنے آئیڈیل پر زندہ رہتی ہے۔ آپ کو بھی خود کو نمونہ بنانا چاہیے۔ آپ نے یہ مثل تو سنی ہوگی کہ ایک من علم کے لیے دس من عقل کی ضرورت ہے۔ یہ اپنی جگہ بالکل صحیح ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو طبیعتوں میں توازن قائم نہیں رہتا۔ اور جب کوئی اقدام کیا جائے تو کمزوری آجاتی ہے۔ چنانچہ حضرت سید شہید رحمۃ اللہ علیہ کی جماعت میں جو توازن

قائم ہوا اگر اس طرح کا توازن نہ ہو تو تعلق مع اللہ کی کیفیت وہ نہیں ہوتی جو ہونی چاہیے۔ جس طرح کوئی شخص روزمرہ کی غذا کھائے تو قوتِ ہاضمہ کا جائزہ لینے کی ضرورت نہیں ہے لیکن اگر وہ معمول کے خلاف کوئی اعلیٰ قسم کا میوہ کھائے تو پہلے اسے اپنی قوتِ ہاضمہ کا جائزہ لینا چاہیے کہ یہ غذا ہضم بھی ہوتی ہے یا نہیں۔"

"سید شہیدؒ کی جماعت نے ہندوستان میں اسلام کی بقا و استحکام کے لیے جو بیڑہ اٹھایا اس میں ضرورت تھی حافظ عبداللہ صاحب غازیپوری اور مولانا عبدالعزیز صاحب محدث رحیم آبادی جیسے لوگوں کی، کہ انھوں نے نماز کے جملہ احکام و مسائل کو قرآن و سنّت سے براہِ راست اخذ کیا۔ رفع یدین کا بھی التزام کیا اور تہجد کا بھی۔ اگر آج ہم رفع یدین کا اہتمام کرتے ہیں تو تہجد کا اہتمام کیوں نہیں کرتے، رفع یدین تو ایسی چیز ہے جسے ہر شخص دیکھ سکتا ہے، لیکن ان کی تہجد گزاری اور احیائے لیل ایسی چیز ہے جسے کسی نے نہیں دیکھا، پس اس طرح کا توازن جب تک نہیں ہوگا کوئی کام نہیں ہوسکتا۔، تہجد پر اتنی بڑی بڑی بخشش ہوتی ہیں مگر نہ یہ آٹھ رکعت والے پڑھتے ہیں اور نہ تیرہ رکعت والے۔ جب پڑھنے کا وقت آتا ہے تو سب آرام سے سوتے رہتے ہیں۔ یہ عدم توازن صرف یہیں نہیں ہے بلکہ تمام جماعتوں میں ہے۔ میں یہاں انھی باتوں کو کہوں گا جو یہاں کی مناسبت سے ہوں۔ رفع یدین کی بحث میں تو اختلاف ہوسکتا ہے، جن کے یہاں ثابت ہے ثابت ہے۔ جن کے یہاں یہ ثابت نہیں، ان کے یہاں اس کا نسخ ثابت ہے لیکن لولا ان اشقّ علی اُمّتی لامرتھم بالسواک میں تو کوئی اختلاف

نہیں کرتا۔

مولانا شیروانی کی زبان سے ایک واقعہ سنا ہے کہ مولانا عبدالجبار صاحب غزنوی علی الحیاۃ تھے، روزانہ قرآن کا درس دیتے تھے۔ مولانا شبلی نعمانی ان کی زندگی میں ایک مرتبہ امرتسر تشریف لے گئے۔ مولانا شبلی اگرچہ علوم و فنون میں درک رکھتے تھے مگر ان چیزوں سے انھیں زیادہ شغف نہیں تھا۔ جب مولانا غزنوی کے درس سے واپس آئے تو کہنے لگے کہ یہ شخص جب اللہ کہتا تھا تو دل چاہتا تھا کہ سر اس کے قدموں پہ رکھ دوں۔ یہ تھا ان لوگوں کے تعلق مع اللہ کا حال۔"

"ایک دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک صاحب کے یہاں کچھ مہمان آئے تھے، مہمان بیٹھے ہوئے تھے، بیچ میں پارٹیشن تھی۔ وہ صاحب پوچھنے لگے کہ فلاں کے بعد کون بیٹھا ہوا تھا؟ جواب ملا کہ فلاں تھا، انھوں نے پوچھا کہ اس کے بعد؟ جواب ملا کہ فلاں تھا۔ علی ہٰذا القیاس انھوں نے دریافت کیا کہ اخیر میں کون تھا؟ تو معلوم ہوا کہ مولانا عبدالجبار صاحب تھے۔ وہ کہنے لگے کہ اسی لیے دل بے اختیار ادھر کھنچا جا رہا تھا۔"

"مسلمانوں میں کفِ لسانی وغیرہ کا جو توازن پہلے تھا اب باقی نہیں ہے۔ کم از کم اسے معیار کے طور پر ہمیں اپنانا ہے۔ اس بارے میں تو بہت وسیع القلبی کی ضرورت ہے۔ آپ کو سوچنا چاہیے کہ اگر نماز رہ گئی تو جو شخص جس طرح چاہے گا نماز پڑھے گا۔ لیکن اگر اسلام اور ایمان ہی باقی نہ رہا تو نماز کہاں رہ سکتی ہے اور اس کے اندر یہ اختلافات کہاں جائیں گے۔ اسی لیے اس وقت سب سے بڑی ضرورت

اس کی ہے کہ اسلام اور ایمان باقی رہے۔"

اپنا شکوہ:

سچ پوچھیے تو دوسروں کی بے انصافیوں کا شکوہ کرنے کا ہم کو حق بھی نہیں ہے۔ جبکہ خود ہم نے اپنے آپ کو بھلا رکھا ہے۔ یہ ہمارا کام تھا کہ ہم اپنے اسلاف کے تذکار کو باقی رکھتے اور ان کی صحیح تاریخ سے دنیا کو روشناس کراتے۔ تاکہ ایک طرف اگر دشمنوں کی پیدا کردہ غلط فہمیوں کا ازالہ ہوتا تو دوسری طرف اپنے نوجوانوں کے "داغہائے سینہ" کو بھی تازہ رکھا جاتا، جیسا کہ کسی نے کہا ہے۔

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را

لیکن ہم اپنی بے شعوری کا ماتم کریں یا اپنی بدقسمتی کا رونا روئیں کہ ہمیں آج تک بھی اس کی ضرورت کا احساس نہیں ہو رہا ہے۔ ابھی حال کی بات ہے کہ میں نے حضرت مولانا حکیم عبدالخبیر صاحب صادقپوری (پٹنہ) کو ایک خط لکھا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اس خط کو یہاں نقل کر دوں میں نے لکھا تھا۔۔

" مولانا المکرم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بڑی دلسوزی کے ساتھ آپ کی خدمت میں ایک درخواست پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں، امید ہے آپ اس کی اہمیت محسوس فرمائیں گے اور اس کو شرف قبولیت بخشیں گے، آپ سے زیادہ

اس حقیقت کو کون جان سکتا ہے کہ حادثۂ بالاکوٹ کے بعد اس مقدس دینی اور انقلابی تحریک کی قیادت کا بار آپ ہی کے بزرگوں نے اپنے کندھوں پر اٹھا لیا تھا اور اس میں شبہ نہیں کہ ان مردانِ باخدا نے پوری دیانت داری کے ساتھ اس کا حق ادا کر دیا۔ یہ بھی آپ سے مخفی نہیں ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد یہ تحریک حالات کے دباؤ کی وجہ سے ظاہری سطح پر باقی نہیں رہی تھی۔ لیکن اندرونی طور پر کبھی بھی ختم نہیں ہوئی۔ مولانا عبد العزیز صاحب رحیم آبادی اور ان کے جانباز رفقاء کے سینوں میں اس کے شرارے باقی رہے۔ دہلی، یوپی، بہار اور بنگال وغیرہ کے اہلحدیثوں نے اس کے لیے جانی اور مالی ہر طرح کی بڑی بڑی قربانیاں دیں۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ایک مدت تک اس تحریک کی سربراہی آپ بھی فرماتے رہے۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد اب اس تحریک کا تعلق سرحد پار کے لوگوں سے باقی نہیں رہا ہے، لیکن افسوس کی بات ہے کہ جنگِ آزادی کی تاریخ میں اس تحریک کے پچھلے قریبی دور کا کہیں کوئی ذکر نہیں آتا، بلکہ اس کے برخلاف ہم کو طعنہ دیا جا رہا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے زمانے سے لے کر آج تک اہلحدیث کے علماء و مشائخ نے انگریز کے خلاف سیاست میں کبھی کوئی حصہ نہیں لیا اور عملی جہاد سے بالکل الگ رہے۔ اس پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر خود ہمارے نوجوان بھی اپنے اسلاف سے بدظن ہو رہے ہیں اور

احساس کمتری کا شکار ہوتے جا رہے ہیں۔ اب جبکہ ملک آزاد ہو چکا ہے، کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنے بزرگوں کے ان کارناموں کو منظر عام پر نہ لے آئیں جو انگریز کی مخالفت میں انھوں نے انجام دیے تھے۔

پس جناب والا کی خدمت میں میری پر زور درخواست ہے کہ کم از کم مولانا رحیم آبادی اور اپنی قیادت کے دور کی تاریخ اس طرح مرتب کرنے کا کوئی انتظام فرمائیں جس کے مطالعہ سے ہم کو معلوم ہو جائے کہ یہ تحریک اپنے پچھلے قریبی دور میں کن مراحل سے گزری اور کن کن افراد اور مقامات نے اس میں حصہ لیا؟۔ اہلحدیث کے علاوہ دوسرے مکتب فکر کے مسلمانوں نے اس کام سے کس حد تک دلچسپی لی؟ اگر آپ کی موجودگی اور نگرانی میں یہ اہم تاریخ مرتب ہو جائے تو مسلمانوں بالخصوص اہلحدیث کے حق میں مفید ثابت ہوگی اور آپ کے باقیات صالحات میں اس کا شمار ہوگا۔

والسلام

خاکسار نذیر احمد رحمانی

بنارس ۱۹ دسمبر ۱۹۶۲ء

یہ خط مولانا کی خدمت میں بذریعہ ڈاک بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد یکم فروری ۱۹۶۳ء کے اخبار اہلحدیث دہلی میں شائع بھی کر دیا گیا اخبار میں شائع کرنے سے میرا مقصد یہ تھا کہ جماعت کے عام افراد کے علاوہ مولانا کے حلقۂ ارادت کو خاص طور پر اس کی اطلاع ہو جائے لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ نہ مولانا نے میری

اس درخواست کو قابلِ اعتبار سمجھا اور نہ ان کے ارادتمندوں میں سے کسی صاحب نے اس کی طرف کوئی توجہ مبذول کی۔ حالانکہ بنگال اور بہار میں خراسانی تحریک کے نام سے جو نظام قائم ہے اور اس نظام کے تحت انگریزی حکومت کے زمانے میں عشر اور زکوٰۃ کی جو بیشمار رقمیں وصول کی گئیں ان کی بابت عوام سے یہی کہا گیا کہ یہ ساری رقمیں سرحد پار "مجاہدین" کو بھیجی جارہی ہیں۔ "مجاہدین" ہی کی خدمت کا جذبہ تھا، جس کی بنا پر اہلحدیث اس نظام سے وابستہ رہے۔ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مرحوم ہندوستان کی تحریک اہلحدیث کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس تحریک کی ہمہ گیر تاثیر یہ بھی تھی کہ وہ "جہاد"، جس کی آگ اسلام کے مجمر میں ٹھنڈی پڑگئی تھی وہ پھر بھڑک اٹھی۔ یہاں تک کہ ایک زمانہ گذرا کہ وہابی اور باغی مترادف لفظ سمجھے گئے اور کتنوں کے سر قلم ہو گئے، کتنوں کو سولیوں پر لٹکنا پڑا۔ اور کتنے پابجولاں دریائے شور عبور کردیے گئے یا تنگ کوٹھریوں میں الگ بند ہونا پڑا اور اب پردہ کیسا؟ صاف کہنا ہے کہ مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی کی زندگی تک تحریک کے علمبرداروں میں یہ روح کام کر رہی تھی۔ افسوس!
"کز قبیلۂ مجنوں کسے نماند" (مقدمہ تراجم علمائے حدیث ہند)

مولانا رحیم آبادی کی زندگی تک جو "روح" کام کر رہی تھی اسی "روح" کو باقی رکھنے کے لیے مدت اور سرداری کا نظام چلایا گیا اور اسی کا نام "خراسانی تحریک" رکھا گیا۔ اسی "خراسانی تحریک" کے سلسلے کے امیر ہیں مولانا حکیم عبدالخبیر صاحب صادقپوری۔ اسی لیے میرے نزدیک اس نظام کی تاریخ مرتب کرنے کی ذمہ داری سب سے زیادہ اسی

پارٹی پر عائد ہوتی ہے۔ اسی احساس کی بنا پر میں نے مولانا موصوف کو مذکورہ بالا خط لکھا تھا۔

مولانا رحیم آبادی کی وفات کے بعد جو لوگ اس تحریک کے علمبردار بنے ہیں میں ان سے کہنا چاہتا ہوں کہ اگر سید صاحب کا یہ اظہار افسوس کہ "از قبیلۂ مجنون کسے نماند" (مجنوں کے قبیلے کا اب کوئی باقی نہیں رہا) آپ کے نزدیک صحیح نہیں ہے اور آپ در حقیقت "قبیلۂ مجنوں" سے تعلق رکھتے ہیں تو اس کے جواب میں خاموش کیوں ہیں؟ انگریز کے زمانے میں خاموش رہ جانے کی مصلحت تو خیر کچھ سمجھ میں آسکتی ہے مگر ہندوستان کے آزاد ہو جانے کے بعد خاموش رہنے کے تو کوئی معنی نہیں ہیں۔ اب تو ملت اور جماعت کی خیر خواہی اسی میں ہے کہ اپنی انقلابی کوششوں اور سیاسی کارگزاریوں کی ایک ایک بات منظر عام پر لائی جائے۔ بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ معاندین الٹا پروپیگنڈہ کر کے ہمیں بدنام کر رہے ہیں اور ہمارے اکابر کے وقار کو گرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ●●●

ہندوستان میں تحریکِ اہلحدیث

اس تحریک کی عمارت اصول کے لحاظ سے ٹھیک انھی بنیادوں پر قائم ہے جن پر خود اسلام کی بنیاد کھڑی ہے، اس لیے اس کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی خود اسلام کی۔ لیکن میرا موضوع محدود ہے، مجھے صرف ہندوستان[1] کی تحریکِ اہلحدیث پر (اور وہ بھی سیاسی خدمات کے نقطۂ نظر سے) ایک سرسری نگاہ ڈالنی ہے۔ اس لیے اس کی عمومی تاریخ سے قطع نظر کرتے ہوئے میں اپنے موضوع کے حدود میں رہ کر ہی گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔

تحریک کا اجمالی تعارف:

تحریک اہلحدیث اور اس کی دعوت کے تعارف اور اس کے اثرات اور کارناموں کے متعلق ہم اپنی طرف سے کچھ کہنے کی بجائے ہندوستان کے

---

[1] ہندوستان سے میری مراد غیر منقسم ہندوستان ہے اس لیے ملک کا وہ حصہ جو آج پاکستان کے نام سے موسوم ہے وہ بھی اس میں داخل ہے۔ ۱۲۔ منہ

ایک ایسے عالم کی تحریروں کے کچھ اقتباسات پیش کر دینا مناسب سمجھتے ہیں جن کی علمی جلالت اور تاریخی بصیرت کا لوہا دنیا مان چکی ہے۔ وہ ہیں مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مرحوم۔ سید صاحب لکھتے ہیں:

"ہندوستان پر اللہ تعالیٰ کی بڑی رحمت ہوئی کہ عین تنزلی اور سقوط کے آغاز میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے وجود نے مسلمانوں کی اصلاح و دعوت کا ایک نیا نظام مرتب کر دیا تھا اور وہ "رجوع الیٰ دین السلف الصالح" ہے، اسی تحریک نے ہندوستان میں فروغ حاصل کیا۔ اور گو سیاسی حیثیت سے وہ ناکام رہا، تاہم نظری و مذہبی و علمی حیثیت سے اس کی جڑیں مضبوط بنیادوں پر قائم رہیں جن کو ہندوستان کا سیاسی انقلاب بھی اپنی جگہ سے ہلا نہ سکا ....

اس تحریک کا اولین اصول یہ تھا کہ اسلام کو بدعات سے پاک کر کے علم و عمل میں سلف صالحین کی راہ پر چلنے کی دعوت مسلمانوں کو دی جائے اور مسائل فقہیہ میں فقہائے محدثین کے طرز کو اختیار کیا جائے۔[1]

---

[1] یہاں سید صاحب ہی کی طرف سے ایک حاشیہ ہے جس میں وہ فرماتے ہیں "لوگوں نے اس کو بھی مختلف فیہ مسئلہ بنا رکھا ہے کہ وہ فقہ میں کیا تھے؟ حضرت شاہ صاحب نے اپنے سوانح حیات "الجزء اللطیف" کے آخر میں اسے خود ہی بتا دیا ہے کہ وہ کیا تھے، فرماتے ہیں "وبعد ملاحظہ کتب مذاہب اربعہ و اصول فقہ ایشان و احادیثے کہ متمسک ایشاں است قرار داد خاطر بمدد نور غیبی روش فقہائے محدثین افتاد۔" (یعنی مذاہب اربعہ کی فقہ اور ان کی اصول فقہ کی کتابوں اور ان احادیث کے غائر مطالعہ کے بعد جن سے وہ حضرات اپنے مسائل میں استناد فرماتے ہیں نور غیبی کی مدد سے فقہائے محدثین کا طریقہ دلنشیں ہوا۔)

اسی زمانے میں یمن اور نجد میں اس تحریک کی تجدید کا خیال پیدا ہوا جس کو ساتویں صدی کے آخر اور آٹھویں کے شروع میں علامہ ابن تیمیہؒ اور ابن قیم نے مصر و شام میں شروع کیا تھا۔ اور جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو ائمہ مجتہدین کی منجمد تقلید اور بے دلیل پیروی سے آزاد کر کے عقائد و اعمال میں اصل کتاب و سنت کی اتباع کی دعوت دی جائے۔ مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کے عہد میں یہ تحریک ہندوستان تک بھی پہنچی اور خالص ولی اللہی تحریک کے ساتھ آکر منضم ہوگئی۔" اسی کا نام ہندوستان میں اہلحدیث ہے۔" (مقدمہ سندھی افکار پر ایک نظر)

سید صاحب کے اس بیان کے مندرجہ ذیل چند فوائد خاص طور سے قابلِ توجہ ہیں:

(الف) ہندوستان میں جس دینی تحریک اور دعوت و مسلک کا نام اہلحدیث ہے وہ خالص ولی اللہی تحریک ہے۔ بالفاظ دیگر ہندوستان میں اس تحریک کے داعیِ اول حضرت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ ہیں۔

(ب) اس تحریک کا اولین اصول اور بنیادی مقصد یہ ہے کہ اسلام کو بدعات سے پاک کیا جائے اور مسلمانوں کو منجمد تقلید اور ائمہ مجتہدین کی بے دلیل پیروی سے آزاد کر کے عقائد و اعمال میں اصل کتاب و سنت کی اتباع کی دعوت دی جائے۔

(ج) اس تحریک کو فروغ اور عروج مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کے عہد میں حاصل ہوا۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی علیہ الرحمۃ کی پیدائش ۱۱۱۴ھ/۱۷۰۳ء اور وفات ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۵ء میں ہوئی۔ اس لحاظ سے آپ کی ولادت ہندوستان کے مشہور دیندار

بادشاہ اورنگ زیب عالمگیرؒ کی وفات سے چار سال پہلے ہوئی۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اب تک ہندوستان کتاب و سنت کی روشنی سے یکسر محروم تھا، تاہم یہ ضرور ہے کہ تقلید جامد کے بندھنوں سے آزاد ہو کر فقہائے محدثین کے طریق پر براہِ راست کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو متمسک قرار دینا، اس ذہن و فکر کی بنیاد حضرت شاہ صاحب ہی نے ڈالی ہے۔ اسی لیے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ ہندوستان میں مسلک اہلحدیث اور تحریک اہلحدیث کے سب سے پہلے موسس اور داعی حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی علیہ الرحمۃ ہی ہیں۔ شاہ صاحب موصوف نے اپنی تصانیف میں تقلید اور عمل بالحدیث کے مسلک کو خوب نکھارا ہے بالخصوص حجۃ اللہ البالغہ میں تو حجت ہی تمام کر دی۔ اسی لیے بقول مولانا عبید اللہ سندھی حضرت شاہ اسمٰعیل شہید نے یہ کتاب اپنے چچا شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمۃ سے پڑھی تو اس کا عملی نمونہ بن کر میدان میں آ گئے۔ مولانا سندھی فرماتے ہیں:

"جب مولانا محمد اسمٰعیل شہید نے حجۃ اللہ امام عبدالعزیز سے پڑھی تو اپنے جد امجد کے طریقہ پر عمل شروع کر دیا۔ انھوں نے اپنی ایک خاص جماعت بھی تیار کی جو حجۃ اللہ البالغہ پر عمل کرے۔ یہ لوگ شافعیہ کی طرح رفع یدین اور آمین بالجہر کرتے تھے جیسا کہ سنن میں مروی ہے۔ اس سے دہلی کے عوام میں شورش پھیلتی رہی مگر حزب ولی اللہ کا کوئی عالم مولانا اسمٰعیل شہید اور ان کی جماعت پر معترض نہ ہو سکتا تھا۔ (شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک طبع ثانی ص ۱۰۵)

یہ ان کی شہادت ہے جو مولانا اسمٰعیل شہید کی "خاص جماعت" اہلحدیث

سے سخت ناراض ہیں اس لیے کہنا چاہیے کہ یہ الفضل ما شہدت بہ الاعداء کی مصداق ہے۔

شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ کی تحریروں سے تقلید جامد پر انکار اور کتاب و سنت کے ساتھ براہِ راست تمسک کی تاکید کے متعلق بکثرت اقتباسات پیش کیے جا سکتے ہیں لیکن اختصار کے خیال سے یہاں صرف ایک عبارت نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

"ورب انسان منکم یبلغه حدیث من احادیث نبیکم فلا یعمل به ویقول انما عملی علی مذهب فلان لا علی الحدیث ثم احتال بان فهم الحدیث والقضاء به من شان الکمل المهرة وان الائمة لم یکونوا ممن یخفی علیهم هذا الحدیث فما ترکوه الا لوجه ظهر لهم فی الدین من نسخ او مرجوحیة، اعلموا انه لیس من الدین فی شیٔ، ان آمنتم بنبیکم فاتبعوه خالف مذهبا او وافقه کان مرضی الحق ان تشتغلوا بکتاب الله وسنة رسوله ابتداءً فان سهل علیکم الاخذ بهما فبها ونعمت ان قصرت افهامکم فاستعینوا برای من مضی من العلماء ماترون احق واصرح واوفق بالسنة انتهی۔ (تفہیمات الٰہیہ ص ۲۱۲ جلد اول)

(ترجمہ) تم میں بہت سے ایسے آدمی ہیں جن کے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم

کی حدیثوں میں سے کوئی حدیث پہنچتی ہے لیکن وہ اس پر عمل نہیں کرتے بلکہ یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہمارا عمل فلاں (امام) کے مذہب پر ہے حدیث پر نہیں ہے۔ اس کے لیے وہ حیلہ بیان کرتے ہیں کہ حدیثوں کا سمجھنا اور ان کے مطابق فیصلہ کرنا ماہرین اور باکمال (اماموں) کا کام ہے ہمارے امام ایسے نہ تھے جن کو یہ حدیثیں نہ معلوم رہی ہوں۔ اس لیے جب (جان بوجھ کر) انھوں نے اس حدیث کو چھوڑ دیا ہے تو ضرور اس کی کوئی وجہ ہے۔ یا تو حدیث منسوخ ہے یا مرجوح ہے۔ (شاہ صاحب اس حیلہ کے جواب میں فرماتے ہیں) خوب جان لو کہ (تمھارے) اس (حیلہ) کا دین سے کچھ بھی لگاؤ نہیں ہے۔ اگر تم اپنے نبی علیہ السلام پر ایمان لائے ہو تو ہر حال میں ان کی اتباع کرو۔ خواہ ان کی بات کسی امام کے مذہب کے موافق ہو یا مخالف۔ (یہ بھی جان لو کہ) اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ بات یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے نبی علیہ السلام کی سنت کے ساتھ سب سے پہلے مشغولیت اختیار کرو۔ اگر قرآن اور حدیث کو خود سمجھ لو تو اس سے بہتر کیا ہے اور اگر تمھاری سمجھ اس سے قاصر ہو تو گزشتہ علماء کی رایوں سے مدد لو ان میں سے جس کی بات کو حق پاؤ اور سنت کے موافق دیکھو اس کو لے لو۔"

اس اقتباس میں شاہ صاحب نے کتاب و سنت کے ساتھ جس طرح کا اشتغال اختیار کرنے کو اللہ تعالیٰ کی "پسندیدہ بات" قرار دیا ہے اور قرآن و حدیث کے ساتھ جس طریقِ عمل کو اختیار کرنے کی مسلمانوں کو دعوت دی ہے۔ اللہ

تعالیٰ کا شکر ہے کہ اہلحدیث ٹھیک اسی بات کے قائل ہیں اور اسی کو اپنا مسلک جانتے ہیں اور دوسروں کو بھی اسی کی دعوت دیتے ہیں۔ اس لیے بلاشبہ شاہ صاحب اہلحدیث مسلک کے داعی، موسس اور مستدل تھے۔

مولانا اسماعیل شہیدؒ اور تحریک اہلحدیث کی قیادت:

شاہ ولی اللہؒ کی تعلیمات کا ان کے بعد ان کے سعادت مند پوتے حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ پر ایسا گہرا رنگ چڑھا کہ ہزاروں مخالفتوں کے باوجود وہ دن بدن شوخ ہی ہوتا گیا۔ سید احمد شہید علیہ الرحمہ کے ہاتھ پر امارت اور جہاد کی بیعت کر چکے ہیں، اس کے باوجود اپنے مسلک پر پختگی کے ساتھ قائم ہیں۔ سید شہید فقہی فروعات میں عملاً حنفی ہی تھے مگر شاہ شہید کی دعوت سے اتنے متاثر ہوئے کہ ان کی جماعت (اہلحدیث) کے سرپرست بن گئے۔ ایک انگریز (سر جیمس اوکنلی) کا بیان ہے:

> سید احمد بریلوی کی جماعت دو مختلف اور متضاد گروہوں سے مرکب تھی جنھیں متحد رکھنے میں وہ مدت العمر ساعی رہے۔ ان میں سے ایک گروہ کے سردار مولوی عبدالحیؒ اور مولوی کرامت علی جونپوری تھے۔ جو اہلسنت کا طریقہ رکھتے تھے اور دوسرے گروہ کے سردار مولوی اسمٰعیل تھے جو چاروں اماموں کی تقلید سے آزاد تھے اور براہِ راست حدیث کو اپنا ماخذ قرار دیتے تھے۔ خود سید صاحب عمل کے اعتبار سے حنفی تھے مگر اسی کے ساتھ مولوی اسمٰعیل کی جماعت کی سرپرستی کرتے تھے جو اپنے کو "محمدی" کہتے تھے۔ (روشن مستقبل ص ۸۷)

مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے بیان کا ایک اقتباس اوپر نقل ہو چکا ہے جس میں انھوں نے صاف صاف تسلیم کیا ہے کہ مولانا شہید نے ایک خاص جماعت تیار کی تھی جو حجۃ اللہ البالغہ پر عمل کرے۔ یہ لوگ شافعیہ کی طرح رفع یدین اور آمین بالجہر کرتے تھے۔"

یہی بات مولانا سندھی نے ایک دوسرے مقام پر بھی لکھی ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

"مولانا شہیدؒ نے حجۃ اللہ پڑھنے کے بعد اس پر عمل کرنے والی ایک جماعت بنائی تھی، یہ لوگ رفع یدین اور آمین بالجہر کیا کرتے۔"

(شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص ۱۳۰)

تقلید شخصی کی بابت شاہ شہیدؒ کیا عقیدہ رکھتے تھے اس کا اندازہ مندرجہ ذیل عبارت سے ہو سکتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"قد غلا الناس فی التقلید وتعصبوا فی التزام تقلید شخص معین حتی منعوا الاجتهاد فی مسئلۃ ومنعوا تقلید غیر امامہ فی بعض المسائل وھذا ھی الداء العضال التی اھلکت الشیعۃ فھؤلاء ایضاً اشرفوا علی ھلاک"

(تنویر العینین ص ۳۴)

(ترجمہ) لوگوں نے تقلید کے بارے میں غلو کیا ہے اور کسی ایک شخص کی تقلید کا التزام کر کے تعصب برتا ہے، یہ لوگ کسی ایک مسئلہ میں بھی اجتہاد کو جائز نہیں سمجھتے اور اپنے امام کے علاوہ کسی دوسرے امام کی بات ماننے سے منع کرتے ہیں۔ یہی وہ خطرناک اور مہلک مرض ہے، جس نے شیعوں کو

ہلاک کر دیا پس یہ لوگ بھی ہلاکت ہی کے کنارے کھڑے ہیں ۔"

اسی تنویر العینین میں شاہ شہید دوسری جگہ لکھتے ہیں :

"کیف یجوز التزام تقلید شخص معین مع امکان الرجوع الی الروایات المنقولة عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم الصریحة الدالة خلاف قول الامام المقلد (۳۸)

یعنی کسی خاص اور معین شخص کی تقلید کو اپنے اوپر لازم کر لینا کیسے جائز ہوگا جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی صاف اور صریح احادیث ہم کو ملتی ہیں جو امام کے قول کے خلاف ہیں ۔"

ان اقتباسات سے صاف واضح ہے کہ مولانا اسماعیل شہیدؒ اہلحدیث اور غیر مقلد تھے ۔

رسالہ المفتی کا ایک غلط جواب :

کسی زمانے میں دیوبند سے ایک رسالہ "المفتی" کے نام سے شائع ہوتا تھا ، اس میں مولانا اسماعیل شہید کے عقیدہ اور مسلک کے متعلق ایک فتویٰ شائع ہوا ہے ۔ مفتی صاحب نے مولانا شہید کو حنفی مقلد بتایا ہے ۔ سوال وجواب اصل الفاظ میں درج ذیل ہیں :

"مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ کو غیر مقلدین یہ کہتے ہیں کہ وہ غیر مقلد تھے دریافت طلب امر یہ ہے کہ حقیقت میں وہ غیر مقلد تھے یا حنفی تھے ؟ جیسا کہ بعض علماء دیوبند کہتے ہیں ۔ اگر حنفی المذہب تھے تو اس کے ثبوت

میں ان کی کوئی تصنیف اردو یا بدرجہ مجبوری فارسی کی ہو جس سے ثابت ہوتا ہو کہ حنفی المذہب تھے۔ آپ پیش کر سکتے ہیں؟ اگر وہ خدانخواستہ غیر مقلد ہیں تو ان کی تصانیف کو دیکھنا کیسا ہے؟ اور علماء دیوبند ان کی بہت حمایت کرتے ہیں، اگر وہ غیر مقلد ہیں تو ان کی حمایت کرنے سے کیا فائدہ؟ مجھ کو ایک شخص نے "تقویۃ الایمان" کا حوالہ دکھایا ہے جس میں ایک فصل ہے "بیان در ردِّ تقلید" اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بعض دیگر تصانیف مولانا مرحوم موجود ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اہلِ حدیث تھے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ یہ دعویٰ ان کا صحیح ہے یا غلط؟ اور ان کی تصنیف علاوہ "تقویۃ الایمان" کے اور "صراطِ مستقیم" اور "منصب امامت" کے دوسری بھی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اہلحدیث تھے؟

"منصب امامت" اور "صراطِ مستقیم" کے مسائل سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ حنفی المذہب ہونا؟

مہربانی فرما کر چاروں باتوں کا جواب دیا جائے کیوں کہ ان کے متعلق متضاد حالات مشہور ہو رہے ہیں۔"

الجواب:

"حضرت مولانا اسماعیل شہیدؒ حنفی المذہب عالمِ ربانی اور بزرگ تھے اور ردِّ بدعات میں بہت زیادہ ساعی تھے۔ ہر دینی کام میں جہاں

بھی غلو دیکھتے تھے اس کا رد فرماتے تھے ۔ مسئلہ تقلید میں بھی ہندوستان میں افراط و تفریط سے کام لیا گیا ہے جیسا کہ غیر مقلدین نے تقلید میں تفریط کی اور تقلید کو شرک ، مقلدین کو مشرک قرار دیا ۔ ائمہ سلف پر طعن و تشنیع کو شیوہ بنالیا ۔ اسی طرح بعض مقلدین نے تقلید میں غلو اور افراط سے کام لیا کہ ائمہ مجتہدین کو چھوڑ کر ہر پیر و فقیر کی تقلید شروع کر دی خواہ اس کا فعل ، قول ، شریعت کے دائرہ میں ہو یا نہ ہو ۔

"تقویۃ الایمان" میں چونکہ تمام رسوم بدعیہ پر رد لکھا گیا ہے اس لیے اس غلو اور افراط فی التقلید کو بھی منع فرمایا گیا ہے ۔ اسی کے متعلق یہ فصل لکھی گئی ہے ۔ جیسا کہ خود تقویۃ الایمان کی عبارت مندرجہ ذیل سے معلوم ہوتا ہے:

"سو سننا چاہیے کہ اکثر لوگ مولویوں اور درویشوں کے کلام اور کام کو سن کر سند پکڑتے ہیں (الیٰ قولہ) ان مولویوں اور درویشوں کے قول و فعل کے خلاف کوئی آیت یا حدیث پڑھے تو اس کا انکار اور اس کے مطلب میں تکرار کرنے کو موجود ہو جائیں ۔"

اس سے صاف معلوم ہوا کہ حضرت شہیدؒ مطلقاً تقلید کو منع نہیں فرماتے بلکہ صرف اس غلو اور افراط کو روکتے ہیں کہ ائمہ دین مجتہدین سے گزر کر ہر کس و ناکس کی تقلید اختیار کر لی جائے ۔ چنانچہ اسی فصل میں ائمہ مجتہدین کی تقلید کی خود ہدایت فرمائی ہے ، جس کے الفاظ یہ ہیں ۔

"تو ایسی بات پر یعنی جس میں کوئی نص صریح قرآن و حدیث و اجماع میں موجود نہ ہو ، مجتہدوں کے قیاس صحیح کے موافق عمل کرے ،

پر وہ مجتہد بھی ایسا ہو کہ جس کا اجتہاد امت کے اکثر عالم مسلمانوں نے قبول کیا ہو جیسے امام اعظمؒ اور امام شافعیؒ اور امام مالکؒ اور امام احمدؒ الخ۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔"

(رسالہ المفتی دیوبند بابت ماہ ذیقعدہ وذی الحجہ ۱۳۶۰ھ ص ۳۰،۳۱)

رسالہ المفتی کا یہ سوال وجواب اخبار اہلحدیث امرتسر جلد ۳۹ نمبر ۱۱ (بابت ۲۴ صفر ۱۳۶۱ھ مطابق ۱۳ مارچ ۱۹۴۲ء) سے ماخوذ ہے۔ اس جواب میں مفتی صاحب نے عبارتوں کے نقل کرنے میں جو خیانت کی ہے اس کا پردہ فاش کرنے سے پہلے میں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مفتی صاحب نے اہلحدیث پہ یہ غلط الزام لگایا ہے کہ انھوں نے "ائمہ سلف پر طعن وتشنیع کو شیوہ بنالیا ہے۔" بلکہ یہ المفتی کے اکابر کا شیوہ ہے۔ ثبوت کے لیے "انتقاد صحیح بجواب ذیل رکعات تراویح" از ص ۲۵ تا ص ۳۳ ملاحظہ کیجیے۔ اس کتاب میں مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مولانا محمود حسن، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا محمد حسن سنبھلی، ان سب حضرات کی کتابوں سے وہ عبارتیں نقل کر دی گئی ہیں جن میں صرف طعن وتشنیع کے فقرے ہی نہیں ہیں، بلکہ بعض ایسی گندی اور فحش گالیاں تک موجود ہیں جن کو پڑھ کر شرافت اور انسانیت پانی پانی ہو جاتی ہے۔

اسی طرح اہلحدیث کے متعلق مفتی صاحب کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ وہ ہر قسم کی تقلید کو "شرک" قرار دیتے ہیں۔ اہلحدیث اُسی تقلید کو "شرک" قرار دیتے ہیں جس کو خود مولانا شہیدؒ نے بھی شرک ہی فرمایا ہے اور لطف یہ ہے کہ مولانا شہیدؒ کا

یہ ارشاد تقویۃ الایمان کی اُسی فصل میں موجود ہے جس کے حوالہ سے مفتی صاحب نے اپنے جواب میں عبارتیں نقل کی ہیں۔ چنانچہ مولانا شہیدؒ فرماتے ہیں۔

اور جیسے خدا کے حکم کو ماننا ویسے ہی اور کسی مولوی درویش کا حکم ماننا شرک ہے۔ قال اللہ تبارک وتعالیٰ اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ والمسیح ابن مریم وما امروا الا لیعبدوا الٰھا واحدا لا الٰہ الا ھو، سبحانہ عما یشرکون ط

(اس آیت کا ترجمہ کرنے کے بعد فائدہ کے ذیل میں لکھتے ہیں۔)

یعنی اللہ کو تو بڑا مالک سمجھتے ہیں اور اس سے چھوٹے اور مالک ٹھہراتے ہیں۔ عیسیٰ مسیح پیغمبر اور مولوی اور درویش کہ ان کا بھی حکم اپنے اوپر واجب اور فرض سمجھتے ہیں جیسا اللہ کا حکم، حالانکہ اس بات کا ان کو حکم نہیں ہوا۔ اور اس سے ان پر شرک ثابت ہوتا ہے اور اللہ نرالا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔ نہ چھوٹا نہ بڑا، نہ عیسیٰ مسیح پیغمبر نہ مولوی نہ درویش۔ بلکہ یہ سب اس کے بندے ہیں، خود محکوم، پھر یہ کہاں سے خود ... حاکم و مالک ہو گئے کہ اپنی رائے سے مسئلہ بتا دیں اور خدا کے حکم اور قرآن میں اپنے حکم کو دخل دیں۔

تقویۃ الایمان کی چوتھی فصل میں مولانا شہیدؒ لکھتے ہیں۔

" اللہ کے نزدیک پہنچنے کی راہ بندوں تک رسول ہی کی خبر دیتا ہے

سو جو کوئی کسی امام کی یا مجتہد کی یا غوث و قطب کی یا مولوی و مشائخ کی .... بات کو اور ان کی راہ و رسم کو رسول کے زمانے سے مقدم سمجھے، اور آیت و حدیث کے مقابل میں پیر و استاد کے قول کی سند پکڑے سو ایسی باتوں سے شرک ثابت ہوتا ہے، بلکہ اصل حاکم اللہ ہے اور پیغمبر خبر دینے والا ہے۔ پھر جو کسی کی بات اس کی خبر کے موافق ہو تو مانیے اور جو موافق نہ ہو تو نہ مانیے۔"

تقلید کی اسی صورت کو اہلحدیث شرک کہتے ہیں، ہر قسم کی تقلید کو وہ شرک نہیں کہتے اور نہ ہر مقلد کو وہ مشرک قرار دیتے ہیں۔ مفتی دیوبند کا یہ بہتان ہے۔ رہا مفتی دیوبند کا یہ دعوی کہ مولانا شہید حنفی المذہب عامل تھے اور تقویۃ الایمان میں رد تقلید کی جو فصل لکھی گئی ہے وہ ہر کس و ناکس کی تقلید سے روکنے کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس سے ائمہ مجتہدین کی تقلید کا رد کرنا مقصود نہیں ہے کیوں کہ ان ائمہ کی تقلید کرنے کی تو خود مولانا شہید نے اسی فصل میں ہدایت فرمائی ہے۔ تو اس کے جواب میں ہم سب سے پہلے اپنے قارئین ہی کو تکلیف دینا چاہتے ہیں کہ ان کے پاس اگر "تقویۃ الایمان" مع تذکیر الاخوان موجود ہو تو مہربانی کرکے وہ براہ راست اس بحث کو اس کتاب میں پڑھیں۔ تاکہ ان کو پورا اندازہ ہو جائے کہ اس موقع پر مفتی دیوبند نے اپنے سائل کو کیسا فریب اور مغالطہ دیا ہے۔

تذکیر الاخوان (جو تقویۃ الایمان کے دوسرے حصہ کا ترجمہ ہے) میں ایک عنوان ہے۔ "الفصل السادس فی رد بدعة التقليد۔" (فصل چھٹی تقلید کی بدعت کے رد کے بیان میں۔) اسی فصل میں شاہ شہید نے اس مسئلہ پر

تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ سات صفحوں میں یہ بحث پھیلی ہوئی ہے۔ قرآن مجید کی بہت سی آیتیں اور حدیثیں اس سلسلہ میں انھوں نے ذکر کی ہیں یہ کتاب سب کے پاس موجود نہ ہوگی اس لیے کچھ اقتباسات ہم یہاں اس سے نقل کر دیتے ہیں جس سے مفتی دیوبند کے اس فریب کا حال معلوم ہو جائے گا کہ اس فصل میں ائمہ مجتہدین کی تقلید کا رد ہے یا نہیں؟ نیز شاہ شہید نے ائمہ کی جس تقلید کی ہدایت فرمائی ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟

اپنے دعوے کے ثبوت میں مفتی دیوبند نے عبارت کا جتنا ٹکڑا پیش کیا ہے یہ بہت ناقص اور نامکمل ہے اس سے شاہ شہید کا مقصد پوری طرح ادا نہیں ہوتا اس کے ساتھ اس کے بعد والی عبارتوں کے ملانے سے پورا مطلب حل ہوتا ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس پڑھیے۔

"کوئی ان مولویوں اور درویشوں کے قول و فعل کے خلاف آیت اور حدیث پڑھے تو اس کا انکار اور اس کے مطلب میں تکرار کرنے کو موجود ہو جاتے ہیں اور ایمان کے جاتے رہنے کا کچھ لحاظ نہیں کرتے اور اصل بات یہ ہے کہ حاکم مطلق اللہ تعالیٰ ہی ہے، اس کے حکم کو ملنا چاہیے اس کے سوا اور کسی کا حکم نہ مانیے اور رسول ؐ کا حکم ماننا بھی خدا ہی کا حکم ہے۔ خود پیغمبر بھی حاکم نہیں پھر اور کوئی مجتہد اور فقیہ اور مولوی، مفتی، قاضی، ملا، طالب علم اور غوث، قطب اور ولی اور پیر، شہید اور پیرزادے، خادم، مجاور، مرید تو کس گنتی اور شمار میں ہیں۔"

دیکھیے مولانا شہیدؒ نے مولوی ملا مفتی، قاضی، شہید، پیر ولی وغیرہ کے

حکم کو جس درجے میں رکھا ہے اسی درجہ میں مجتہد اور فقیہ کے حکم کو بھی شمار کیا ہے۔ اس لیے یہ تاویل کرنا کہ تقویۃ الایمان کی اس فصل کا تعلق صرف مولویوں اور درویشوں کی تقلید سے ہے، ائمہ مجتہدین کی تقلید سے نہیں ہے یقیناً باطل ہے۔ اسی فصل میں اور اسی سلسلۂ بحث میں مولانا شہید کی یہ صاف و صریح ہدایت موجود ہے۔

"غرضیکہ مسلمانوں کو چاہیے کہ جب تک مسئلہ قرآن و حدیث سے ثابت نہ ہو تب تک مجتہد کی پیروی و تقلید نہ کرے اور تحقیق کی فکر میں رہے اور کوشش کرے، محض تقلید ہی پر خاطر جمع کرکے نہ بیٹھ رہے۔ پھر جب قرآن و حدیث سے خلاف مجتہد کا ثابت ہو جاوے تو اس کے موافق عمل کرے، پھر تقلید حرام ہے۔"

بتائیے ائمہ مجتہدین کی جامد تقلید کی تردید اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے صاف صاف فرماتے ہیں کہ کسی امام اور مجتہد کی تقلید پر مطمئن ہو کر نہ بیٹھ رہے تحقیق کی فکر میں رہے۔ قرآن و حدیث میں مجتہد اور امام کی بات کی دلیل تلاش کرے اگر اس کی بات قرآن و حدیث کے موافق ہو تو مانے اور اگر خلاف ثابت ہو تو اس کی بات چھوڑ دے۔ ایسی صورت میں اس مجتہد اور امام کی تقلید کرنا حرام ہے۔ اب خود فیصلہ کیجیے کہ مولانا شہید حنفی المذہب، عامی اور مقلد تھے یا اہلحدیث اور غیر مقلد تھے؟ نیز یہ بھی فیصلہ کیجیے کہ تقویۃ الایمان کی اس فصل کا تعلق ائمہ مجتہدین کی تقلید سے ہے یا نہیں۔ اسی فصل کے ذیل میں آگے چل کر لکھتے ہیں۔

یہ عجب حیرت کی بات ہے کہ آپ صرف و نحو و لغت و منطق و

بیان ومعانی واصول وتفسیر وحدیث سب علم پڑھ کر حقیقت کو دریافت نہ کریں کہ یہ مسئلہ کس آیت اور کس حدیث سے نکلا ہے؟ اور کہاں سے لکھا ہے؟ اور بنا اس مسئلہ کی کس بات پر ہے؟ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی اپنی آنکھیں بھینچ کے بند کرلے اور اندھے کی طرح اوروں کی آواز کے پیچھے پیچھے چلے۔ مسائل فقہی ایسے لوگوں کے واسطے ہیں جو قرآن وحدیث کا مطلب سمجھ نہیں سکتے اور جو عالم اصول اور تفسیر اور حدیث ولغت ونحو جانتا ہو اس کو یہی چاہیے کہ ہر مسئلہ کو اصول کے قواعد کے موافق قرآن وحدیث کے مقابل کرے اگر موافق پاوے تو عمل کرے اور اگر مخالف پاوے تو اس کو رد کرے اور نہ مانے پھر کسی کا قول ہو خواہ امام کا خواہ مشائخ کا۔ کیا تعجب ہے کہ اس امام و مشائخ کو غلطی ہو گئی ہو۔ اس واسطے کہ سوائے پیغمبر کے کوئی معصوم نہیں۔ اہلسنت کا یہی عقیدہ ہے کہ المجتھد یخطئ یعنی مجتہد کبھی خطا بھی کر جاتا ہے تو واقف کار پر فرض ہے کہ اس خطا کو مٹا کر درست کرے۔"

اس اقتباس کو بار بار پڑھیے اور اندازہ کیجیے کہ "المفتی" کے مجیب نے انصاف ودیانت کا کس طرح خون کیا ہے اور اپنے سائل کو کیسا مغالطہ اور دھوکہ دیا ہے؟۔

اب آیئے ہم آپ کو بتائیں کہ مولانا شہیدؒ نے ائمہ مجتہدین کی تقلید کی جو ہدایت فرمائی ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ مفتی دیوبند نے اپنے دعوے

کے ثبوت میں جو عبارت نقل کی ہے وہ ناقص ہے۔ پوری عبارت پڑھیے تو حقیقت واضح ہو۔ مولانا شہید فرماتے ہیں:

"اور جو مسئلہ قرآن میں مفصل مذکور نہیں، اس کا حال حدیث سے دریافت کرے اور جو حدیث میں بھی صریح بیان نہ ہو وہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحابوں کے اجماع سے دریافت کر کے اس اجماع کے موافق عمل کرے، اس واسطے کہ حدیث کی رو سے صحابہ کے اجماع کی پیروی کرنے کا حکم ثابت ہے۔ پھر جو مسئلہ اجماع سے ثابت نہ ہو یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم کے وقت میں ایسا واقع نہ ہوا ہو جو اس پر وہ حکم ٹھہرا کر اجماع کرتے تو ایسی بات پر مجتہدوں کے قیاس صحیح کے موافق عمل کرے۔ پھر وہ مجتہد بھی ایسا ہو کہ جس کا اجتہاد امت کے اکثر عالم مسلمانوں نے قبول کیا ہو جیسے امام اعظمؒ اور امام شافعیؒ اور امام مالکؒ اور امام احمدؒ، اور قیاس بھی فاسد نہ ہو....."

غور کیجیے مولانا شہیدؒ نے یہ "ہدایت" نہیں فرمائی ہے کہ اس زمانے میں چاروں اماموں میں سے کسی ایک امام کے قول ہی کو حجت اور سند ماننے اور ہر شرعی مسئلہ میں انھی کے "قول" کی اتباع اور پیروی کرے۔ (جیسا کہ حنفی مذہب کی کتابوں میں لکھا ہے) بلکہ مولانا شہید کی "ہدایت" تو یہ ہے کہ ہر شرعی مسئلہ کا حکم پہلے قرآن پاک سے دریافت کرے۔ اگر قرآن میں وہ مسئلہ مذکور نہ ہو تب حدیث سے اس کا حال دریافت کرے، اگر حدیث میں بھی اس کا صریح بیان نہ ہو تب

صحابہ کے اجماع سے دریافت کرے۔ اگر صحابہ کے اجماع سے بھی اس مسئلہ کا حکم معلوم نہ ہو اس لیے کہ صحابہ کے زمانے میں کوئی ایسا واقعہ پیش ہی نہ آیا تھا تب ایسی مجبوری کی صورت میں مجتہدوں کے قیاس پر عمل کرے۔ مگر اس کے لیے بھی مولانا شہید نے دو قیدیں بیان کی ہیں ایک یہ کہ وہ قیاس "صحیح ہو فاسد نہ ہو"۔ اور دوسری یہ کہ وہ مجتہد ایسا ہو جس کے اجتہاد کو اکثر مسلمانوں اور عالموں نے قبول کیا ہو۔ اس موقع پر مولانا شہید نے چاروں اماموں کے ناموں کو بطورِ مثال کے پیش کیا ہے۔ یہ نہیں کہا ہے کہ اجتہاد انھیں چاروں پر ختم ہو گیا ہے اور ان چاروں کے علاوہ کسی دوسرے مجتہد کا اجتہاد نہ صحیح ہو سکتا ہے اور نہ قابلِ قبول۔

اب پوچھیے ان سے جو یہ کہتے ہیں کہ مولانا شہیدؒ نے ائمہ مجتہدین کی تقلید کی ہدایت فرمائی ہے۔ کیا ان حضرات کے نزدیک بھی ائمہ کی تقلید کی یہی صورت ہے؟ کیا اس زمانے میں کسی عالم کے لیے ان کے نزدیک بھی یہ درست ہے کہ وہ براہِ راست قرآن مجید اور حدیث اور اجماع صحابہ سے شرعی مسائل کو دریافت کرے۔ یعنی استنباط کرے۔؟ کیا یہ بھی کہتے ہیں کہ ائمہ مجتہدین کے قیاسی مسائل کو قرآن اور حدیث سے مقابلہ کر کے جانچنا چاہیے کہ یہ قیاس صحیح ہے یا فاسد؟ اگر صحیح ثابت ہو یعنی قرآن اور حدیث کے موافق ہو تو قبول کرے اور اگر خلاف ہو تو رد کر دے۔ اگر یہی وہ تقلید ہے جس کے علماء دیوبند قائل ہیں تو ہم ہزار بار اس کو خوش آمدید کہتے ہیں، ہم ہرگز اس تقلید کے مخالف اور منکر نہیں ہیں۔ اس تقلید کا قائل ہونے کی وجہ سے اگر مولانا شہید حنفی المذہب عالم ہو سکتے ہیں تو پھر دنیا کا کوئی اہلحدیث عالم ایسا نہیں ہے جس کو "حنفی المذہب" نہ کہا جا سکے۔

یہ گفتگو تو "تقویۃ الایمان" کی عبارت پر ہوئی۔ اب مولانا شہید کی دوسری کتابوں کا حال سنیے! قارئین کو یاد ہوگا کہ رسالہ "المفتی" کے سائل نے مولانا شہیدؒ کے حنفی المذہب ہونے کا ثبوت ان کی دوسری کتابوں سے بھی طلب کیا تھا لیکن مفتی دیوبند نے اس کے جواب میں خاموشی اختیار کی ہے۔ جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ مفتی صاحب کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ مگر الحمد للہ ہمارے پاس اس کا جواب موجود ہے اور وہ جواب یہ ہے کہ مولانا شہید کی دوسری کتابوں سے بھی ان کا اہلحدیث ہی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ ان کے رسالہ "تنویر العینین" کے حوالے سے دو عبارتیں ہم اوپر نقل کر چکے ہیں، جنمیں مولانا شہید نے بڑے واضح الفاظ میں تقلید شخصی کے التزام کی مذمت کی ہے۔ اسی رسالہ میں مولانا شہید نے رفع یدین (نزاعی) کے بارے میں لکھا ہے "یثاب فاعلہ" یعنی نماز میں رفع یدین کرنا ثواب کا کام ہے۔ آج کون حنفی عالم ہے جو رفع یدین کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتا ہے، مولانا شہید "صراطِ مستقیم" میں لکھتے ہیں:

"در اعمال اتباع مذاہب اربعہ کہ رائج در تمام اہل اسلام است بہتر و خوب است، لیکن علم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم را منحصر در علم یک شخص از مجتہدان نہ داند، بلکہ علم نبوی منتشر در آفاق گردیدہ است، بموجب مقتضیات وقت بہ ہر کس رسیدہ، و بعد ازاں کہ کتب مصنفہ

اعمال میں مذاہب اربعہ کی اتباع جو تمام اہل اسلام میں رائج ہے بہتر اور خوب ہے لیکن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کو کسی ایک ہی مجتہد کے علم میں منحصر نہ جانے کیونکہ علم نبوی سارے جہان میں پھیلا ہے اور مقتضائے وقت کے مطابق ہر آدمی کو پہنچا ہے۔ البتہ کتابوں کی تصنیف کے بعد

شدہ جمعیت آں علوم ظاہر گشتہ۔
پس در ہر مسئلہ کہ حدیث صحیح صریح غیر منسوخ یابد اتباع ہیچ مجتہدے داں نکند، و اہلحدیث را مقتدائے خود شناسد و بہ دل محبت ایشاں دارد و تعظیم ایشاں لازم شمرد کہ حاملان علم پیغمبر اند، و نوعے فائدہ مصاحبت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم حاصل کردہ مقبول جناب رسالتمآب گشتہ اند، و مقلدان تعظیم و توقیر مجتہدان بخوبی می دانند، محتاج آگاہی براں نیستند۔ (ص۲۹)

اجتماعی حالت ان علوم سے ظاہر ہوئی۔
پس جس مسئلہ میں حدیث صحیح صریح غیر منسوخ پاوے اس میں کسی مجتہد کی پیروی نہ کرے، اور اہلحدیث کو اپنا مقتدا جانے، اور دل سے ان کی محبت کرے، ان کی تعظیم کو ضروری سمجھے۔ کیونکہ وہ لوگ علم پیغمبر کے حامل ہیں، اور ایک طرح سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی مصاحبت کا شرف حاصل کر کے مقبول رسالتمآب ہوئے ہیں، اور مقلدین مجتہدوں کی تعظیم و توقیر کو خوب جانتے ہیں بتلانے کے محتاج نہیں ہیں۔

ان حوالوں سے روز روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ مفتی دیوبند نے اپنے جواب میں دیانتداری سے کام نہیں لیا ہے اور ان کا یہ دعویٰ قطعاً غلط ہے کہ مولانا اسمٰعیل شہید علیہ الرحمہ مقلد تھے اور حنفی المذہب عالم تھے، اور انھوں نے ائمہ مجتہدین کی تقلید کی ہدایت فرمائی ہے، بلکہ اس کے برخلاف یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مولانا شہید اہلحدیث مسلک کے پیرو تھے اور اسی مسلک پر چلنے کی انھوں نے لوگوں کو ہدایت بھی فرمائی ہے۔ مولانا شہید کی کتابوں کے مزید حوالے مطلوب ہوں تو مولانا امام خان نوشہروی کی کتاب "تراجم علمائے حدیث ہند" ملاحظہ کیجیے۔[1] کچھ حوالے گزر چکے ہیں اور کچھ آئندہ آئیں گے، جن سے معلوم ہوگا کہ ....

---

[1] حال ہی میں المکتبۃ السلفیہ لاہور (پاکستان) سے شاہ اسمٰعیل شہید کی ایک سے

مولانا شہید ہی کی دعوت سے ہندوستان میں اس تحریک کو فروغ ہوا اور بالواسطہ یا بلاواسطہ انہی کے فیض یافتہ مجاہدین اور بیرونکار مخلصین کی مساعی جمیلہ سے یہ تحریک پورے ملک میں پھیلی۔ اس لیے اس تحریک کی قیادت کا سہرا حضرت شہید ہی کے سر ہے۔

اس تحریک کے ثمرات و اثرات:

اس تحریک نے ہندوستان کے مسلمانوں پر کیا اثر کیا اور اس کی بدولت انھیں کس کس نوع کی اصلاح ہوئی اس کا حال جاننے کے لیے مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کا مندرجہ ذیل بیان پڑھیے۔ سید صاحب فرماتے ہیں:

"اہلحدیث" کے نام سے ملک میں اس وقت بھی جو تحریک جاری ہے حقیقت کی رو سے وہ قدم نہیں صرف نقشِ قدم ہے۔ مولانا اسماعیل شہیدؒ جس تحریک کو لے کر اٹھے تھے وہ فقہ کے چند مسائل نہ تھے بلکہ امامتِ کبریٰ، توحیدِ خالص، اور اتباعِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بنیادی تعلیمات تھیں، مگر افسوس کہ سیلاب نکل گیا اور باقی جو رہ گیا ہے وہ گزرے ہوئے پانی کی نقط لکیر ہے۔" بہر حال اس تحریک کے جو اثرات پیدا ہوئے اور اس زمانہ سے آج تک دور ادبار کی ساکن سطح میں اس سے جو

---

* گرانمایہ اور نادر الوجود عربی کتاب "رد الاشراک" شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کا ایک مستقل عنوان ہی یہ ہے۔ "ذکر رد بدعات التقلید"

جنبش ہوئی وہ بھی ہمارے لیے بجائے خود مفید اور لائق شکریہ ہے۔ بہت سی بدعتوں کا استیصال ہوا، توحید کی حقیقت نکھار دی گئی قرآن پاک کی تعلیم و تفہیم کا آغاز ہوا۔ قرآن پاک سے براہ راست ہمارا رشتہ دوبارہ جوڑا گیا۔ حدیث نبوی کی تعلیم و تدریس اور تالیف و اشاعت کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ ساری دنیائے اسلام میں ہندوستان ہی کو صرف اس تحریک کی بدولت یہ دولت نصیب ہوئی۔ نیز فقہ کے بہت سے مسئلوں کی چھان بین ہوئی۔ (یہ اور بات ہے کہ کچھ لوگوں سے غلطیاں بھی ہوئی ہوں۔) لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ دلوں سے اتباع نبوی کا جو جذبہ گم ہوگیا تھا وہ سالہا سال تک کے لیے دوبارہ پیدا ہوگیا۔ مگر افسوس ہے کہ اب وہ بھی جا رہا ہے۔

اس تحریک کی ہمہ گیر تاثیر یہ بھی تھی کہ وہ "جہاد" جس کی آگ اسلام کے مجمر میں ٹھنڈی پڑ گئی تھی وہ پھر بھڑک اٹھی، یہاں تک کہ ایک زمانہ گزرا کہ وہابی اور باغی مترادف لفظ سمجھے گئے اور کتنوں کے سر قلم ہوگئے، کتنوں کو سولیوں پر لٹکنا پڑا اور کتنے پا بجولاں دریائے شور عبور کر دیے گئے، یا تنگ کوٹھریوں میں انھیں بند ہونا پڑا۔ اور اب پردہ کیا، صاف کہنا ہے کہ مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی کی زندگی تک تحریک کے علمبرداروں میں یہ روح کام کر رہی تھی۔

افسوس کز قبیلۂ مجنوں کسے نماند

علمار اہلحدیث کی تدریسی و تصنیفی خدمت بھی قدر کے قابل ہے، پچھلے عہد میں نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے قلم اور مولانا سید نذیر حسین دہلوی کی تدریس سے بڑا فیض پہنچا۔ بھوپال ایک زمانہ تک علمار اہلحدیث کا مرکز رہا، قنوج سہسوان اور اعظم گڈھ کے بہت سے نامور اہلِ علم اس ادارہ میں کام کر رہے تھے۔ شیخ حسین عرب یمنی ان سب کے سرخیل تھے اور دہلی میں مولانا سید نذیر حسین صاحب کی مسند درس بچھی ہوئی تھی، اور جوق جوق طالبین حدیث مشرق و مغرب سے ان کی درس گاہ کا رُخ کر رہے تھے۔ ان کی درس گاہ سے جو نامور اُٹھے ان میں سے ایک مولانا ابراہیم صاحب آروی تھے۔ جنھوں نے سب سے پہلے عربی تعلیم اور عربی مدارس میں اصلاح کا خیال قائم کیا اور مدرسہ احمدیہ کی بنیاد ڈالی۔ اس درس گاہ کے دوسرے نامور مولانا شمس الحق صاحب مرحوم (صاحب عون المعبود) ہیں جنھوں نے کتب حدیث کی جمع اور اشاعت اپنی دولت اور زندگی کا مقصد قرار دیا، اور اس میں وہ کامیاب ہوئے۔ اس درس گاہ کے تیسرے نامور حافظ عبد اللہ صاحب غازی پوری ہیں، جنھوں نے درس و تدریس کے ذریعہ خدمت کی اور کہا جا سکتا ہے کہ مولانا سید نذیر حسین صاحب کے بعد درس کا اتنا بڑا حلقہ اور شاگردوں کا مجمع ان کے سوا کسی اور کو اُن کے شاگردوں میں نہیں ملا۔ اس درس گاہ کے ایک اور نامور تربیت یافتہ ہمارے ضلع (اعظم گڈھ) میں مولانا عبد الرحمٰن صاحب مبارکپوری مرحوم تھے۔ جنھوں نے تدریس و تحدیث کے

ساتھ ساتھ جامع ترمذی کی شرح تحفۃ الاحوذی (عربی) لکھی۔

اس تحریک کا ایک اور فائدہ یہ ہوا کہ مدت کا زنگ طبیعتوں سے دور ہوا، اور یہ جو خیال ہو گیا تھا کہ اب تحقیق کا دروازہ بند اور نئے اجتہاد کا راستہ مسدود ہو چکا ہے، رفع ہو گیا۔ اور لوگ از سرِ نو تحقیق و کاوش کے عادی ہونے لگے۔ قرآن پاک اور احادیث مبارکہ سے دلائل کی خو پیدا ہوئی اور قیل و قال کے مکدر گڑھوں کی بجائے ہدایت کے اصلی سرچشمہ مصفا کی طرف واپسی ہوئی۔"

(مقدمہ تراجم علمائے حدیث ہند)

سید صاحب کے اس بیان سے مندرجہ ذیل چند فوائد حاصل ہوتے ہیں:

(الف) ہندوستان میں تحریک اہلحدیث کی قیادت مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی تھی۔ (اگرچہ بقول سید صاحب: "وہ سیلاب نکل گیا اور باقی جو رہ گیا ہے وہ گزرے ہوئے پانی کی حد لکیر ہے۔" تاہم یہ تو ثابت ہوا کہ اس تحریک کا ماضی شاندار ہے اور یہ "لکیر" اسی گزرے ہوئے سیلاب کی نشانی ہے۔ اس لیے آج جو لوگ اس "لکیر" کو بھی مٹا دینا چاہتے ہیں وہ درحقیقت مولانا شہیدؒ کی ایک نشانی کو مٹانا چاہتے ہیں۔ (خذلهم الله)۔

(ب) دینی خدمات اور ملی اصلاحات کی جو مختلف النوع کوشش کامیاب ہوئیں، دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ساری دنیائے اسلام میں ہندوستان ہی کو صرف اسی تحریک کی بدولت یہ دولت نصیب ہوئی۔

(ج) اس تحریک کی ہمہ گیر تاثیر یہ بھی تھی کہ وہ "روح جہاد" جس کی آگ مسلمانوں کے سینوں

میں ٹھنڈی پڑ گئی تھی وہ پھر بھر ملک اٹھی۔ یہاں تک کہ ایک زمانہ گزرا کہ وہابی اور باغی مترادف سمجھے گئے۔ (سید صاحب کے اس ارشاد سے یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ جس زمانے میں "وہابی" کو باغی کے مرادف سمجھا جاتا تھا، اس وقت "وہابی" سے مراد اہلحدیث تھے (اس عنوان پر تفصیلی گفتگو انشاءاللہ ہم آئندہ اپنے موقع پر کریں گے۔)

(د) مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی (المتوفی ۱۳۳۶ھ/۱۹۱۸ء) کی زندگی تک اس تحریک کے علمبرداروں میں جہاد کی روح کام کر رہی تھی (یہ صریح تکذیب و تردید ہے ان لوگوں کی جو یہ کہتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء سے اہلحدیث عملی جہاد سے الگ ہیں۔)

(ک) علمائے اہلحدیث نے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کی جو خدمت انجام دی ہے وہ بھی قدر کے قابل ہے۔

(و) اس تحریک کا ایک اور فائدہ یہ ہوا کہ قرآن پاک اور احادیث رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سمجھنے اور سمجھانے کے بارے میں ذہن و فکر پر جو جمود طاری ہو گیا تھا اور مدت سے طبیعتوں پر جو زنگ بیٹھ گیا تھا وہ دور ہو گیا۔ یہ خیال رفع ہو گیا کہ اب تحقیق کا دروازہ بند اور نئے اجتہاد کا راستہ مسدود ہو چکا ہے۔ اسی تحریک کا یہ فیض ہے کہ تقلیدی آراء الرجال کی قیل و قال کے مکدر گڑھوں سے نکل کر ہدایت کے اصلی سرچشمہ مصفا کی طرف واپسی ہوئی۔

سید صاحب کا دوسرا بیان:

یہی مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مرحوم "سیرت سید احمد شہید" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"تیرہویں صدی میں جب ایک طرف ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی طاقت فنا ہو رہی تھی اور دوسری طرف ان میں مشرکانہ رسوم اور بدعات کا زور تھا۔ مولانا اسمٰعیل شہید اور حضرت سید احمد بریلوی کی مجاہدانہ کوششوں نے تجدید دین کی نئی تحریک شروع کی۔ یہ وہ وقت تھا جب سارے پنجاب پر سکھوں کا اور باقی ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ تھا۔ ان دونوں بزرگوں نے اپنی بلند ہمتی سے اسلام کا علم اٹھایا۔ اور مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دی جس کی آواز ہمالیہ کی چوٹیوں اور نیپال کی ترائی سے لے کر خلیج بنگال کے کناروں تک یکساں پھیل گئی اور لوگ جوق جوق اس علم کے نیچے جمع ہونے لگے۔ اس مجددانہ کارنامہ کی عام تاریخ لوگوں کو یہیں تک معلوم ہے کہ ان مجاہدوں نے سرحد پار ہو کر سکھوں سے مقابلہ کیا اور شہید ہوئے۔ حالانکہ یہ واقعہ اس کی پوری تاریخ کا ایک باب ہے۔۔۔

اس تحریک نے اپنے پیروؤں میں للّٰہیت، خلوص، اتحاد، نظم، ریاست اور تنظیم کا جو جوہر پیدا کر دیا تھا اس کے سمجھنے کے لیے کتاب (سیرت سید احمد شہیدؒ) کا چوتھا باب کافی ہے۔ بنگال کی سرحد سے لے کر پنجاب تک اور نیپال کی ترائی سے لے کر دریائے شور کے ساحل تک اسلامی جوش و عمل کا دریا موجیں مار رہا تھا اور حیرت انگیز وحدت کا سماں آنکھوں کو نظر آرہا تھا۔ سید صاحب کے خلفاء ہر صوبہ اور ولایت میں پہنچ چکے تھے۔ اور اپنے اپنے دائرے میں تجدید، اصلاح اور تنظیم کا کام انجام دے رہے تھے۔

مشرکانہ رسوم مٹائے جارہے تھے، بدعتیں چھوڑی جارہی تھیں۔ نام کے مسلمان کام کے مسلمان بن رہے تھے۔ جو مسلمان نہ تھے وہ بھی اسلام کا کلمہ پڑھ رہے تھے۔ (کہتے ہیں کہ اس تحریک سے چالیس ہزار غیر مسلم مسلمان ہوئے) شراب کی بوتلیں توڑی جارہی تھیں۔ تاڑی اور رینڈھی کے خم لنڈھائے جارہے تھے۔ بازاری فواحش کے بازار سرد ہو رہے تھے اور حق و صداقت کی بلندی کے لیے علماء حجروں سے اور امراء ایوانوں سے نکل کر میدانوں میں آرہے تھے اور ہر قسم کی ناچاری مفلسی اور غربت کے باوجود تمام ملک میں اس تحریک کے سپاہی پھیلے ہوئے تھے۔ اور مجاہد تبلیغ اور دعوت میں لگے تھے۔

سید صاحب مرحوم کی تحریروں کے ان اقتباسات سے ہندوستان کی تحریکِ اہلحدیث اور پہلی دینی انقلابی تحریک (جس کی قیادت مولانا اسماعیل شہید اور سید احمد شہید نے فرمائی تھی) کے اثرات اور فوائد کا جو اجمالی نقشہ سامنے آتا ہے، اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ مختلف نوع کے تھے، اور اپنی جگہ بڑے اہم اور بے حد مفید تھے۔ لیکن ہمارا موضوعِ بحث محدود ہے، اس لیے اپنے موضوع کے لحاظ سے ہم اس تحریک کے علمبرداروں کے اوصافِ حمیدہ میں سے صرف ان کے جوشِ جہاد کا کچھ حال مستقل عنوان کے تحت یہاں بیان کرنا چاہتے ہیں۔

جوشِ جہاد اور شوقِ شہادت:

مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری لکھتے ہیں۔ (حج کے بعد سید احمد صاحب رح

جب وطن واپس آگئے تو تھوڑے ہی عرصہ کے بعد) سفر جہاد کی تیاری کرنے لگے۔ مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ اور مولوی عبدالحی صاحبؒ وغیرہ علماء کو واسطے بیان کرنے مضامین ترغیب جہاد اور جہاد کے اطراف ہندوستان میں روانہ کردیا گیا۔ اس وقت سید صاحب کے مکان پر بجائے مراقبہ و مشاہدہ اور توجہ دہی کے فضیلت ہجرت اور جہاد کا بیان اور تلوار و بندوق کی صفائی اور قواعد و چاندماری اور گھوڑ دوڑ ہوا کرتی تھی۔ اب بجائے صوفی و درویش کے ہر شخص سپاہی بن گیا، تسبیح کے عوض ہاتھ میں تلوار اور فراخ جبہ کی جگہ چست ارخالق اور پیچدار سربند لباس ہوگیا۔ جن لوگوں نے آپ کے تابعین کو پہلے بصورت درویشانہ اور اب بلباس و وضع سپاہیانہ دیکھا تو ان کو سخت حیرت ہوئی تھی۔

ان دنوں میں، جو کوئی تحفہ تحائف آپ کے لیے لے کر آتا تو اکثر ہتھیار یا گھوڑے ہوتے تھے۔ انہی دنوں میں شیخ فرزند علی صاحب غازیپور زمانیہ[1] سے دو نہایت عمدہ گھوڑے اور بہت سے وردی کے کپڑے اور چالیس جلد قرآن مجید تحفہ لے کر آئے۔ اور سب سے عجیب تحفہ جو شیخ صاحب لے کر آئے وہ امجد نام کا انکا ایک نوجوان بیٹا تھا جس کو انھوں نے مثل حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے راہ خدا میں نذر کر کے سید صاحب کے حوالہ کردیا اور عرض کیا کہ اس کو اپنے ساتھ لے جائیے اور تیغ کفار سے اس کی قربانی کرائیے۔" (سوانح احمدی ۶۹، ۷۰)

شیخ فرزند علی کی یہ نذر اللہ نے قبول کی، ان کے صاحبزادے شیخ امجد علی سکھوں سے لڑتے ہوئے بالاکوٹ کے معرکہ میں شہید ہوئے۔ ملاحظہ ہو "سید احمد شہید" جلد دوم ص ۳۲۴ اور "جماعت مجاہدین" ص ۲۵۵

---

[1] ضلع غازیپور (یوپی) میں ایک قصبہ کا نام "زمانیہ" ہے

مولانا خرم علی بلہوری جن کے متعلق مؤلف "تراجم علمائے حدیث ہند" نے لکھا ہے کہ "ابتداءً روشِ عام کے مطابق غالی مقلد تھے، مگر جب قسمت نے یاوری کی اور مولانا اسماعیل شہید کی مصاحبت نصیب ہوئی تو اتباعِ سنت کا رنگ چڑھ آیا۔" یہ بھی مجاہدین میں شامل تھے۔ اور فضائل جہاد کی آیات و احادیث فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں بطریق مثنوی نظم کر دی تھیں۔ یہ نظمیں عام طور پر پڑھی جاتی تھیں۔ نظم ہی میں ان کا ایک "رسالہ جہادیہ" ہے، یہ پورا رسالہ ۱۵۷ اشعار پر مشتمل ہے، اس میں سے چند منتخب اشعار بطور نمونہ کے ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔ یہ رسالہ مہر صاحب نے سید احمد شہید جلد دوم میں درج کر دیا ہے۔ (از ص ۲۵۸ تا ۲۶۰)

بعد تحمیدِ خدا، نعتِ رسول اکرم — یہ رسالہ ہے جہادیہ کہ لکھتا ہے قلم

واسطے دین کے لڑنا نہ پئے طمعِ بلاد — اہلِ اسلام اسے شرع میں کہتے ہیں جہاد

ہے جو قرآن و احادیث میں خوبی جہاد — ہم بیاں کرتے ہیں تھوڑا سا اسے کر لو یاد

جو مسلمان رہِ حق میں لڑا لحظہ بھر — روضۂ خلد بریں ہو گیا واجب اس پر

جو رہِ حق میں ہوئے ٹکڑے نہیں مرتے ہیں — بلکہ وہ جیتے ہیں جنت میں خوشی کرتے ہیں

زندگی بھر کے گناہ شہدا مٹتے ہیں — کیوں نہ ہو راہِ خدا ان کے تو سر کٹتے ہیں

فتنۂ قبر و غم صور و قیام محشر — ایسے صد ہول سے شہیدوں کو نہیں کچھ بھی خبر

حق تعالیٰ کو مجاہد وہ بہت بھاتے ہیں — مثل دیوار جو صف باندھ کے جم جاتے ہیں

اے مسلمانو! سنی تم نے جو خوبیٔ جہاد — چلو اب اس کی طرف مت کرو گھر بار کو یاد

مال و اولاد کی جورو کی محبت چھوڑو — رہ مولیٰ میں خوشی ہو کے تن اپنی دوڑو!

مال و اولاد تری قبر میں جانے کے نہیں — تجھ کو دوزخ کی مصیبت سے بچانے کے نہیں

گر رہے جیتے ، تو گھر بار میں پھر آؤ گے — اور گئے مارے تو جنت میں چلے جاؤ گے

ایک دن تجھ سے یہ دنیا کا مزہ چھوٹے گا — لشکرِ موت ترا ملکِ بدن لوٹے گا

دوستو جب تمھیں مرنا ہی مقرر ٹھہرا — پھر تو بہتر ہے کہ جاں دیجیے در راہِ خدا

موت کا وقت معین ہے تو سن اے غافل — پھر بھلا موت سے ڈرنے سے تجھے کیا حاصل

جب تلک موت نہیں ہے تو نہیں مرتے ہیں — موت جب آئی تو گھر میں بھی نہیں بچتے ہیں،

راہِ خدا میں جہاد کے جذبۂ صادق ہی کا یہ ثمرہ تھا کہ سخت سے سخت حالات کو بھی یہ حضرات خوشی اور خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کر لیتے تھے۔ ان کے صبر وقناعت کا ایک واقعہ سنیے! مولوی محمد جعفر صاحب ایک جنگ کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" اس لڑائی کے بعد بوجہ تنگیِ خرچ غازیوں پر سوائے بے نمانمائی کے فاقہ کشی کی سخت تکلیف تھی سردی کا موسم تھا، ملک میں برف پڑ رہی تھی، غازیوں کے پاس نہ رہنے کو مکان تھا نہ اوڑھنے کو کپڑا اور نہ کھانے کو کوئی چیز تھی۔ اکثر چار چار فاقے کر لیتے کے پڑ کر کسی دن کسی گاؤں میں دعوت ہو گئی یا کسی درخت کی پتیاں اُبال کر اور نمک ملا کر بھوک کو دبا دیا، مگر اس پر بھی بوجہِ جوشِ ایمانی ہر ایک غازی نہایت شاداں اور فرحاں اور صابر و شاکر تھا۔

(سوانح احمدی ص ۱۰۴)

مولانا غلام رسول مہر ایک جگہ لکھتے ہیں:

غازیوں کی للٰہیت و اخلاص کا اندازہ شیخ محمد اسحٰق گورکھپوری کے واقعہ سے ہوگا۔ شیخ صاحب کے چھوٹے چھوٹے بچے تھے، ان کے لیے معاش کا کوئی انتظام نہ تھا، لیکن حمیتِ دین کے جوش میں وہ بیوی بچوں کو چھوڑ کر

ید صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ ایک مرتبہ مولانا شاہ اسمٰعیل نے وعظ میں والذین آمنوا اشد حبا للہ۔ کی تفسیر بیان فرمائی۔ شیخ محمد اسحاق مجلس وعظ کے بعد اپنے حجرے کا دروازہ بند کر کے لیٹ گئے۔ کھانے میں بھی شریک نہ ہوئے۔ سید صاحب نے پاس بیٹھ کر کیفیت پوچھی تو صرف اتنا عرض کیا۔ "میری کم نصیبی ہے کہ آپ جیسے شیخ کامل کی صحبت میں بھی گمراہ ہی رہا۔ پھر سید صاحب نے مولانا سے وعظ کا موضوع دریافت کر کے شیخ اسحاق سے بات چیت فرمائی، اس وقت شیخ نے عرض کیا۔ مولانا کے وعظ سے یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ جس دل میں خدا کی محبت ماسوا پر غالب نہ ہو وہ ایمان کی لذت سے محروم ہوتا ہے۔ میرے دل سے بیوی بچوں کا خیال جدا نہیں ہوتا۔ کئی تدبیریں کر چکا ہوں لیکن ناکام رہا۔ اگر ہو سکے تو یہ خیال دل سے نکال دیجیے۔ مولانا نے پوچھا، آیا یہ ممکن ہے کہ بیوی بچوں کی محبت کے جوش میں لشکرِ اسلام کو چھوڑ کر وطن چلے جاؤ؟ شیخ نے کہا یہ ممکن نہیں۔ مولانا نے فرمایا "پھر میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ کے دل میں خدا اور رسول کی محبت بیوی بچوں کی محبت پر غالب ہے۔ اس کے بعد شیخ نے کھانا کھایا۔" (سید احمد شہید جلد دوم ص ۷۶)

ان کی شہادت کا واقعہ بھی شہدا ء بالاکوٹ کے ذکر کے سلسلے میں مہر صاحب نے خاص طور سے بیان کیا ہے، لکھتے ہیں۔

" شیخ محمد اسحاق گورکھپوری کا بایاں ہاتھ جنگ مایار میں بیکار ہو چکا تھا وہ بندوق نہیں چلا سکتے تھے۔ تلوار سے بھی حسب دلخواہ کام نہیں لے سکتے تھے۔

جنگِ بالاکوٹ میں انھیں گنڈاسا دیدیا گیا۔ یورش کے آغاز ہی میں ان کے دائیں ہاتھ پر گولی لگی۔ اور وہ بھی بیکار ہو گیا۔ اس وجہ سے وہ یہ کہتے ہوئے قصبے کی جانب لوٹ پڑے کہ میں تو اب دعا کے قابل رہ گیا ہوں۔ آہستہ آہستہ قصبے میں پہنچے، تو زیادہ خون بہنے سے ان پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔ جب سکھ جنوبی سمت سے بالاکوٹ میں داخل ہوئے تو شیخ غریب اللہ گورکھپوری نے انھیں ساتھ لے جانا چاہا، انھیں ہوش نہ آیا۔ اُٹھا کے لے جانے کی کوئی صورت نہ بنی۔ شیخ غریب اللہ دست بدست کے ملے سے ہو کر باہر نکل گئے۔ شیخ محمد اسحاق وہیں بے ہوش پڑے رہے اور اسی حالت میں شہادت سے سرفراز ہوئے۔" (سید احمد شہید جلد دوم ص ۴۲۶)

ان کے مزید حالات جاننے کے لیے مہرؔ صاحب کی کتاب "جماعت مجاہدین" کا دسواں باب ملاحظہ ہو۔

۵۵ عبدالمجید خاں آفریدی جہاں آباد (ضلع بریلی) کے باشندے تھے۔ مجاہدین کی اس جماعت میں شریک ہو کر سرحد پہنچے جو سید صاحب کے ساتھ گئی تھی اور جسے مجاہدین کا ہراول سمجھنا چاہیے۔ وہاں سب سے پہلی جنگ اکوڑہ خٹک میں پیش آئی۔ چونکہ سکھوں کا لشکر بہت بڑا تھا اور آنے جانے میں پندرہ سولہ میل کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ اس لیے انھی لوگوں کو منتخب کیا گیا۔ جو قوی اور توانا تھے۔ عبدالمجید خان ان دنوں بخار میں مبتلا رہنے کی وجہ سے بہت کمزور ہو گئے تھے، اس لیے ان کا نام فہرست میں شامل نہ کیا گیا۔ انھیں جب یہ کیفیت معلوم ہوئی تو بیتاب ہو کر سید صاحب کی

خدمت میں پہنچے اور عرض کیا:

"حضرت! میں کوئی ایسا بیمار تو ہوں نہیں کہ چلنے کی طاقت نہ ہو۔ اور یہ پہلا معرکہ ہے جس میں جہاد فی سبیل اللہ کی بنیاد رکھی جائے گی، میرا نام ضرور شامل فرمالیجیے تاکہ سبقت کی فضیلت سے محروم نہ رہ جاؤں۔"

عبدالمجید خان کی بیتابی دیکھ کر سید صاحب نے ان کی درخواست قبول کرلی اور دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ ہمت میں برکت دے۔ چنانچہ یہ جنگ میں گئے اور خاصی کمزوری کے باوجود انتہائی مردانگی دکھائی۔ چودہ آدمی ان کے ہاتھ سے قتل ہوئے، پھر ان کی تلوار ٹوٹ گئی، ایک دوسرے مجاہد نے جن کے پاس دو تلواریں تھیں اپنی ایک تلوار ان کو دیدی۔ عبدالمجید خاں نے اس سے بھی کئی دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارا پھر خود بھی جام شہادت نوش کرکے عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ کے انعام یافتہ لوگوں میں شامل ہوگئے۔" (جماعت مجاہدین ص ۲۳۶)

مقام سمہ کے افغانیوں نے چند غلط الزامات اور بے بنیاد بدگمانیوں کی بنا پر خفیہ سازش کرکے ایک رات مجاہدین پر حملہ کردیا اور بہتوں کو ناحق قتل کردیا۔ حدیہ کہ بعض عشاء اور فجر کی نماز کی حالت میں شہید کیے گئے۔ ان کی مظلومانہ شہادت کا حال سن کر ایک دردمند کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے تو مولوی خدا بخش صاحب رامپوری نے (جو ان مجاہدین میں شامل تھے) کہا:

"ما برائے ہمیں شہادت از مقام دور دست آمدہ ایم کسانیکہ شہید شدند بہ مرادِ خود رسیدند، وکسانیکہ باقی اند ہمیں ارادہ دارند، اللہ تعالیٰ امام مارا سلامت دارد

ان شاء اللہ سامانِ جہاد باز مجتمع خواہد گردید۔" (جماعت مجاہدین ص ۴)

(ہم شوقِ شہادت ہی لے کر دور دراز سے یہاں آئے ہیں، جو لوگ شہید ہوئے وہ اپنا مراد کو پہنچ گئے، جو باقی ہیں ان کا ارادہ بھی یہی ہے (کہ راہِ حق میں جانیں دیدیں) اللہ تعالےٰ ہمارے امام کو سلامت رکھے۔ ان شاء اللہ پھر جہاد کا سامان جمع ہو جائے گا۔)

سرسید احمد خاں مرحوم مولانا اسمٰعیل شہید کے حالات میں لکھتے ہیں:

"بموجب ارشاد سید اصفیا یعنی پیر طریق ہدیٰ (سید صاحب) کے اس طرح سے تقریر و وعظ کی بنا ڈالی کہ مسائلِ جہاد فی سبیل اللہ بیشتر بیان ہوئے اور یہاں تک آپ کے صیقلِ تقریر سے مسلمانوں کا آئینۂ باطن مصفا اور مجلا ہو گیا۔ اور اس طرح سے راہِ حق میں سرگرم ہوئے کہ بے اختیار دل چاہنے لگا۔ سر ان کا راہِ خدا میں فدا ہو، اور جان ان کی اعلائے لوائے محمدی میں صرف ہو۔" (جماعت مجاہدین ص ۵۰)

سید صاحب اور مولانا اسمٰعیل کی شہادت کے بعد جب اس تحریک کی قیادت کا بار مولانا ولایت علی عظیم آبادی نے سنبھالا تھا، اس وقت بھی لوگ جوشِ جہاد اور شوقِ شہادت میں برابر مدتِ دراز تک سرحد پار پہنچتے رہے۔ اس وقت سرحد میں ان مجاہدین کا ٹھکانہ ستھانہ میں تھا اور ہندوستان میں ان کا مرکز پٹنہ تھا۔ ڈاکٹر ہنٹر لکھتا ہے:

"صوبہ متحدہ کے ایک انگریز کارخانہ دارِ نیل کا بیان ہے کہ اس کے دیندار مسلمان ملازم اپنی تنخواہ یا مزدوری کا ایک جز ستھانہ کیمپ کے لیے علٰحدہ کر کے رکھ لیتے تھے۔ جو لوگ زیادہ جری تھے وہ تھوڑے بہت

زمانہ کے لیے سجادہ بجا کر خدمت کرتے تھے، جس طرح ہندو ملازم اپنے بزرگوں (سکھوں) کے شرادھ کے لیے چھٹی مانگتے تھے اسی طرح مسلمان ملازم یہ کہہ کر چند ماہ کی رخصت لیتے تھے کہ انھیں فریضۂ جہاد ادا کرنے کے لیے مجاہدین کے ساتھ شریک ہونا ہے۔" (روشن مستقبل ص ۱۰۲)

ان اصحابِ صدق و صفا اور جاں نثارانِ راہِ خدا کے جوشِ جہاد اور شوقِ شہادت کے مزید واقعات (جو ہمارے لیے درسِ حیات ہیں) آئندہ صفحات میں خاص خاص لوگوں کے تذکرے کے ذیل میں انشاء اللہ آئیں گے۔ فی الحال ہم اسی اجمالی تذکرہ پر اکتفا کرتے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر مختصراً اس مسئلہ پر بھی روشنی ڈال دی جائے کہ یہ جوشِ جہاد کس کے خلاف تھا۔

جوشِ جہاد کس کے خلاف؟

سید صاحب اور مولانا اسماعیل شہید کی تحریکِ جہاد کے متعلق بعض علماء کی تحریروں نے یہ غلط فہمی پیدا کر دی ہے کہ وہ صرف سکھوں کے خلاف تھی۔ سید صاحب انگریز سے لڑنا نہیں چاہتے تھے اور نہ انگریزی اقتدار اور تسلط سے ان کو کوئی تشویش اور پریشانی تھی، انگریز کے قبضہ سے اس ملک کو آزاد کرانا سید صاحب کے مقصدِ جہاد میں داخل نہ تھا۔ سکھوں نے پنجاب میں مسلمانوں کی زندگی تنگ کر رکھی تھی، ان پر طرح طرح کے ظلم کرتے تھے، نہ جان محفوظ تھی نہ مال نہ عزت نہ آبرو۔ مسجدوں میں اذان تک نہیں دی جا سکتی تھی۔ ان مظالم کے خلاف سید صاحب اور مولانا شہید نے جہاد کی تحریک شروع کی۔ ان کا اور ان کے رفقاء کا جوشِ جہاد صرف سکھوں کے خلاف تھا۔

اس مسئلہ پر مولانا غلام رسول مہر نے بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ دلائل اور قرائن سے استدلال و استنباط کرنے کے علاوہ خود سید صاحب کے مکتوبات سے واضح الفاظ میں ثابت کیا ہے کہ مذکورہ بالا خیال قطعاً غلط ہے۔ مہر صاحب نے لکھا ہے کہ:

"میں جہاں تک تحقیق کر سکا ہوں سب سے پہلے سر سید احمد خاں مرحوم نے سید صاحب کے جہاد کا رخ انگریزوں سے ہٹا کر سکھوں کی طرف پھیرا۔ لیکن سرسید کا یہ بیان بہت کم لوگوں کی نظروں سے گزرا ہوگا۔ مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری مرحوم نے اسے پھیلا کر پیش کیا۔"

مہر صاحب نے اس خیال کے حامیوں میں تیسرا نام مرزا حیرت دہلوی (مولف حیاتِ طیبہ) کا بتایا ہے۔ "حیاتِ طیبہ" کی بابت مہر صاحب نے اپنا تاثر یہ ظاہر کیا ہے کہ "یہ کتاب تاریخ نہیں بلکہ افسانہ ہے اور سراسر ناقابلِ اعتبار ہے۔"

مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری نے سید صاحب کے متعلق ایک کتاب (تواریخِ عجیبہ معروف بہ سوانح احمدی) لکھی، اس کتاب میں انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سید صاحب انگریزوں سے نہیں لڑنا چاہتے تھے۔ وہ صرف سکھوں سے لڑائی پر آمادہ تھے۔ اس بیان کو مستند بنانے کے لیے سید صاحب کے مکاتیب کی بعض عبارتوں میں تحریف کی گئی۔ مہر صاحب نے سید صاحب کے مکاتیب کے متعدد قلمی نسخوں سے مقابلہ کر کے مولوی محمد جعفر صاحب کی اس لغزش کا پتہ لگایا ہے اور دنیا کو حقیقتِ حال سے روشناس کیا۔ ہمیں مہر صاحب کی اس دادِ تحقیق کا شکر گزار ہونا چاہیے۔

مولوی جعفر صاحب کی اس لغزش پر تعجب ہوتا ہے۔ اس لیے کہ سید صاحب کی شہادت کے بعد وہ خود بھی اس تحریک میں شریک تھے اور اس کی وجہ سے انگریز نے ان کے ساتھ

بڑا سخت برتاؤ کیا تھا۔ اور اس کی پاداش میں ان کو بڑی بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑی تھیں۔ مہر صاحب لکھتے ہیں:

"مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری سید صاحب کے خاص معتقدین سے وابستہ تھے۔ اس وابستگی کے باعث انھوں نے خوفناک تکلیفیں اُٹھائیں۔ گھر بار لٹایا اور کم وبیش اٹھارہ سال کالے پانیوں میں بسر کیے۔ ان کی قربانیوں کے سامنے ہر شخص کی گردن احتراماً جھک جانی چاہیے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں ہوسکتا کہ سید صاحب کے نصب العین کو سمجھنے میں ان سے سخت لغزش سرزد ہوئی۔ اور حد درجہ افسوس اس بات پر ہے کہ اس غلطی کی توثیق کے لیے انھوں نے سید صاحب کی عبارتوں کو بدلا۔"

(سید احمد شہید ص ۲۵۸)

ہمیں مولوی جعفر صاحب کی اس جرأت پر اس اعتبار سے مزید افسوس تھا کہ وہ اہلحدیث تھے۔ جن کے مسلک کی عمارت روایت کے باب میں دیانت وامانت ہی کی بنیاد پر قائم ہے۔ خیر اللہ تعالے کا شکر ہے کہ اس نے اس لغزش کی تحقیق اور اس غلطی کی اصلاح کی توفیق بھی ایک اہلحدیث محقق ہی کو عطا فرمائی۔ فلہ الفضل والمنہ۔

سید صاحب کی وہ تحریریں اور ان کے مکاتیب کی وہ عبارتیں جن سے صاف صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سید صاحب انگریزوں کو مسلمانوں کے لیے سکھوں سے بدرجہا زیادہ خطرناک سمجھتے تھے۔ اسی لیے ہندوستان کو ان کے تسلط سے آزاد کرانے کا وہ عزم رکھتے تھے، مہر صاحب کی "سید احمد شہید" اور "جماعت مجاہدین" میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔ ہم سید صاحب کے ایک مکتوب کا وہ آخری حصہ یہاں نقل کرتے ہیں جس میں انھوں نے تصریحاً ہندوستان

کی تطہیر کا ذکر کیا ہے ۔ لکھتے ہیں :

باز خود ایں جانب مع مجاہدین صادقین بہ سمت بلادِ ہندوستان بنا بر ازالۂ اہلِ کفر و طغیان متوجہ خواہد گشت کہ مقصدِ اصل خود اقامت جہاد بر ہندوستان است ، نہ توطن در دیارِ خراسان ۔	پھر میں مجاہدین کو لے کر ہندوستان کی طرف متوجہ ہو جاؤں گا تاکہ وہاں اہلِ کفر و طغیان کو ختم کیا جا سکے اور میرا اصل مقصود ہندوستان پر جہاد ہے ۔ یہ نہیں کہ خراسان میں توطن اختیار کر لوں ۔

(جماعتِ مجاہدین ص ۱۵)

اس اقتباس میں سید صاحب نے اپنا "اصلی مقصد" ہندوستان پر جہاد کرنا بتایا ہے ۔ اس سے زیادہ واضح شہادت ان کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا نصب العین بتانے کے لیے اور کیا ہو سکتی ہے ؟ اب رہا یہ سوال کہ جب اصلی مقصد ہندوستان کو انگریزی تسلط سے پاک کرنا تھا تو پھر سید صاحب ہندوستان چھوڑ کر سرحد پار کیوں گئے ۔ ؟ اور انگریزوں کے بجائے وہ سکھوں سے کیوں لڑے ؟ اس کا مفصل جواب مہر صاحب کی کتاب "سید احمد شہید" کے بیسویں باب میں موجود ہے ۔ ہم اپنے موضوع کے لحاظ سے اپنی کتاب میں اس عنوان پر گفتگو کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں سمجھ رہے ہیں ۔

•••

چند ممتاز اہلحدیث مجاہدین

مولانا اسمٰعیل شہیدؒ

مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم لکھتے ہیں:

"مولانا ابوالکلام آزاد کو تمام جہادی سرگرمیوں میں مولانا شہید ہی کی روح کارفرما نظر آتی ہے۔ استاذِ محترم مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ سید صاحب اور مولانا شہید دونوں بزرگوں کو تجدید دین کی تحریک کا امام سمجھتے ہیں[1]۔"

دوسری طرف مولانا مسعود عالم نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ

"....مگر خود سید احمد صاحب کی جماعت میں مولانا اسمٰعیل شہید کے اثر سے خالص عاملین بالحدیث کا بھی ایک طبقہ پیدا ہوگیا تھا[2]۔"

جب اس تحریکِ جہاد کی تمام سرگرمیوں میں مولانا شہید ہی کی روح کارفرما تھی

---

[1] ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص ۴۴۔ [2] کتاب مذکور ص ۲۰

اور وہ اس تحریک تجدید دین کے امام تھے تو ظاہر ہے کہ ان کے اثر سے خالص عاملین بالحدیث کا جو طبقہ پیدا ہو گیا تھا وہ سب کا سب اس تحریک میں اپنی جانی یا مالی یا دونوں چیزوں کی قربانیوں کے ساتھ شریک رہا ہوگا۔ لیکن آج ہمارے لیے یہ ناممکن ہے کہ تعیین کے ساتھ ان کی کسی خاص تعداد کی نشاندہی کر سکیں۔ تاریخ میں جن شہداء اور غازیوں کے نام محفوظ رہ گئے ہیں، ان میں سے بھی ہر شہید اور غازی کے متعلق یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ فلاں اہلحدیث تھے اور فلاں حنفی۔ ہاں کچھ ممتاز حضرات ایسے ضرور ہیں جن کا فقہی مسلک معروف ہے یا کسی معتبر شہادت اور روایت و سند کی بنیاد پر ان کے مسلک کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

انھی میں سے چند اہلحدیث مجاہدین کا تذکرہ ہم یہاں لکھنا چاہتے ہیں۔ یہ تذکرہ صرف ان کی مجاہدانہ خدمات پر مشتمل ہوگا ان کی پوری سوانح حیات لکھنا مقصود نہیں ہے مذکورہ بالا نظریے کے پیش نظر سر فہرست حضرت مولانا اسمٰعیل شہید علیہ الرحمہ ہی کا نام نامی و اسم گرامی آ سکتا ہے۔ اس لیے اسی بطل جلیل کے ذکر خیر سے اس عنوان کا آغاز کرتا ہوں۔

دعوت و تبلیغ:

سید احمد صاحب شہیدؒ سے بیعت کے بعد اپنی ساری زندگی احیاء دین اور رد بدعات کے لیے وقف کر دی۔ سہ شنبہ اور جمعہ کو شاہی مسجد میں وعظ فرماتے۔ سر سید لکھتے ہیں کہ نماز جمعہ کے لیے ایسی کثرت ہونے لگی جیسے عیدگاہ میں نماز عیدین کے لیے ہوا کرتی ہے۔ تقریریں ایسی جامع ہوتی تھیں کہ ہر شخص کو اس کے شبہے کا جواب مل جاتا تھا۔ اور سادگی کا یہ عالم تھا عالم و عامی یکساں مستفید ہوتے تھے۔

کچھ مدت کے بعد سید صاحب کے ایماء سے وعظ و تقریر میں جہاد فی سبیل اللہ کے مسائل بیان فرمانے لگے۔ سید کے الفاظ میں مسلمانوں کا آئینۂ باطن مصفا اور مجلی ہوگیا۔ اور راہ حق میں اس طرح سرگرم ہوئے کہ ہر شخص بے اختیار چاہنے لگا اس کا سر فی سبیل اللہ فدا ہو، اور اس کی جان دین محمدی کا علم بلند کرنے کے سلسلے میں کام آئے ان کے مواعظ سے ہزاروں لوگ تائب ہوئے۔ ان میں زنان بازاری بھی تھیں۔ ایک مرتبہ ایام محرم میں قلعے کے اندر بلائے گئے اکبر شاہ ثانی بادشاہ بھی مجلس میں شریک تھا۔ شاہ صاحب نے ایک آیت پڑھ کر حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے مراتب صبر ایسے انداز میں بیان کیا کہ اسوۂ حسینی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ گیا۔ فرمایا کرتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان شرک و بدعات کے بلائے سخت میں مبتلا ہیں۔ [1]

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم فرماتے ہیں۔

"دعوت و اصلاح امت کے جو بھید پرانی دہلی کے کھنڈروں اور کوٹلہ کے حجروں میں (شاہ ولی اللہ نے) دفن کردیے تھے، اب اس سلطان وقت و اسکندر عزم (شاہ اسمٰعیل شہیدؒ) کی بدولت شاہجہان آباد کے بازاروں اور جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ان کا ہنگامہ مچ گیا، اور ہندوستان کے کناروں سے بھی گزر کر نہیں معلوم کہاں تک چرچے اور افسانے پھیل گئے۔ جن باتوں کے کہنے کی بڑوں بڑوں کو بند حجروں کے اندر بھی تاب نہ تھی وہ اب برسر بازار کہی جارہی اور ہورہی تھیں اور خون شہادت کے چھینٹے حروف و حکایات کو نقوش

---

[1] جماعت مجاہدین ص ۱۲۱، ۱۲۲

وسواد بنا کر صفحۂ عالم پر ثبت کر رہے تھے ۔ ؎

آخر تو لائیں گے کوئی آفت فغاں سے ہم
حجت تمام کرتے ہیں آج آسماں سے ہم

(تذکرہ ص ۲۴۵)

کارنامہائے جہاد :

۷ ر جمادی الاخری ۱۲۴۱ھ / ۱۷ ر جنوری ۱۸۲۶ء دوشنبہ کو رائے بریلی سے سید صاحب کے ساتھ راہ ہجرت میں قدم رکھا اور وطن عزیز سے سینکڑوں میل کے فاصلے پر ایک غیر معروف گوشے میں شہادت پائی ۔ ان کی اور سید صاحب کی شہادت کے باعث ہمیشہ کی ناموری حاصل ہوئی ۔

دوران جہاد میں ان کے کارنامے "سید احمد شہید" کے صفحات پر تفصیلاً بیان ہو چکے ہیں ۔ ان کے اعادے کی ضرورت نہیں ۔ اجمالاً ان کی کیفیت ذیل میں درج ہے ۔

(۱) وہ تمام انتظامات میں سید صاحب کے مشیر خاص تھے ۔

(۲) سید صاحب کے لیے امامت جہاد کا پورا بندوبست انھی نے کیا تھا ۔

(۳) جنگ شیدو میں جان پر کھیل کر سید صاحب کو محفوظ مقام پر پہنچایا ۔

(۴) ہزارہ میں جہاد کی ابتدائی تنظیمات انھی نے کیں ۔

(۵) جنگ شنکیاری میں تھوڑی سی جمعیت سے سکھوں کے بہت بڑے لشکر کو شکست دی ۔ سکھوں کی گولیوں سے شاہ صاحب کی قبا چھلنی ہو گئی ۔ لیکن آپ

میدان سے ہٹے، نہ مورچے میں پناہ لی اور نہ جنگ روکی۔ اسی لڑائی میں شاہ صاحب کی ایک انگلی (جو چھنگلی تھی) زخمی ہوئی ہے جسے دکھا کر مزاحاً فرمایا کرتے تھے کہ یہ ہماری انگشتِ شہادت ہے۔

(۶) بیعتِ شریعت کے سلسلے میں علمائے سرحد سے تمام گفتگوئیں شاہ صاحب ہی نے کی تھیں۔

(۷) ہنڈ کا مضبوط و مستحکم قلعہ چھوٹی سی فوج کے ساتھ فتح کر لیا اور دشمن کے صرف دو آدمی مارے گئے۔ اپنے کسی آدمی کے خراش تک نہ آئی۔

(۸) جنگ زیدہ میں صرف سات سو مجاہدین سے درّانیوں کی آٹھ دس ہزار فوج کو شکستِ فاش دی۔

(۹) مایار کی جنگ میں درانی فوج بارہ ہزار سے کم نہ تھی اور مجاہدین صرف ساڑھے تین ہزار تھے۔ جنمیں بڑی تعداد ملکیوں کی تھی۔ تاہم درّانی مقابلے پر ٹھہر نہ سکے۔

(۱۰) امب و عشرہ کی لڑائیاں شاہ صاحب کے کمالِ سپہ گری کا ایک روشن ثبوت ہیں۔

(۱۱) انتظامِ عشر کے سلسلے میں وہ سید محمد حبان قاضی القضاۃ کے مشیرِ خاص تھے۔ اور جنگ مردان میں انھی کے حسنِ تدبیر سے فتح حاصل ہوئی۔

(۱۲) پشاور میں صلح کی تمام گفتگوئیں سید صاحب کی طرف سے شاہ صاحب ہی نے کی تھیں، غرض وہ سید صاحب کی پوری تحریکِ جہاد میں اول سے آخر تک روحِ رواں بنے رہے۔

(جماعتِ مجاہدین ص ۱۲۳، ۱۲۴)

مولانا شہیدؒ کی شجاعت کا رعب :

شاہ صاحب کے رعب اور ہیبت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ کوئی درانی سپاہی کسی خاتون کا مال چھیننا چاہتا تھا۔ خاتون نے شاہ صاحب کا نام لیا تو سپاہی سب کچھ چھوڑ کر بھاگ نکلا۔

جنگ مایار ناگزیر ہوگئی تو سید صاحب نے شاہ صاحب کو بھی امب سے بلایا۔ منشی محمدی انصاری نے بلاوے کے خط میں اپنی طرف سے لکھ بھیجا کہ اپنی تشریف آوری کی خبر کو شہرت دیجیے۔ اس لیے کہ آپ کی شجاعت اس علاقے کے خاص و عام پر روشن ہے۔ کیا عجب دشمن آپ کا نام سن کر مرعوب ہو جائیں اور اس طرح مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے۔ (جماعت مجاہدین ص ۱۲۶)

مولانا گیلانی کا ایک مضمون :

مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم کا ایک طویل مضمون ماہنامہ "الفرقان" بریلی کے "ولی اللہ نمبر" (۱۳۵۹ھ/ ۱۹۴۰ء) میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں مولانا گیلانی نے حضرت شاہ عبد العزیز قدس اللہ سرہ العزیز کی ایک عربی نظم نقل کی ہے۔ جس میں حضرت شاہ صاحب نے اپنے زمانے کے سکھا اور مرہٹہ مظالم کا ذکر دردناک الفاظ میں کیا ہے۔ اس نظم کے متعلق مولانا گیلانی لکھتے ہیں :

"لیکن منجملہ اور چیزوں کے حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے یہ چند اشعار بھی اپنے اندر اس کی قوی شہادت رکھتے ہیں کہ "اسلامی ایوان"

میں عہد عالمگیری کے بعد جو آگ لگی تھی اس میں جن جن کے کلیجے پھنکے تھے اور جن جن کے سینے آبلوں سے معمور ہو گئے اس میں حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا بھی خاندان تھا۔ اور شاید یہی آبلے تھے جو "اسمٰعیلی" کے رنگ میں پھوٹ کر بالآخر بہ گئے۔

مولانا آزاد کا تاثر :

حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی مجاہدانہ سرگرمیوں کی نسبت مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم نے اپنا تاثر مندرجہ ذیل الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔ فرماتے ہیں :

"اور پھر چند قدم اور آگے بڑھو، مقام عزیمت و دعوت کی کیسی کامل اور آشکارا مثال سامنے آتی ہے۔ ساری مثالوں سے آنکھیں بند کر لو۔ صرف یہی ایک مثال زیر بحث حقیقت کے فہم و کشف کے لیے کافی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کا مقام ہر رنگ میں کس درجہ جامع اور کامل ہے۔"

بایں ہمہ یہاں جو کچھ ہوا، تجدید و تدوین علوم و معارف اور تعلیم و تربیت اصحاب استعداد تک محدود رہا۔ اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ فعلاً عمل و نفاذ اور ظہور و شیوع کا پورا کام تو کسی دوسرے ہی مرد میدان کا منتظر تھا۔ اور معلوم ہے کہ توفیق الٰہی نے یہ معاملہ صرف حضرت علامہ و مجدد شہید رضی اللہ عنہ کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ خود حضرت شاہ صاحب کا بھی اس میں حصہ نہ تھا :

می خواست رستخیز زعالم بر آورد   اں باغباں کہ تربیت ایں نہاں کرد

اگر خود شاہ صاحب بھی اس وقت ہوتے تو انھی کے جھنڈے کے پیچھے نظر آتے۔"

سلسلۂ بیان جاری رکھتے ہوئے مولانا آزاد آگے لکھتے ہیں۔

"پھر کیا اُس وقت ہندوستان علم وعمل سے خالی ہوگیا تھا؟ یا حق پر چلنے والے اور حق کا درد رکھنے والے معدوم ہوگئے تھے؟ کون ہے جو ایسا کہہ سکتا ہے؟ خود اُنکی خاندان عالی میں کیسے کیسے اکابر و اساتذۂ علم وعمل موجود تھے؟ حضرت شاہ عبدالعزیز کے درس و تدریس کی پادشاہت سمرقند و بخارا اور مصر و شام تک پھیلی ہوئی تھی۔ شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین علم وعمل کے آفتاب تھے۔ خاندان سے باہر اگر ان کے تربیت یافتوں کو دیکھا جائے تو کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جہاں ان کا فیضان علم کام نہ کر رہا ہو۔ بایں ہمہ یہ کیا معاملہ ہے کہ وہ جو وقت کا سب سے بڑا کام تھا اس کے لیے کسی کے قدم کو جنبش نہ ہوئی، سب دوسرے دوسرے کاموں میں رہ گئے۔ یا حجروں کا کام یا مدرسوں کا۔ لیکن میدان والا معاملہ، کسی سے بھی بن نہ آیا۔ وہ گویا ایک خاص پہناوا تھا جو صرف ایک ہی جسم کے لیے تھا اور ایک ہی پر چست آیا۔ دنیا اس کے لیے خلعت عظمت اور تشریف قبول کاندھے پر ڈالے منتظر کھڑی تھی۔ زمانہ اپنے سارے زمانوں کے ساتھ کب سے اس کی راہ تک رہا تھا۔ امیدواروں پر امیدوار یکے بعد دیگرے گزرتے رہے، مگر اس کا مستحق کوئی نہ نکلا۔

بارِ غم او عرض بہر کس کہ نمودم
عاجز شد و ایں قرعہ بنامم زسر افتاد ،
(تذکرہ ص ۲۴۴، ۲۴۵)

شہادت :

کم و بیش چھ سال تک سید احمد شہید اور مولانا اسمٰعیل شہید نے اپنے جاں نثار رفیقوں کے ساتھ راہِ حق میں جان و مال کی قربانیاں پیش کیں۔ کامیابی و کامرانی ان کے ہم رکاب تھی، ظفر مندی قدم لینے کو آگے بڑھی، قریب تھا کہ سارا پنجاب و سرحد اسلامی نور سے جگمگانے لگتا اور ایک مرتبہ پھر خلافتِ راشدہ کا عملی نمونہ دنیا کے سامنے آجاتا۔ مگر ابھی مسلمانوں کے بُرے دن لکھے تھے۔ برا ہو نسلی غرور اور قبائلی عصبیت کا، جس نے اس تمام کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ افغانی سرداروں نے غداری کی۔ کچھ فتنہ پردازوں نے حنفیت اور وہابیت کا جھگڑا کھڑا کر دیا۔ علماء سوء اور قبر پرستوں نے مجاہدین پر کفر کے فتوے لگائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ضلع ہزارہ کے کوہستانی علاقے کے ایک مشہور مقام بالاکوٹ میں سید صاحب رح اور مولانا اسمٰعیل رح صاحب دونوں بزرگوں نے سکھوں سے مقابلہ کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش فرمایا۔

اس جنگ میں مولانا اسمٰعیل کی حالت ہی دوسری تھی۔ برسوں کے ارمان نکلنے کا وقت آیا۔ اپنی مردانگی، شجاعت اور حرارتِ ایمانی کے جوہر دکھلائے۔ ایک غازی کا بیان ہے کہ مولانا کے سر پر ایک گولی لگی تھی، اس سے اگرچہ خفیف زخم آیا لیکن داڑھی خون سے رنگ گئی۔ پھر آپ ننگے سر امان اللہ خاں (غازی) سے ملے، بندوق بھری ہوئی تھی اور بلبلی

پڑھی ہوئی تھی ۔ پوچھا ، امیر المومنین کہاں ہیں ؟ امان اللہ خاں نے "مٹی کوٹ" کی طرف اشارہ کیا ۔ ادھر سے بکثرت گولیاں آرہی تھیں لیکن یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ بھائی میں تو وہیں جاتا ہوں ۔ پھر معلوم نہ ہو سکا کہ کس طریقے سے شہادت ہوئی ۔

ایک دوسرے نمازی نے بیان کیا کہ میرے بائیں طرف سے مولانا اسمٰعیل رائفل کندھے پر ڈالے اور ننگی تلوار ہاتھ میں لیے میرے پاس آئے ، پیشانی سے خون بہہ رہا تھا ۔ پوچھا ، امیر المومنین کہاں ہیں ؟ میں نے اپنے داہنے طرف ہاتھ سے اشارہ کیا کہ اس ہجوم میں ہیں ۔ یہ سن کر وہ اس طرف جھپٹتے ہوئے چلے گئے ۔

تیسرے نمازی کا کہنا ہے کہ سر سے خون جاری تھا ۔ یہ معلوم نہیں کہ گولی پیشانی پر لگی تھی یا کنپٹی پر ۔ ہجوم میں جاکر دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہید ہو گئے ۔

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت ، نہ کشور کشائی !

(سید احمد شہید جلد دوم ص ۴۲۱ ، ۴۲۲)

۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۶ مئی ۱۸۳۱ء یوم جمعہ کو گیارہ بجے دن میں یہ سانحہ پیش آیا ۔

قصیدہ

در فضائل سبر نبیل مولانا محمد اسماعیلؒ

یہ قصیدہ مولوی محمد حسین صاحب متخلص بہ فقیر نے لکھا تھا ۔ قصیدہ بہت لمبا تھا

اس میں سے مولانا غلام رسول مہر نے صرف وہ اشعار چن کر، جو شاہ شہید کے فضائل سے متعلق تھے۔ "جماعت مجاہدین" کے آخر میں شائع کیے ہیں۔ ہم اس میں مزید اختصار کر کے کچھ اشعار یہاں نقل کرتے ہیں۔

جو اشعار مہر صاحب نے منتخب کیے ہیں، ان میں شاعر موصوف نے پہلے یہ بتایا ہے کہ مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ تفسیر، حدیث، فقہ، نحو، صرف، منطق، فلسفہ ریاضی وغیرہ جملہ علوم و فنون میں تبحر اور کمال رکھتے تھے۔ اس کے بعد لکھا ہے:

واعظ ایسے تھے کہ کیا ان کے بیاں کا ہو بیاں
سننے والوں کو عجب ہوتی تھی رغبت ہیبت

جب حدیثِ نبوی کا وہ بیاں کرتے تھے
ہوتا تھا خلق سے معدوم حدوثِ بدعت

ذکرِ دوزخ کا جو آتا تو جلا دیتی تھی
آتشِ خوفِ خدا پنبۂ خوابِ غفلت

اور جنّت کا بھی کچھ ذکر جو آجاتا تھا
سُن کے کفار بھی اسلام کی کرتے رغبت!

اور جو کرتے کبھی ہولِ قیامت کا بیاں
مجلسِ وعظ کی ہو جاتی تھی ایسی صورت

ایک کو دوسرے کی کچھ نہ خبر رہتی تھی
اس قدر ہوتی تھی ہر ایک کے دل کو دہشت

سر کے نزدیک جو وہ شمس ہدیٰ ہوتا تھا
شرمِ افعال سے ہوتی تھی عرق کی شدّت

توبہ توبہ مری یارب، یہ ہر اک کہتا تھا
اس قدر ہوتی تھی واں ہیبت ربّ العزّت

سر کو سجدے میں جھکا دیتے ہی بن پڑتی تھی
بے نمازوں کی بدل جاتی تھی ایسی حالت!

فرض جن سے نہ ادا ہوتا تھا، وہ صورتِ فرض
کرتے نفلیں بھی ادا کرنے میں اپنی نیّت

اکل و شرب اپنا فراموش وہ کر دیتے تھے
روزہ خوروں کو تھی اس وعظ کی اتنی ہیبت

پھر تو عیدین سے تشریق سے لاچار تھے وہ
سال بھر روزے کی تھی ان کو وگرنہ رغبت

جو نہ دیتے تھے زکوٰۃ ان کا یہ ہوتا تھا حال
صرف کل مال میں کرتے تھے وہ صرفِ ہمت

عیش میں گھر سے بھی تھا جن کو نکلنا مشکل
سفرِ حج کی پیادہ ہوئی ان کو رغبت

ہو گئے سیکڑوں زانی بھی زنا سے تائب
اور میخوار بھی توبہ سے ہوئے پاک صفت

زانیہ عورتیں بھی ان کی نصیحت سُن کر
باندھتی تھیں کسو دیندار سے عقدِ حلّت
ہے یہ مشہور کہ دہلی میں وہ اک روز کہیں
اک زنِ فاحشہ کے در پہ گئے باعزّت
اس کو کچھ ذکرِ قیامت جو سنایا تو درہیں
وہ بھی تائب ہوئی اور اس کی جو تھیں ہم صحبت
اور ان سب کے دیئے باندھ اسی لحظہ نکاح
اللہ اللہ یہ تھی ان کے بیاں کی ہیبت
اور دہلی ہی کی مسجد میں یہ مشہور ہے بات
حوض تک رہتا تھا بازار لگا بے دہشت
خیر کی جائے کو کر ڈالا تھا اک موقعِ شر
اس قدر شر میں تھی اہلِ ہوا کی کثرت
بہ طفیل ان کے وہاں سے یہ بلا دور ہوئی
موضعِ خیر میں افزوں ہوئی بس خیریت!
مسجدیں سیکڑوں آباد ہوئیں ان کے سبب
مرد و زن لاکھوں نمازی ہوئے صافی طینت
گریہ طفل کو سنتی ہی نہ تھی مادرِ طفل،
اس زمانے کی نمازوں میں یہ تھی محویّت!

ہر نمازی کو ہوا شوقِ تہجد ایسا
بسترِ خار بنا بسترِ خوابِ راحت

خوابِ شیرینِ سحر کا نہ مزہ تھا ان کو
طاعتِ حق میں انھیں آتی تھی کیا کیا لذّت

ہر جگہ دینِ محمد کا رواج ان سے ہوا
ظلمتِ دہر میں روشن ہوا نورِ سنت

دیکھو دشوار تھا کیا کچھ زنِ بیوہ کا نکاح
وہ بھی آسان ہوا ان سے علیہ الرحمت

ورنہ اس ہندِ پر آفات میں اہلِ اسلام
عار اس کام سے رکھتے تھے . برہمن کی صفت

شکر لاکھوں تری رحمت کے خدایا کہ یہاں
بہ طفیل ان کے ادا ہونے لگی یہ سنّت !

اک جگہ سنتے ہیں فرماتے تھے مولانا وعظ
پیر زن ایک ہوئی سن کے غضبناک بہت

اور کہنے لگی یہ مولوی ایسا آیا بھر سے
اس نے رانڈوں سے تو اے لوگو بھی کھو دیے ست

دانۂ[1] بیوی کا جو کھاتے تھے وہ محروم ہوئے
کیوں کہ ہر رانڈ ہوئی اب تو دو خصمی عورت !

---

[1] ۔ یہاں بیوی سے اشارہ حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کی طرف ہے جن کے متعلق عقیدہ یہ تھا کہ ان کے نام سے جس کھانے پر نیاز کی جائے اس کو وہی عورت کھا سکتی ہے جس نے دوسری شادی نہ کی ہو ۔ ۱۲

اس کو نرمی سے یہ سمجھایا نہ کیجیے غصہ
مجھ کو کہنے میں نہیں اپنی طرف سے جرأت

بلکہ فرماتے ہیں یوں بیوی کے باوا صاحب
میں جو کہتا ہوں یہ سب کچھ ہے پیامِ حضرت

اور سب چھوٹ گئیں آپ کے سمجھانے سے
رسم بد شادیوں کی اور غمی کی بدعت!

اور مہاجر بھی وہ ایسے تھے کہ سبحان اللہ!
ما نہیٰ اللہ سے تھی ان کو ہمیشہ ہجرت

ظاہراً مال سے، اولاد سے، گھر سے ان کو
اس قدر عشقِ الٰہی میں ہوئی تھی نفرت

سب دیا چھوڑ مگر ہاتھ سے چھوڑا نہ کبھی
رشتۂ ہجرتِ فی اللہ، بل بے ہمت

غازی ایسے تھے کہ کیا ان کے غزا کا ہو بیاں
آبِ شمشیر کو پیتے تھے وہ مثلِ شربت

ان کی شمشیر کا زہراب پلا دیتا تھا
فوجِ کفار کے دریا میں عجب سمیت

یہ سنا ہوگا کہ سکھوں کو بہت قتل کیا
سکھ سے پھر رہ نہ سکے، سکھ ہوئے لیے غارت

مال سے ملک سے اور جاہ سے کچھ کام نہ تھا
تھا تو یہ کام تھا، عالی ہو یہ دین و ملّت،

راہِ مولیٰ میں بھی قربان ہوئے واہ نصیب
اور حیاتِ ابدی پائی علیہ الرحمت

جو بُرا کہتے ہیں ایسوں کو، بُرا کرتے ہیں
عیب اپنے ہی بیاں کرتے ہیں وہ بد طینت

ظاہراً بے ادبی ہے یہ کلام حق کی
ایسے حافظ کو بُرا کہتے ہیں جو بد خصلت

ایسے عالم کی مذمّت جو کیا کرتے ہیں!
مثلِ جاہل ہیں اگرچہ انھیں ہو علمیّت

•••

مولانا سیّد حیدر علی رامپوری

یہ مولانا سید محمد علی رام پوری کے بھائی تھے۔ مولانا محمد علی کا تذکرہ آگے آرہا ہے۔ سید صاحب شہید نے اپنے خاص آدمی مختلف ہندوستانی علاقوں میں دعوت دین کے لیے مقرر فرمائے تھے جو عقائد و اعمال کی اصلاح کے ساتھ ساتھ سید صاحب کی تحریکِ جہاد

کے لیے روپے کی فراہمی کے علاوہ نمازیوں کو تیار کرتے تھے۔ انھی خاص داعیوں اور خلفاء میں سے یہ دونوں بھائی بھی تھے۔ [1]

مولانا سید حیدر علی شاہ رفیع الدین صاحبؒ دہلوی اور شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ کے شاگرد تھے، مولانا ابوالحسن علی ان کی شان میں لکھتے ہیں۔

"ذکاوت، سرعت ادراک، جامعیت معقول ومنقول، کتاب وسنّت اور اختلافِ ائمہ سے واقفیت، تبحرِ علمی میں سرآمد روزگار اور علوم حکمیہ میں بحرِ ذخّار تھے۔" [2]

نواب احمد علی خاں فرمانروائے رام پور نے انھی کے ہاتھ پر نیابتہً بیعتِ جہاد کی تھی جیسا کہ نواب صاحب نے اپنے ایک مکتوب میں اس کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے سید صاحب شہید کو اس وقت لکھا تھا جب سید صاحب سرحد پار چلے گئے تھے۔ نواب صاحب مذکور لکھتے ہیں:

چونکہ جہاد فی سبیل اللہ مثل صلوٰۃ وصیام برکافۂ انام ایں ملت ازجملہ فرائض موکدہ اسلام است بناءً علیہ درظہر الغیب مطابق سنت سید المرسلین علیہ وآلہ الف الف صلوٰۃ رب العالمین بردست مولوی حیدر علی صاحب کہ خلیفۂ آنجناب است آنحضرت

چونکہ خدا کی راہ میں جہاد، نماز اور روزے کی طرح ملت اسلامیہ کے تمام افراد پر فرض ہے اس لیے میں نے سید المرسلین (ان پر اور ان کی آل پر رب العلمین کی طرف سے ہزار ہزار درود و سلام ہوں۔) کی سنت کے مطابق غائبانہ مولوی حیدر علی صاحب کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد

---

[1] سید احمد شہید ج اول ص ۳۶۶ اور "جماعتِ مجاہدین"، ص ۲۹۱ [2] سیرت سید احمد شہیدؒ ۳۳۲

بیعت بر جہاد نمودم و خود را بایں وسیلہ جمیلہ	کرلیا ہے۔ جو آپ کے خلیفہ ہیں۔ اس وسیلہ سے
در زمرۂ مجاہدین فی سبیل اللہ داخل نمودم	میں مجاہدین فی سبیل اللہ کے گروہ میں شامل
کہ در وقت مناسب بہ سر و چشم حاضرم	ہو گیا ہوں۔ مناسب وقت پر بسر و چشم حاضر
از دوست یک اشارہ و ز ما بہ سر دویدن	ہو جاؤں گا۔ دوست کی طرف سے اشارہ ہوتے
	ہی سر کے بل دوڑیں گے۔
. . . .	. . . . . .
و آنحضرت دعا فرمانید کہ مالکِ حقیقی ایں	آپ بھی دعا فرمائیں کہ مالکِ حقیقی ہمارے اس
عزیمتِ ما را بہ انجام رساند۔ "	ارادے کو پورا کرے۔

(جماعتِ مجاہدین ص ۲۶۷)

والاجاہ نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم نے مولانا سید حیدر علی کے متعلق لکھا ہے: "وکان یذب عن اسماعیل الشہید"[1] (اسماعیل شہید کی حمایت کرتے تھے اور ان پر اعتراض کرنے والوں کا جواب دیتے تھے) نواب صاحب نے "الیانع الجنی" کے مصنف کا یہ قول نقل کیا ہے: "ولہ مع شیخنا ابی العلاء الفضل بن الفضل الخیرآبادی مباحثات فی شان اسمٰعیل یحویھا بطون مولفاتھا بدأت منہ عند البحث بوادر رواھا العلماء توفی فی المحرم مستھل عام القرطاس انتھی" (انھوں نے ہمارے شیخ ابو العلاء فضل امام ابن فضل حق خیر آبادی کے ساتھ اسمٰعیل کے بارے میں کئی مباحثے کیے جیسا کہ ان دونوں کی کتابیں شاہد ہیں اور بحث کے وقت ان کے قلم سے ایسی باتیں سرزد ہوئیں جن کی کمزوری

---

[1] ابجد العلوم ص ۹۱۶)

علماء نے ظاہر کی ہے۔ نواب صاحب ان مباحثوں کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: قلت والحق ان الحق فی تلك المباحث بید السید لا بید الشیخ کما یظھر من الرجوع الی کتبھما عند نظر الانصاف (میں کہتا ہوں کہ ان مباحث میں سید (حیدر علی) ہی حق پر تھے نہ کہ شیخ (فضل امام) جیسا کہ ان دونوں حضرات کی تصانیف پر نظر انصاف ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے۔)

نواب صاحب یہ بھی لکھتے ہیں: وقد کتب علی بعض کتبی لی تقریظا حسنا وبالغ فیه الثناء علیّ بما لست اھلا له انتھی (مولانا حیدر علی نے میری بعض کتابوں پر تقریظ لکھی ہے۔ جس میں میری تعریف میں ایسا مبالغہ کیا ہے، جس کا میں اہل نہیں ہوں) دوسری جگہ لکھتے۔ له تقریظا علی رسالتنا المسماة بکلمة الحق فی رد عمل المولد[1] (انھوں نے میرے رسالہ "کلمہ حق" پر تقریظ لکھی ہے۔ یہ رسالہ میلاد مروج کی تردید میں ہے۔ نواب صاحب ہی لکھتے ہیں: ومن مؤلفاته صیانة الاناس عن وسوسة الخناس بالھندیة ورسالة فی اثبات رفع الیدین فی المواضع الاربعة من الصلاة حررھا ردًا علی المولوی محبوب علی الدھلوی بالفارسیة وکان یدرس وینفع الناس انتھی[2]

(مولانا سید حیدر علی کی تالیفات میں سے ایک رسالہ "صیانۃ الاناس من وسوسۃ الخناس" اردو زبان میں ہے اور ایک رسالہ فارسی زبان میں ہے جس میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ نماز میں چار جگہوں میں رفع یدین کرنا سنت ہے۔ یہ رسالہ مولوی محبوب علی دہلوی

---

[1] ابجد العلوم ص ۹۲۷۔ [2] ابجد العلوم ۱۲

(عنفی) کے جواب میں لکھا ہے۔ "صیانۃ الاناس" میں لکھتے ہیں:

"ایک شخص معین کی تقلید پر اگر کوئی دلیل ادلہ شرعیہ اربعہ سے ہو تو لاؤ ذکر کرو۔ جو شخص تقلید ایک شخص کی لازم اور واجب کہتا ہے وہ غلط کہتا ہے"۔[1]

نواب احمد علی خاں فرمانروائے رام پور کے آخری زمانے میں رام پور سے ٹونک پہنچ گئے۔ وہاں نواب وزیرالدولہ نے انھیں عہدۂ دیوانی پر مامور فرمایا۔ اس عہدے کے فرائض انجام دینے کے علاوہ درس بھی دیتے تھے اور طبابت بھی کرتے تھے۔ ۱۶ / ذی الحجہ ۱۲۷۲ھ / ۱۸ / اگست ۱۸۵۶ء کو ٹونک میں وفات پائی۔[2] آخر زمانے میں ٹونک میں اقامت کر لینے کی وجہ سے بعض لوگوں نے ان کو "ٹونکی" بھی لکھا ہے۔[3]

مولانا سید محمد علی رامپوری رح

یہ مولانا سید حیدر علی (مذکور) کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کے متعلق مہر صاحب لکھتے ہیں:

---

[1] معارق الحدید از حافظ عزیزالدین مراد آبادی ص ۴۱ [2] جماعت مجاہدین ص ۲۹۶

[3] سیرت والا جاہی حصہ دوم ص ۶

" معلوم نہیں سید محمد علی نے کس زمانے میں بیعت کی۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ وہ مجاہدین کا قافلہ لے کر ابتدائی دور ہی میں سرحد پہنچ گئے تھے۔ جس زمانے میں سید محبوب علی[1] دہلوی کی مراجعت کے باعث قافلوں کی آمد رک

---

[1] سید صاحب شہید کی تحریک جہاد کا جب ہندوستان میں چرچا ہوا اور مختلف حضرات کی سرکردگی میں مجاہدین کے قافلے سرحد پار پہنچنے لگے تو مولوی محبوب علی صاحب دہلوی بھی ایک قافلہ لے کر سرحد پہنچے۔ مگر راستے کی تکلیفوں سے اس قدر پریشان ہوئے کہ واپسی کا قصد کرلیا۔ دوسرے مجاہدین سے بھی کہنا شروع کر دیا کہ واپس چلو اور اقربا کے جو حقوق تمہارے ذمہ ہیں انھیں ادا کرو۔ مولانا شاہ اسماعیل شہید اس زمانے میں پکھلی گئے ہوئے تھے۔ انھیں یہ حالات معلوم ہوئے تو متواتر خط لکھتے رہے کہ مولوی صاحب کو میری واپسی تک روکا جائے۔ لیکن شاہ صاحب کی تشریف آوری سے تین روز قبل مولوی محبوب علی صاحب کسی کو اطلاع دیے بغیر رات کے وقت اچانک پشاور روانہ ہو گئے، اور وہاں سے بخیر و عافیت دہلی پہنچ گئے۔ دہلی پہنچکر اپنی واپسی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے انتظامات جہاد کی بابت لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلانے لگے اس کی وجہ سے مختلف حلقوں میں بددلی اور افسردگی پیدا ہوئی اور دیر تک قافلوں کی آمد رکی رہی۔

اسی زمانے میں سید صاحب نے مولانا سید محمد علی وغیرہ کو ہندوستان بھیجا تھا۔ چنانچہ ان داعیوں اور خصوصاً شاہ اسحاق صاحب اور شاہ یعقوب صاحب کی کوششوں سے جب غلط فہمیوں کے بادل چھٹے تو پھر ہندوستان سے امداد جانے لگی اور قافلے پہنچنے لگے۔

یہی مولوی محبوب علی دہلوی ہیں جن کے رد میں مولانا سید حیدر علی صاحب رام پوری نے رسالہ "اثبات رفع الیدین" لکھا تھا۔ یہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے تک زندہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کو انھوں نے "جہاد" کا فتویٰ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے صلہ میں ←

گئی تھی اس زمانے میں جن اصحاب کو بہ غرض دعوت و تبلیغ ہندوستان بھیجا گیا ان میں سید محمد علی بھی تھے۔ [1]

"وقائع احمدی" میں ان کے ارسال کی کیفیت یوں بیان ہوئی ہے۔

"مولوی محمد علی رام پوری کو حضرت علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ تم طرف حیدرآباد دکن کے جاؤ، انھوں نے عذر کیا کہ مجھ کو نہ اس قدر علم ہے کہ کسی عالم سے مباحثہ یا مناظرہ کروں، اور نہ یہ سلیقہ ہے کہ لوگوں کے انبوہ میں وعظ و درس کہوں۔ مجھ کو تو آپ کسی کام کو وہیں بھیجیں کہ وہ کام کر کے چلا آؤں۔ آپ نے فرمایا کہ خیر۔ جس بات کا عذر کرتے ہو اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ عذر دور کر دے۔ پھر آپ نے اپنا کرتا اور پاجامہ اور تاج (ٹوپی) ان کو پہنایا... چار پانچ آدمی ان کے ہمراہ کیے۔ ان میں ایک نعیم خاں رامپوری تھے اور دوسرے عنایت اللہ خاں تنالی والے اور تیسرے عبداللہ کراٹھی

← انگریز نے ان کو گیارہ گاؤں معافی میں دینا چاہا، مولوی صاحب نے پروانۂ معافی لے کر چاک کر ڈالا اور کہا کہ میں نے تمھارے لیے کچھ نہیں کیا تھا میرے نزدیک مسلم یوں ہی تھا۔" اس روایت کا اصل ماخذ "ارواح ثلاثہ" ہے۔ اس سے پہلے کی کسی معتبر تاریخ میں اس روایت کا ذکر مجھے نہیں ملا۔ بعض اصحاب نے اس انعام کو میدانِ جہاد سے واپسی اور واپسی کے بعد اس تحریک کی مخالفت کا صلہ ظاہر کیا ہے۔ انعام کی پیش کش والی بات کی صحت کی تقدیر پر یہی وجہ قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اس وقت تک تحریکِ جہاد کا رخ براہ راست انگریز کے خلاف ہو گیا تھا، اور مجاہدین انگریز سے ٹکر لینے لگ گئے تھے، ورنہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کو جہاد قرار دینے سے انکار کرنے والے تو دوسرے علماء بھی تھے، ان کے سامنے اس قسم کے انعام کی پیش کش کیوں نہیں کی گئی؟

[1] جماعت مجاہدین ص ۱۸۲

کے رفیقوں میں سے تھے اور باقی کے نام یاد نہیں۔ اور فرمایا کہ یہاں سے سندھ کو جانا، وہاں پیر کوٹ میں بی بی صاحبہ سے ملتے ہوئے کراچی بندر کو جانا، وہاں سے کشتی پر سوار ہو کر بمبئی میں اترنا پھر وہاں سے حیدر آباد کو جانا۔[1]

سید صاحب کے حکم کے مطابق مولانا سید محمد علی حیدر آباد دکن پہنچے، ان کی دعوت اور تبلیغ سے دکن میں سنت کا احیا ہوا۔ مبارز الدولہ اور بڑے بڑے امرا اسی دور میں صراط دین پر قائم ہوئے۔[2] پھر سید صاحب نے مولانا محمد علی کو مدراس جانے کا حکم دیدیا، اور حیدر آباد میں مولانا ولایت علی کو بھیج دیا۔ مولانا محمد علی حیدر آباد سے نکلے تو کرنول، کڈپا، ارد گھر، نیلور ہوتے ہوئے محرم ۱۲۴۵ھ / جولائی ۱۸۲۹ء میں مدراس پہنچے۔ وہاں پہنچ کر مولانا سید محمد علی نے ملا بحر العلوم کے فرزند مولوی عبد الرب کے مدرسے میں ڈیرے ڈالے اور کتاب و سنت کی اشاعت شروع کی۔ آپ کے وعظ و نصیحت سے ہزاروں لوگ راہ راست پر آئے ان میں سے خاص طور پر قابل ذکر نواب خان عالم خان بہادر تہور جنگ ہیں جو مدراس کے معزز رؤسا میں سے تھے۔ اور ان کی صاحبزادی نواب ارکاٹ کی بیگم تھی۔ نواب موصوف نے بیعت کرتے ہی راہ سنت اختیار کر لی اور اپنے گھر کی وہ تمام چیزیں (گانے بجانے کے آلات وغیرہ) توڑ واڈالیں۔ جو شریعت کی رو سے ناجائز تھیں۔

---

[1] جماعت مجاہدین ص ۱۸۲

[2] سوانح احمدی میں لکھا ہے کہ حیدر آباد کے ان نواب صاحب کے گھر میں دو درجن سے زیادہ بیویاں تھیں۔ جب راہ راست پر آئے تو چار کو اپنے نکاح میں رکھ کر باقیوں کو طلاق دیدیا اور اپنے مصاحبوں سے ان کی شادیاں کر دیں۔ اور دوسرے تمام منہیات شرعیہ کو اپنے دربار سے دور کر کے متقی اور پرہیز گار بن کر زندگی گزارنے لگے۔

خود نواب خان عالم نے سید محمد علی کی تبلیغ کے اثرات یوں بیان کیے ہیں:

"۱۔ شراب، سیندھی، گانجا پینے والے فاسق اور ترسُو کو پوجنے والے عوام و خواص پنجوقتہ نماز پڑھنے لگے۔

۲۔ مردوں کے علاوہ بعض عورتیں بھی تہجد گزار ہوگئیں۔

۳۔ تمام غیر شرعی اعمال و رسوم کا خاتمہ ہوگیا۔"

دس مہینے کی تبلیغ کے یہ کرشمے دیکھ کر مخالف بھی جوش میں آگئے اور انھوں نے اعتراضات شروع کردیے۔ سید محمد علی کا طریقہ یہ تھا کہ فضول بحثوں اور مناظروں میں نہ الجھتے۔ اپنے اصل مقصد سے کام رکھتے اور اصلاحِ عقائد و اعمال پر زور دیتے۔ سید صاحب کی شہادت کے بعد سید محمد علی رام پور چلے گئے۔

مدراس کا دوسرا سفر:

۱۲۵۰ھ میں حج کے ارادے سے کلکتہ پہنچے تو مدراس والوں نے پے در پے درخواستیں بھیجیں کہ یہاں ٹھہرتے ہوئے جائیے بلکہ نواب ارکاٹ کی والدہ نے ایک خاص آدمی کلکتہ روانہ کردیا کہ سید محمد علی کو ہمارے جہاز "دریا دولت" پر سوار کرکے لائے۔ ان کی اولین غرض یہ تھی کہ سید محمد علی صاحب سے اپنے بیٹے کے لیے اولاد کی دعا کرائیں۔ سید محمد علی مدراس تشریف لے گئے۔ ان کی دعا سے اللہ تعالیٰ نے نواب ارکاٹ کو اولاد عطا کی۔ آپ کے دوبارہ وہاں تشریف لے جانے سے مخالفوں (بدعتی مسلمانوں) نے شدید ہنگامے بپا کیے۔

لہ ایک ہندو دیوتا جسے مسلمان بھی پوجتے تھے۔ ۱۲

اور ہر ممکن کوشش کی کہ سید محمد علی کی دلآزاری اور اذیت رسانی میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔ زیادہ تر بحثیں شاہ اسماعیل کی کتاب "تقویۃ الایمان" اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کے متعلق ہوتی رہیں [۱]۔ ایک موقع پر سید محمد علی کو زہر دینے کی کوشش بھی کی گئی لیکن آپ اور آپ کے متعلقین خدا کے فضل سے محفوظ رہے۔

خان عالم خان اور ان کی صاحبزادی کی استقامت:

نواب خان عالم خان پر بھی وار ہوئے۔ چنانچہ نواب نے کہ کر ان کی تنخواہ بند کرا دی گئی جس کی مقدار گیارہ سو روپے ماہانہ تھی مگر خان عالم خان نے اس کی پرواہ نہیں کی۔ اور اپنے عقیدۂ توحید پر قائم رہے۔ ان کی صاحبزادی (جو نواب ارکاٹ کی بیگم تھی)، کو بھی بہت تنگ کیا گیا کہ کسی طرح وہ غیر شرعی (مشرکانہ) مراسم اختیار کرے جو عام طور پر اس زمانے میں رائج تھے۔ اس حق پرست خاتون کا نواب کو صرف ایک جواب تھا۔ میں آپ کی بیوی ہوں اور آپ کے ہر فرمان کو ماننے کے لیے ہمہ تن تیار ہوں، لیکن قبر اور آخرت کے معاملات بالکل الگ ہیں۔ میں آپ کے فرمان سے کسی غیر شرعی امر کی مرتکب نہیں ہو سکتی۔

ظلم وجور:

سید محمد علی نے بارہا اعلان کیا کہ میرا عقیدہ اور عمل وہی ہے جو جمہور اہلسنت کا ہے۔

---

[۱] سید محمد علی شفاعت بالاذن کے قائل تھے جیسا کہ حدیثوں میں مذکور ہے لیکن مخالفین کا اصرار تھا کہ شفاعت عام ہونی چاہیے۔ ملاحظہ ہو خانوادۂ قاضی بدر الدولہ جلد اول ص ۲۸۰
مؤلفہ یوسف کوکن عمری ۱۲

اور جو کچھ خلافِ سنت ہے اُسے غلط سمجھتا ہوں، خواہ وہ کسی کی طرف سے ہو۔ لیکن مخالفوں نے انھیں چین نہ لینے دیا۔ سید موصوف کے ایک نیاز مند نے اس ابتلا کی تاریخ کہی جو ذیل میں درج ہے۔

بر محمد علی جفائے پٹن[1] رفت چوں جورِ شام بر حسنین رضؓ
ہست تاریخ ایں بلائے عظیم یادِ مظلومیِ امام حسین رضؓ

۱ ۵ ۱۲ ھ

سید محمد علی نے اس کے بعد حج کیا پھر احیائے دین کے کام میں لگے رہے۔ ۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ء میں وفات پائی۔[2]

●●●

---

[1] مدراس کا پرانا نام چینا پٹن تھا اور اسے عام لوگ پٹن بھی کہتے تھے۔

[2] یہ تمام تفصیلات مہر صاحب کی کتاب "جماعتِ مجاہدین" سے ماخوذ ہیں، اس مضمون کی تکمیل کے بعد افضل العلماء یوسف کوکن عمری کی کتاب "خانوادۂ قاضی بدر الدولہ" جلد اول بھی ملی جس سے سید محمد علی کی ان پریشانیوں کا مفصل حال معلوم ہوا جو توحیدِ خالص کی دعوت اور احیائے سنت کی کوششوں کی وجہ سے ان کو علمائے مدراس کی طرف سے پیش آئی تھیں۔ لیکن یہ داستان اتنی طویل ہے کہ ہم اس کے نقل کرنے کی یہاں گنجائش نہیں پاتے۔

شیخ عبد الحق بنارسی

ان کا اصل وطن نیوتنی ضلع اناؤ تھا۔ ان کے والد شیخ فضل اللہ صاحب وہاں سے منتقل ہو کر بنارس چلے آئے تھے اور یہیں مستقل سکونت اختیار فرمائی تھی۔ اس لیے مولانا شیخ عبد الحق صاحب "بنارسی" اور "نیوتنوی" دونوں نسبتوں سے مشہور ہوئے۔ سید احمد صاحب شہید کے ساتھ ابتدائی دور ہی میں وابستہ ہو گئے تھے۔ سید صاحب کے ساتھ جو قافلہ حج کے لیے گیا تھا، اس میں یہ بھی شامل تھے۔ مزاج میں تیزی بہت تھی۔ بدعات اور غیر شرعی مراسم کے رد و ابطال میں تشدد سے کام لیتے تھے۔ سفرِ حج میں بعض رفقا سے تقلید کے مسئلے پر جھگڑا ہو گیا۔ اس جھگڑے کا یہ اثر ہوا کہ سید صاحب کا قافلہ جب مدینہ منورہ پہنچا اور وہاں شیخ عبد الحق صاحب نے غیر شرعی مراسم اور فاسد عقائد کے خلاف تقریریں شروع کیں تو وہاں کی حکومت میں شیخ صاحب کی شکایت کی گئی۔ ان کے خلاف مقدمہ قائم کیا گیا اور ان کو گرفتار کرایا گیا۔ مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

"اس زمانے میں (حجاز کے) ارباب حکومت نجدیوں سے بےحد بگڑے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ جنگ ختم ہوئے چند ہی سال گزرے تھے۔۔۔۔۔

اگر کوئی شخص موحدانہ عقائد کی اشاعت میں ذرا سرگرم معلوم ہوتا اور بدعات و محدثات کے رد میں سختی سے کام لیتا تو اسے "وہابی" سمجھ کر مواخذے کا تختۂ مشق

بنا لیا جاتا تھا۔ سید صاحب کے ساتھیوں میں مولوی عبدالحق نیوتنوی بہت تیز مزاج تھے، وہ بعض مروجہ غیر شرعی مراسم کے رد و ابطال میں ذرا تیزی سے کام لیتے تھے۔ جھٹ شکایت ہوئی کہ "وہابی" ہیں چنانچہ ان پر مقدمہ قائم ہوگیا۔ مولانا عبدالحی نے ضمانت دیکر انھیں چھڑایا اور مقدمے کی جوابدہی کے موقع پر بھی مولانا ہی نے عدالت سے بات چیت کی۔ اس طرح مولوی عبدالحق رہا ہوئے۔" (سید احمد شہید ج ۱ ص ۲۳۶ و جماعت مجاہدین ص ۴۰)

مہر صاحب نے "سید احمد شہید" کے شروع میں کچھ باتیں "استدراک" کے عنوان سے لکھی ہیں۔ اس کے ذیل میں ایک بات یہ بھی لکھی ہے:۔

"مولوی عبدالحق کے خلاف مدینہ منورہ میں جو مقدمہ دائر ہوا تھا اس کے ذمہ دار مولوی الٰہی مدراسی اور مولوی رجب علی تھے۔ سید صاحب کلکتہ میں بحری سفر کا انتظام فرما رہے تھے تو ایک موقع پر مولوی عبدالحق اور مولوی رجب علی و منشی مرزا جان لکھنوی کے درمیان تقلید و عدم تقلید پر بحث ہوئی تھی، سید صاحب نے رفقاء میں سے چند افراد، جن میں سے منشی فضل الرحمان بردوانی کا نام بہ تصریح مذکور ہے، مولوی عبدالحق کے ہمنوا تھے۔ اس بحث میں مولوی رجب علی کو جو رنجش پیدا ہوئی اس نے مدینہ منورہ پہنچ کر دعوے کی شکل اختیار کی۔ مولوی رجب علی چاہتے تھے کہ مولوی عبدالحق کی جگہ مولانا عبدالحی اور شاہ اسماعیل کو اس قضیئے میں الجھا لیں۔ مولوی عبدالحی نے یہ سنا تو جوش میں آگئے اور قاضی سے کہا کہ میں حنفی ہوں لیکن ہمارے ہاں ابواب معاملات میں کئی ایسی مثالیں ملتی ہیں

کہ فتویٰ امام ابو حنیفہؒ اور صاحبین تینوں کے خلاف ہے۔ قاضی مثالیں سن کر چپ ہو گیا اور یہ قضیہ یوں ختم ہوا۔"

مذکورہ بالا دونوں اقتباسات سے مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہوتے ہیں

(الف) مولانا شیخ عبدالحق کے ساتھ مسئلہ تقلید پر جو بحث ہوئی تھی وہ سفر حج کے موقع پر کلکتہ میں ہوئی تھی۔

(ب) ابھی چند ہی سال گزرے تھے کہ حکومت حجاز اور نجدیوں میں جنگ ختم ہوئی تھی اس کی وجہ سے حجاز کے ارباب[1] حکومت نجدیوں سے ناراض تھے۔ کسی موحدانہ عقائد کی تبلیغ اور بدعات کی تردید کرنے والے کو نجدی اور وہابی سمجھ کر مؤاخذہ کا تختۂ مشق بنالیتے تھے۔ وہاں کی اس فضا سے سید صاحب کے رفقاء سفر میں سے ان علمائے احناف نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جو شیخ عبدالحق بنارسی سے اس لیے ناراض ہو گئے تھے کہ وہ تقلید کے قائل نہ تھے۔ انھی علماء نے مدینہ منورہ پہنچ کر وہاں کے حنفی حکام کے پاس شیخ عبدالحق صاحب کی شکایت کی۔ ان کو گرفتار کرایا اور ان پر مقدمہ چلوایا۔

(ج) اس مقدمہ کے ذمہ دار مولوی اسمٰعیل مدراسی اور مولوی رجب علی جونپوری تھے۔ بالفاظ دیگر مولوی اسمٰعیل مدراسی اور مولوی رجب علی جونپوری حنفی تھے اور مسئلۂ تقلید میں متشدد تھے۔ ورنہ حنفی تو مولانا عبدالحی بھی تھے۔ جنھوں نے شیخ عبدالحق کی ضمانت کی اور مقدمہ کی پیروی کر کے ان کو چھڑایا تھا۔

---

[1] حجاز میں اس وقت ترکوں کی حکومت تھی۔ ۱۲

یہی مولوی اسلمی مدراسی ہیں جن کی بابت مہر صاحب نے ایک خاص بات یہ بھی لکھی ہے کہ مولانا سید محمد علی رامپوری (جن کا تذکرہ ابھی پچھلے صفحات پر گزرا ہے) جب دوبارہ مدراس تشریف لے گئے تھے تو ان کے خلاف جن لوگوں نے ہنگامے برپا کیے اور ان کی ایذا رسانی کے درپے ہوئے ان میں یہ مولوی اسلمی پیش پیش تھے[۱] اس سے جہاں مولوی اسلمی کی ذہنیت کا پتہ لگتا ہے وہیں واضح طور پر یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ مولانا سید محمد علی رامپوری حنفی اور مقلد نہ تھے ورنہ مولوی اسلمی ان کے مخالف اور درپے آزار نہ ہوتے۔

(د) سید صاحب کے رفقاء میں سے چند از و تقلید کی اس بحث میں مولانا شیخ عبدالحق کے ہمنوا تھے۔ جن میں سے منشی فضل الرحمان بردوانی کا نام بہ تصریح مذکور ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ منشی فضل الرحمٰن بردوانی بھی اہلحدیث تھے اور اس سفر حج میں سید صاحب کے ساتھ تھے۔ ان کے متعلق مزید تفصیلات کا ذکر آگے آرہا ہے۔

حج سے فراغت اور مدینہ منورہ سے واپسی کے بعد مولانا شیخ عبدالحق یمن کے مشہور مقام صنعاء چلے گئے۔ وہاں امام شوکانی کا فیضِ علم جاری تھا۔ شیخ عبدالحق ان کے تلمذ کے شرف سے بہرہ اندوز ہوئے۔ اور ان سے حدیث کی سند حاصل کر کے ہندوستان واپس آئے۔

شیوخ و تلامذہ:

شیخ عبدالحق نے امیرالملک نواب صدیق حسن خاں کو اجازتِ حدیث کی جو

---

[۱] ملاحظہ ہو جماعتِ مجاہدین ص ۱۸۵

سند دی ہے۔ اس میں اپنے شیوخ کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

"وبعد فان الشيخ الفطن الذكى مولانا السيد صديق حسن نجل مولانا السيد اولاد حسن المحدث القنوجي نفع الله بعلومه كل ذكى وغبى طلب منى اجازة عامة، ومثلى منه يطلب، ولست باهل ان اجاز فكيف ان اجيز، ولكن الحقائق قد تخفى، وقد من الله تعالى على بالمثول عند ائمة السنة النبوية والسماع منهم للآثار والاحاديث المصطفوية واخذ الاجازات عنهم، فاولهم واجلهم الامام الهمام فخر الاسلام العالم الربانى مولانا القاضى محمد بن على بن محمد الشوكانى الحقه الله بالسلف الصالحين ومتعنا ببركاته۔ آمين۔ وهو يروى عن عدة مشائخ واسامى الكل مع اختلاف الطرق مندرجة فى اتحاف الاكابر باسناد الدفاتر فلا حاجة الى اعادتها، والثانى وجيه الاسلام الورع التقى مولانا القاضى عبد الرحمن بن احمد بن حسن البهكلى ... والثالث العلامة النحرير شيخنا ومولانا السيد عبد الله بن السيد محمد بن اسماعيل الامير ... والرابع العلامة البهى وارث احاديث النبى الامى الشيخ العلامة محمد عابد بن احمد على الواعظ الانصارى الخزرجى السندى ... وقرأت اكثر كتب الحديث على اسوة

المحدثین وارث علوم سید المرسلین العلامة النبیل مولانا
الشیخ محمد اسماعیل الشهید تغمده الله بغفرانه المدید و
علی شیخی ومرشدی العلامة مولانا الشاہ عبد القادر
اعلی الله درجاته وخصه بهباته وعلیٰ اکمل العلماء
وافقه الفقهاء قدوة المحدثین عمدة الکاملین الشیخ
العلامة مولانا الشاہ عبد العزیز الدهلوی قدس الله سرہ
بلطفه الخفی والجلی .... فاقول انی اجزت السید المذکور
وکثر الله تعالیٰ فوائده، جمیع کتب الحدیث .... واوصیه
بتقوی الله عزوجل واتباع الحق اینما کان ومع من کان
والعمل بصحیح السنة ومجانبة البدعة والاستقامة
علی قدم الحق والصدق .... قاله بفمه وحررہ بقلمه
خادم السنة النبویة عبد الحق المحمدی عامله الله
تعالیٰ بلطفه الخفی والجلی فی مسلخ رجب سنة خمس
وثمانین ومأتین والف الهجریة انتهی۔

(اتحاف النبلاء ص ۲۶۳)

ترجمہ: حمد و صلوٰۃ کے بعد مولانا سید ابوالحسن محدث قنوجی کے صاحبزادے مولانا سید صدیق حسن نے مجھ سے (روایتِ حدیث کی) عام اجازت مانگی، حالانکہ مجھ جیسا آدمی ان سے اجازت طلب کرتا، اور میں تو اجازت دیئے جانے کا بھی اہل نہیں چہ جائیکہ میں خود اجازت دوں۔ لیکن بعض اوقات اصلیت چھپ جاتی ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حقیر کو ائمۂ سنت نبوی کی خدمت میں حاضری، آپ سے حدیثیں سننے، اور اجازتیں حاصل کرنے کا موقع ملا۔ ان میں سب سے اول اور مقدم عالم ربانی، فخر اسلام، امام اجل مولانا قاضی محمد بن علی شوکانی ہیں وہ کئی مشائخ سے روایت کرتے ہیں، ان سب کے نام اختلاف طرق کے ساتھ "اتحاف الاکابر باسناد الدفاتر" میں درج ہیں۔ اس لیے یہاں ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ دوسرے مولانا قاضی عبدالرحمٰن بن احمد بن حسن البہکلی ہیں ——— اور تیسرے علامہ سید عبداللہ بن سید محمد بن اسماعیل الامیر یمنی ہیں۔ ... اور چوتھے علامہ شیخ محمد عابد بن احمد علی سندی ہیں۔ ... اور میں نے حدیث کی اکثر کتابیں علوم نبوی کے وارث اسوۂ محدثین علامہ جلیل مولانا شیخ محمد اسماعیل شہید تغمدہ اللہ بغفرانہ المدید، اور اپنے شیخ و مرشد مولانا عبدالقادر اعلی اللہ درجاتہ، اور علماء و فقہاء کے سرتاج، محدثین کاملین کے سرخیل، مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی قدس اللہ سرہٗ سے پڑھیں ...

میں سید مذکور کو تمام کتب حدیث کی (روایت کی) اجازت دیتا ہوں .... اور انھیں تقوی الٰہی کے ساتھ اتباع حق کی نصیحت کرتا ہوں، حق جہاں بھی ہو اور جس کے ساتھ بھی ہو اس کی اتباع کرنا چاہیے۔ (اسی طرح) صحیح سنت پر عمل کرنے، بدعت سے بچنے اور حق و صداقت کی راہ پر ثابت قدم رہنے کی نصیحت کرتا ہوں ....

یہ سب کچھ، سنت نبوی کے خادم عبدالحق محمدی نے اپنی زبان سے کہا (اور یہ سطریں) اپنے قلم سے لکھیں۔ مورخہ آخر رجب ۱۲۸۵ھ

شیخ موصوف کو امام شوکانی نے جو سند دی تھی اس پر تاریخ ۱۰ رجمادی الاخری ۱۲۳۸ھ ثبت ہے[1] تلامذہ میں جن کے نام معلوم ہو سکے ہیں وہ یہ ہیں۔ نواب صدیق حسن خاں

---

[1] ابجد العلوم ص ۸۷

مرحوم ؎۱، مولانا وحید الزماں حیدر آبادی ؎۲، مولانا عبد العزیز محدث لکھنوی ؎۳، قاضی شیخ محمد مچھلی شہری ؎۴، سید جلال الدین احمد جعفری بنارسی ؎۵ اور ان کے تین صاحبزادے سید

؎۱ نواب صاحب ابجد العلوم ص ۸۷۰ پر لکھتے ہیں: شیخنا عبد الحق بن فضل اللہ المحمدی الهندی المتوفی بمنی سنة الف ومائتین وثمان وثمانین الهجرية القدسية نیز اسی کتاب کے اسی صفحہ پر لکھتے ہیں۔ وقد اتحفنی شیخی عبد الحق بکتاب شیخه الشوکانی اتحاف الاکابر باسناد الدفاتر۔

؎۲ مولانا وحید الزماں اپنی کتاب وحید اللغات مادہ "سفر" میں لکھتے ہیں: اسفروا بالفجر فانه اعظم للاجر، کا مطلب یہ ہے کہ فجر کی نماز طول کرو یعنی لمبی سورتیں پڑھو، یہاں تک کہ اس وقت ختم ہو جب خوب روشنی ہو جائے، اس میں زیادہ ثواب ہے۔ مترجم کہتا ہے میرے شیخ عبد الحق نیوتنوی تغمدہ اللہ بغفرانہ وافاض علینا من برکاتہ، اس حدیث کا یہی مطلب کہتے تھے اور یہی صحیح ہے۔ (حاشیہ حیات وحید الزماں ص ۲۱)

؎۳ عبد العزیز بن غلام احمد نام ہے۔ ۱۲۴۰ھ/ ۱۸۲۴ء میں بمقام فرخ آباد پیدا ہوئے۔ بچپن میں قرآن حفظ کیا، پھر عربی کی کتابیں مختلف اساتذۂ وقت سے پڑھیں۔ مولانا عبد الحق نیوتنوی سے بلوغ المرام، مولانا حسین احمد ملیح آبادی سے صحیح بخاری اور مولانا سراج الدین سے سنن ابی داؤد کا درس لیا۔ سید احمد دحلان اور عبد الحق نیوتنوی سے حدیث کی سند لی۔ ۸۵ سال کی عمر پا کر ۱۳۲۴ھ/ ۱۹۰۶ء میں انتقال کیا۔ (حاشیہ حیات وحید الزماں ص ۲۰)

؎۴ مچھلی شہر ضلع جونپور کا ایک مشہور قصبہ ہے۔ یہی قصبہ ان کا مولد و مسکن ہے، موصوف کا مفصل ترجمہ "تراجم علمائے حدیث ہند" جلد اول میں ص ۳۷۳ تا ۳۸۰ ملاحظہ ہو۔ مولانا امام خاں نوشہری لکھتے ہیں۔ "جب اپنے چچا صدر الصدور مولوی عبد الشکور صاحب ←

سعید الدین احمد، سید حمید الدین احمد، سید شہید الدین احمد[۱]۔

تصنیف:

شیخ عبدالحق صاحب کی تصانیف میں ہم کو صرف ایک کتاب کا نام معلوم ہو سکا۔ "الدر الفرید فی المنع عن التقلید"، اس کا جواب مولوی تراب علی لکھنوی نے عبدالقادر سندیلوی کے نام سے لکھا تھا۔ (حاشیہ حیات وحید الزماں ص ۲۰۔ بحوالہ سلسلۃ العسجد نواب صدیق حسن خاں۔

← کے ساتھ (شیخ محمد مچھلی شہری) مکہ معظمہ گئے تو سند الاثبات شیخ عبدالحق محدث بنارسی۔ شاہ عبدالغنی صاحب مدنی، شیخ محمد العظام سے بھی حدیث پڑھی اور سند حاصل کی۔ شیخ عبدالحق محدث بنارسی کی شاگردی پر آپ کو بہت ناز تھا۔ آپ ہی کی سند سے احادیث روایت کرتے اس لیے کہ اپنے اس استاد کی وجہ سے آپ ایک ہی واسطہ سے امام شوکانی کے شاگرد تھے۔ اور یہ بھی آپ کی خوش نصیبی تھی کہ جب دوسری یا تیسری مرتبہ پھر حج کے لیے حاضر ہوئے تو انھیں اپنے محبوب استاذ حضرت عبدالحق محدث کے جنازہ میں شرکت کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ ان حضرات کے علاوہ اور اصحاب سے بھی سند حاصل کی مگر جو اثر صاحب محدث بنارسی کے فیض صحبت سے ہوا اس کی وجہ سے آپ سیرۃ صحابہ کا ایک دلکش نمونہ بن گئے۔

[۵] (الف) حاشیہ صفحہ گزشتہ مولف "تراجم علمائے حدیث ہند" ان کے حالات میں لکھتے ہیں .... اور حدیث کی تکمیل مولانا عبدالحق محدث بنارسی سے کی۔ عمل بالحدیث واتباع سنت کا ولولہ بھی انھی بزرگ کے فیض صحبت سے پیدا ہوا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں انگریزوں کے مخالفین کے ساتھ تھے مگر حکومت کے شکنجہ سے بچ گئے۔

[۱] (حاشیہ صفحہ ہذا) تراجم علمائے حدیث ہند جلد اول ص ۲۰۴)

تکرارِ حج اور وفات:

حب الٰہی کی کشش نے بار بار زیارت بیت اللہ کی سعادت بخشی، چنانچہ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ سات مرتبہ حج کیا[1] آخری مرتبہ ۱۲۸۸ھ میں قیام و فات ومزدلفہ کے بعد منٰی میں انتقال فرمایا[2] بعض لوگوں نے تاریخ وفات ۸ رذی الحجہ ۱۲۸۶ھ لکھی ہے[3]

مولانا سندھی کا ایک افسوسناک بہتان:

مولانا عبید اللہ سندھی نے شیخ عبدالحق محدث بنارسی کے مسلک کی بابت یہ نہایت افسوسناک بہتان باندھا ہے کہ وہ مذہباً زیدی شیعہ تھے اور امیر شہید سید احمد بریلوی نے ان کو اپنی جماعت سے نکلوا دیا تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"امیر شہید نے ان کے رہنما کو جو مولانا محمد اسمٰعیل اور امام شوکانی دونوں کا شاگرد اور زیدی شیعہ تھا اپنی جماعت سے نکلوا دیا۔"

(شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص ۱۰۶، اشاعت دوم نیز دیکھو اسی کتاب کا ص ۱۳۲)

مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم اس کے جواب میں فرماتے ہیں:

"اہل حدیث بھلوں کے جس رہنما کو مولانا سندھی زیدی شیعہ کہتے ہیں وہ شیخ عبدالحق بن فضل اللہ بنارسی مہاجر مکی (ف ذی الحجہ ۱۲۸۶ھ)

---

[1] حاشیہ حیات وحید الزماں [2] ابجد العلوم [3] تراجم علمائے حدیث ہند

ایک متبع سنت سلفی عالم ہیں ان پر زیدیت اور شیعیت کا الزام عائد کرنا بڑا ظلم ہے ، مولانا نے ان کا ذکر غیر مختلف جگہوں پر کیا ہے ۔ دو موقعوں پر زیدی شیعہ اور ایک مقام پر نواب صدیق حسن خاں (ف ۱۳۰۷ھ) کا استاذ بھی بتایا گیا ہے ... لیکن نام لینے سے احتراز رہا ہے ... ہمیں نہیں معلوم کہ امیر شہید نے انھیں کب جماعت سے نکلوا دیا تھا کیا اس کا کوئی مستند ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے ؟ ۔ " ؎

اب رہا شیخ عبدالحق بن فضل اللہ پر زیدیت اور شیعیت کا الزام تو اس کی حیثیت ایک بہتان سے زیادہ نہیں ۔ دیکھیے ! کہیں "مرغ قبلہ نما" تو آپ کی ناوک افگنی کا نشانہ نہیں بن رہا ہے ۔

(مولانا سندھی اور ان کے افکار پر ایک نظر ص ۹۸)

مولانا عبیداللہ سندھی اپنے زعم باطل میں امام شوکانی کو بھی زیدی شیعہ سمجھ رہے ہیں ، اسی بنیاد پر انھوں نے ان کے شاگرد (شیخ عبدالحق بنارسی) کو زیدی کہا ہے ۔ مولانا مسعود عالم مرحوم نے بڑی تفصیل سے اور نہایت معقول طریقہ پر پرزور دلائل کے ساتھ ان کے اس زعم باطل کی تردید کی ہے ۔ سندھی صاحب کا یہ بہتان سراسر بے بنیاد ہے ، اس لیے ہم ضرورت نہیں سمجھتے کہ مولانا ندوی کے جواب کے

؎ مولانا ندوی اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ انھوں نے مکہ مکرمہ میں ایک رسالہ دیکھا ہے ، جس میں مولوی عبدالحق بنارسی کے اخراج کا واقعہ درج ہے ۔ مولانا مسعود عالم ندوی اس جواب کی بابت لکھتے ہیں : افسوس کہ موجودہ حالات میں اس کی تحقیق بھی نہیں ہو سکتی ، ہندوستان کے کتاب خانوں میں کسی ایسی کتاب کا پتہ نہیں چلتا ۔ شیخ عبدالحق کے بارے میں ہماری معلومات ان کی تائید نہیں کرتیں ۔ واللہ عندہ علم الصواب ۔

زیادہ اقتباسات یہاں پیش کریں ۱؎۔

یہ بات پہلے بتائی جاچکی ہے کہ شیخ عبدالحق کے مزاج میں تیزی تھی۔ وہ تقلید کی تردید اور غیر شرعی مراسم کے ابطال میں تشدد سے کام لیتے تھے، اسی کا اثر تھا کہ غالی حنفیوں کے جواب میں ان کی زبان و قلم سے بعض اوقات ایسے کلمے بھی نکلے جن سے حضرت امام ابوحنیفہ رح کی تنقیص کا پہلو پیدا ہو سکتا تھا۔ یہ روش ان علمائے اہلحدیث کو بھی ناگوار گزری۔ جو فقہی مباحث میں غلو اور تشدد کو ناپسند کرتے تھے۔ انھیں میں مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی مرحوم بھی تھے۔ یہ مدت العمر اس بات کے لیے کوشاں رہے کہ حنفی اور اہلحدیث دونوں اعتدال کی روش اختیار کریں۔ وہ لعن طعن کی روش کو شیعوں کا طریقہ بتاتے تھے، اسی لیے انھوں نے شیخ عبدالحق کی نسبت بھی لکھدیا کہ وہ شیعہ ہوگئے تھے۔

چنانچہ لکھتے ہیں:

> "جیسا کہ مولوی عبدالحق بنارسی یہی روش اختیار کرکے آخر شیعہ ہوگئے مگر آخر مرنے سے پہلے وہ اس مذہب شیعی سے تائب ہوگئے اور خدا کی توفیق اور رہنمائی سے وہ سنی اہلحدیث ہوکر فوت ہوئے۔ (اشاعۃ السنہ ج ۲۲ ع ۹ ص ۲۸۷)

انگریزوں کی بنائی ہوئی کہانی:

یہ تو اپنوں کی روایت تھی اب ذرا تفریح کے لیے غیروں کی بنائی ہوئی کہانی بھی سنیے! اس سے معلوم ہوگا کہ شیخ عبدالحق کی مظلومیت کوئی نئی نہیں۔ اپنے شیخ حضرت سید احمد شہید اور استاذ مولانا شہید کی طرح یہ بھی غیروں کے حلقے میں نیک نام نہیں۔

۱؎ معلوم ہے کہ مولانا سندھی جس جماعت کے نمائندہ تھے اس کا وطیرہ ہی یہ تھا کہ وہ فقہ حنفی اور ہندوستانی تصوف کا انکار کرنے والے کو جھوٹا رافضی کہتی تھی۔ (دیکھیے مولانا سندھی کی کتاب شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص ۱۱۰) اس لیے یہ بہتان مولانا سندھی کے اختراع ذہن کے عین مطابق ہے۔ (م ر)

جماعت مجاہدین کے خاص کرم فرما مسٹر او کنلے Jamis Okinely
مولانا ولایت علی کے تذکرہ میں رقمطراز ہیں؛

"ایک معلم کی حیثیت سے نمودار ہونے سے پہلے یہ مولانا ولایت علی بنارس کے ایک متعصب وہابی عبدالحق کے مرید ہو گئے تھے، اس شخص کا اصلی نام غلام رسول (؟) تھا۔ لیکن وہابی تعلیمات اختیار کرنے کے بعد اس نے یہ غیر مذہبی نام ترک کر دیا اور عبدالحق نام اختیار کیا۔ اس کے بعد یہ مکہ گیا جہاں اس کے معتقدانہ خیالات کی خبر ترکی حکام کو ہوئی۔ گرفتاری کا حکم صادر ہوا۔ لیکن یہ کسی طرح نجد پہنچ گیا (؟) چند سال نجد میں رہ کر یہ بنارس واپس ہوا۔ جہاں یہ شیخ نجدی کے نام سے مشہور تھا۔ مولوی ولایت علی اس کے اولین حلقہ بگوشوں (Conuests) میں تھے۔

ایک دوسرے صاحب اسی میں نمک مرچ لگا کر یوں خامہ فرسا ہیں:

"ایک بات اور بھی ہے جس میں ہندوستانی وہابی اپنے عرب بھائیوں سے الگ ہیں۔ یعنی یہ کہ سید احمد امام مہدی ہیں (؟) ولایت علی عبدالحق کا ایک مرید نجدی میں وہابی ہو چکا تھا، لیکن بنارس میں رہتا تھا۔ ا نے اس عقیدے کی تبلیغ کی، اور اس پر ایک کتاب بھی لکھی۔" (؟)

یہ سب عبارتیں مولانا مسعود عالم ندوی کی کتاب "مولانا سندھی اور ان کے افکار

لہ مولانا ولایت علی، شیخ عبدالحق کے مرید یا شاگرد نہیں تھے، البتہ دونوں ایک استاذ مولانا اسماعیل شہید کے شاگرد اور ایک شیخ حضرت سید احمد شہید کے مرید تھے۔

(خیالات پر ایک نظر" کے ص ۵۲، ۵۳ سے ماخوذ ہیں۔

مذکورہ بالا دونوں اقتباسات انگریزی تحریروں کے حوالے سے مولانا ندوی نے نقل کیے ہیں۔ ان اقتباسات کی بیشتر باتیں جھوٹ اور محض بناوٹی افسانے ہیں۔ مولانا ولایت علی شیخ عبدالحق کے مرید نہیں تھے۔ نہ شیخ عبدالحق کا اصلی نام غلام رسول تھا۔ نہ شیخ عبدالحق کبھی نجد گئے، نہ ترکی حکام کی گرفتاری سے وہ بچ سکے تھے۔ بلکہ گرفتار ہوئے، ضمانت پر رہا ہوئے، پھر مقدمہ چلا اور مقدمہ کی پیروی اور بحث کے بعد وہ غیر قصور وار ثابت ہوئے۔ یہ بھی بالکل غلط ہے کہ ہندوستانی وہابی سید احمد شہید کو "امام مہدی" سمجھتے تھے۔ نہ مولانا ولایت علی نے کبھی اس کی تبلیغ کی اور نہ اس کی بابت کوئی کتاب لکھی۔

منشی فضل الرحمٰن، منشی محمدی انصاری

منشی فضل الرحمٰن بردوانی کے متعلق بتایا جا چکا ہے کہ وہ بھی سفرِ حج میں سید صاحب (شہید) کے ساتھ تھے اور مسلک میں شیخ عبدالحق محمدی بنارسی کے ہم عقیدہ و ہمنوا تھے۔ مولانا مہر نے لکھا ہے کہ حج کو جاتے ہوئے جب سید صاحب راج محل پہنچے تو منشی محمدی انصاری سید صاحب کو بہ اصرار اپنے وطن لے گئے، (جو راج محل سے دس بارہ کوس

پر تھا۔) وہاں منشی صاحب کے اکثر اقربا نے سید صاحب کی بیعت کی۔ مثلاً ان کے والد منشی شاہ محمد، منشی رؤف الدین، منشی مخدوم بخش، منشی حسن علی۔ (جن کا رشتہ معلوم نہ ہو سکا) منشی فضل الرحمن اور منشی عزیز الرحمن (یہ منشی محمدی کے ماموں تھے) اور لوگ بھی سید صاحب کی صحبت سے فیضیاب ہوئے۔ منشی شاہ محمد حج کے لیے ساتھ گئے۔[1]

جنگ مایار:

سید صاحب اور ان کے جانباز رفقاء نے سرحد پار جو لڑائیاں لڑیں ان میں "جنگ مایار" ایک بڑی اہم اور معرکے کی جنگ ہے۔ یہ جنگ سرحد کے دُرّانی قبائل کے ساتھ ہوئی ہے۔ سید صاحب کو اس کا بے حد ملال تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں سے لڑیں، افسوس کے ساتھ فرماتے تھے۔

"اللہ تعالیٰ کا کارخانہ دیکھیے۔ ہم ہندوستان سے ہجرت کر کے آئے کہ مسلمان کو متفق کر کے کافروں سے لڑیں۔ بڑے افسوس کی جگہ ہے کہ کفار تو درکنار یہ مسلمان ہی ہمارے مخالف اور دشمن جانی بن گئے، اور ہم سے لڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔ ہم تو ہرگز نہیں چاہتے کہ ان سے لڑیں۔ چنانچہ سلطان محمد خان کو بارہا سمجھایا۔ لیکن نفس و شیطان نے اس کو شر و فساد پر اس درجہ آمادہ کر دیا کہ کچھ اس کے ذہن میں نہ آیا۔ خیر! مشیت اگر یونہی ہے تو ہم ناچار ہیں، جو کچھ ہوگا دیکھ لیں گے۔"[2]

مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

---

[1] جماعت مجاہدین ۲۲۶۔ [2] سید احمد شہید ج ۲، ۲۵ واں باب

"ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں ایک دو نہیں، بیسیوں واقعات موجود ہیں کہ مسلمانوں نے جوع الارض کی خاطر مسلمانوں کے گلے کاٹے، کلمہ گویوں نے کلمہ گویوں کا خون بہایا، لیکن ایسی مثال آپ کو شاید ہی مل سکے کہ دعویداران اسلام نے ان نمازیوں کو خونریزی اور خون آشامی کا ہدف بنایا جنھیں رضائے حق کے سوا دنیا و آخرت کی کوئی چیز مطلوب نہ تھی۔ جن کے دلوں میں صرف ایک آرزو اور ایک تڑپ تھی کہ مسلمان سچے مسلمان بن جائیں۔ عزت و سربلندی کی زندگیاں بسر کریں، کوئی معاند انھیں آزار نہ پہنچا سکے۔ کسی بدخواہ کا ہاتھ ان کی طرف بڑھنے کی جرأت نہ کر سکے۔ یہ مکروہ اور گھناؤنا کام صرف پشاور کے درانی سرداروں نے اپنے لیے پسند کیا،

لمثل ھذا یذوب القلب من کمد
ان کان فی القلب اسلام و ایمان[1]

مولانا اسمٰعیل شہید اس موقع پر موجود نہ تھے۔ سید صاحب نے ان کو بلانے کا پیغام بھیجا تو منشی محمدی انصاری نے اپنی طرف سے مولانا کو لکھ بھیجا کہ اپنی تشریف آوری کی خبر کو شہرت دیجیے۔ اس لیے کہ آپ کی شجاعت اس دیار کے خاص و عام پر روشن ہے کیا عجب ہے کہ دشمن آپ کا نام سن کر مرعوب ہو جائیں اور اسی طرح مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے۔ لیکن مصالحت کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی۔ آخر جنگ ہوئی اور بڑی گھمسان کی ہوئی۔ اسی جنگ میں بعض مجاہد یہ رجز پڑھ رہے تھے۔

---

[1] سید احمد شہید جلد دوم ص ۲۳۳ و ۲۳۴۔

جس کے پیروں پر گرے گرد صفِ جنگ | وہ جہنم سے بچا، نار سے ہے وہ آزاد
اے برادر تو حدیثِ نبوی کو سن لے | باغ فردوس ہے تلواروں کے سائے کے تلے
جو مسلمان رہِ حق میں لڑا الحفظ پھر | روضۂ خلد بریں ہو گیا واجب اس پر
آج جو اپنی خوشی جان، خدا کو دوگے | پھر تو کل شوق سے جنت کے مزے لوٹو گے

دشمن بڑی تیاری کے ساتھ مقابلہ پر آئے تھے۔ درانی فوج اس وقت بارہ ہزار تھی۔ چار ہزار پیادے اور آٹھ ہزار سوار۔ ان کے پاس دو بڑی اور چار چھوٹی توپیں تھیں۔

سید صاحب کے پاس نمازیوں کی مجموعی تعداد ساڑھے تین ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ سوار صرف پانچ سو تھے۔ توپ کوئی نہ تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال تھی۔ سید صاحب لڑنا نہیں چاہتے تھے۔ مگر جب جنگ ناگزیر ہو گئی تو سید صاحب خود اور ان کے تمام مجاہد رفقاء بڑی پامردی اور استقلال سے لڑے۔ آخر چشم فلک نے دیکھ لیا کہ صرف ساڑھے تین ہزار کے قافلۂ حق نے باوجود بے سروسامانی بارہ ہزار کے لشکر کو شکست فاش دی جو ہر قسم کے سامان سے لیس تھا۔ [1]

شہداء کی تدفین:

اس جنگ میں جن خوش قسمت نمازیوں کو شہادت نصیب ہوئی ان میں منشی فضل الرحمان بردوانی بھی تھے۔ شہداء کی تدفین کا انتظام مولانا شاہ اسماعیل کے سپرد تھا۔ شاہ صاحب نے کئی کئی شہیدوں کو ایک ہی قبر میں دفن کیا۔ چنانچہ منشی فضل الرحمٰن

---

[1] سید احمد شہید ج ۲ باب ۲۵

کے ساتھ حاجی عبدالرحیم پھلتی والے ۔ سید ابو محمد نصیر آبادی ۔ میر رستم علی ۔ شیخ عبدالحکیم پھلتی مولوی عبدالرحمٰن ساکن تورہ ، کریم بخش ۔ عبدالرحمٰن رائے بریلوی بھی دفن کیے گئے ۔ موخرالذکر کو کفن بھی پہنایا گیا تھا ، باقی تمام اصحاب کو بلا غسل و کفن ان کے لباسوں میں بدستور رکھ دیا گیا ۔ مولانا نے فرمایا ، ان کے عماموں کا ایک سرا لے کر منہ ڈھانپ دیے جائیں ۔ بعد تدفین مولانا نے نمازیوں سمیت دیر تک شہدا ، کے لیے مغفرت کی دعا کی ۔ سب کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے ۔ ہر ایک کی زبان پر یہ کلمہ تھا کہ یہ بھائی تو جس مراد کو آئے تھے حاصل ہو گئی ۔ خدا ہم لوگوں کو بھی اسی طرح شہادت نصیب کرے ۔ [۱]

سید صاحب کی دعا :

تھوڑی دیر بعد مغرب کی اذان ہوئی ۔ سید صاحب نے خود نماز پڑھائی ، پھر عجز و الحاح سے دعا کی " اے ہمارے پروردگار تو خوب جانتا ہے کہ یہ سب لوگ محض تیری خوشنودی اور رضا جوئی کے لیے اپنے گھر بار ، خویش و تبار ، اہل و عیال اور مال و منال چھوڑ کر یہاں آئے تھے اور صرف تیری راہ میں اخلاص سے اپنی جانیں صرف کیں ۔ ان کے گناہوں کو اپنے دامن رحمت میں چھپا لے ۔ فردوس میں جگہ دے اور ان سے راضی ہو ۔ ہم جو چند ضعفا اور عزبا تیرے عاجز بندے باقی ہیں ان کو بھی اپنی رضامندی اور خوشنودی کی راہ میں جان و مال قربان کرنے کی توفیق عطا فرما ۔ ہمارے سینوں میں جو شیطانی خطرات اور نفسانی وساوس خطور کرتے ہیں ، ان کو دور کر دے ۔ دلوں کو اپنے اخلاص و محبت سے معمور

---

[۱] سید احمد شہید ج ۲ باب ۲۵

رکھ۔ اپنے دین کو قوت اور ترقی بخش۔ جو لوگ اس دین کے دشمن اور بدخواہ ہیں انھیں ذلیل ورسوا کر۔ جو مسلمان شریعت کے راہ راست سے ہٹ کر بادیۂ ضلالت میں ٹھوکریں کھا رہے ہیں انھیں ہدایت دے اور پکا مسلمان بنا دے۔ تاکہ اس کار خیر میں جان و مال اور اہل و عیال سے شریک ہوں۔[1]

منشی محمدی انصاری:

منشی محمدی انصاری جنھیں بعض اوقات بردوانی بھی لکھتے ہیں۔ منشی فضل الرحمٰن (مذکور) کے بھانجے تھے۔ مجاہدین میں ان کا عہدہ میر منشی کا تھا۔ انھوں نے سید صاحب سے اس زمانہ میں بمقام میرٹھ بیعت کی تھی جب سید صاحب میرٹھ، سہارن پور، مظفر نگر وغیرہ کے دورے پر نکلے تھے۔ اس وقت منشی صاحب کی عمر انیس بیس سال سے زیادہ نہ ہوگی، اس لیے کہ دوران جہاد میں جن لوگوں نے انھیں دیکھا ان کی عمر پچیس چھبیس سال کی بتائی۔ سفر حج میں سید صاحب کے ساتھ رائے بریلی سے روانہ ہوئے۔ راج محل پہنچ کر سید صاحب کو اپنے وطن لے گئے، وہاں ان کے اقرباء نے سید صاحب سے بیعت کی جیسا کہ پہلے اس کا ذکر آچکا۔

سید صاحب ان کو عموماً "انصاری بھائی" کہہ کر پکارتے تھے اور تمام اہل لشکر انھیں "بھائی صاحب" کہتے تھے۔ ان کا صحیح نام معلوم نہ ہوسکا البتہ محمدی نسبت ان کے اہلحدیث ہونے کی دلیل ہے۔ مجاہدین میں اہلحدیث ہی اپنے کو محمدی کہتے تھے۔[2] اور آج

---

[1] بحوالہ مذکور۔ ۱۲ [2] روشن مستقبل ص ۸۷

بھی یہ طرۂ امتیاز بحمداللہ انھی کو حاصل ہے

ہجرت :

جب اطلاع ملی کہ سید صاحب ہندوستان سے ہجرت فرمانے کا ارادہ کر رہے ہیں تو منشی محمدی، بیوی بچے ، اور اقربا کو چھوڑ کر رائے بریلی پہنچ گئے اور سید صاحب کے ساتھ ہجرت کا شرف حاصل کیا۔ ان کے ماموں منشی فضل الرحمن بھی ساتھ تھے۔

انتظام دفتر :

منشی صاحب کو تحریر پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی ، اندھیرے میں بھی بے تکلف لکھتے۔ لیکن نہ سطر ٹیڑھی ہوتی نہ الفاظ ایک دوسرے سے پیوست ہوتے ۔ انھوں نے مختلف امور کے لیے الگ الگ بستے بنا لیے تھے ۔ یہ بستے ایک بڑے صندوق میں رہتے ، جس بستے کی ضرورت پڑتی محافظوں سے کہہ کر صندوق میں سے نکلوا لیتے ۔ ہر مہینے کے آغاز میں روزنامچے کی جدولیں تیار کرا لیتے ۔ اس روزنامچے میں تمام حالات تفصیل سے لکھوا لیتے ۔

ایک واقعہ :

منشی محمدی کے ایک رفیق عبدالرحیم نومسلم تھے۔ منشی صاحب نے اپنی بندوق اسے دے رکھی تھی لیکن تاکید کر دی تھی کہ اگر جنگ چھڑ جائے تو بندوق فوراً میرے پاس پہنچانا

فتح ہنڈ کے بعد مخالفوں کی یورشوں کا سلسلہ جاری رہا ۔ منشی صاحب ادھر

عبدالرحیم ہنڈہی ہیں تھے۔ ایک روز عبدالرحیم اونٹ چرانے کے لیے باہر چلا گیا، اور بندوق بھی ساتھ لے لیا۔ اسی اثنا میں غنیم کے ایک گروہ نے یورش کردی۔ منشی صاحب بندوق کے انتظار میں بیٹھے رہے۔ عبدالرحیم جوش حمیت میں خود شریک جنگ ہوگیا۔ سوء اتفاق سے بندوق کا چقماق گم ہوگیا۔ دوڑا دوڑا قلعہ میں آیا۔ منشی صاحب بندوق اٹھا کر خود جانے لگے، لیکن انھیں موزوں چقماق نہ مل سکا۔ مجبوراً مستعمل چقماق کا ٹکڑا اٹھا کر لگایا۔ انھیں خیال تھا کہ بندوق خالی ہے۔ عبدالرحیم نے بھی کچھ نہ بتایا۔ منشی صاحب نے لبلبی دبادی تاکہ چقماق کے کارآمد ہونے کا اندازہ کرلیا جائے۔ اس کے چار ٹکڑے ہوگئے۔ منشی صاحب نے ان میں سے بڑا ٹکڑا اٹھا کر دوبارہ لگایا اور کہا گم اگر ہاتھ آگیا تو فی الحال اسی سے کام لوں گا۔ عبدالرحیم جانتا تھا کہ بندوق بھری ہوئی ہے لیکن اس نے منشی صاحب کی توضیح کے بعد بھی کچھ نہ بتایا۔ تقدیر کی بات منشی صاحب نے لبلبی دبائی، بندوق چلی اور گولی عبدالرحیم کے شانے کے نیچے کی ہڈی کو توڑتی ہوئی نکل گئی۔ دوسرے دن اسی صدمے میں وہ نیک دل جاں بحق ہوا۔ منشی صاحب کو اس واقعہ کا بڑا قلق تھا۔ عبدالرحیم سکرات موت میں بھی منشی صاحب کو تسلی دیتے ہوئے کہتا رہا۔ بھائی صاحب! رنج وغم نہ کریں۔ آپ نے مجھے نہیں مارا۔ آپ کو کیا معلوم تھا کہ بندوق بھری ہوئی ہے؟ میں بتا نہ سکا، جو کچھ پیش آیا وہ تقدیری معاملہ تھا۔

اخلاق و عادات:

منشی صاحب بڑے مخلص، سید صاحب کے کمال معتقد اور آپ کے نزدیک نہایت معتبر و معزز تھے۔ اخلاص کا یہ عالم تھا کہ دوران جہاد میں کبھی کسی معاملے کے متعلق سید صاحب

ے خفیف سے اختلاف کا بھی موقع نہ آیا۔ سید صاحب کی طرف سے جو فیصلہ یا فرمان صادر ہوا اس کی درستی کے بدل معتقد تھے۔

شہادت:

آخر دم تک سید صاحب کے ساتھ رہے، یہاں تک کہ ان کی شہادت بھی بالاکوٹ میں سید صاحب کی شہادت گاہ کے قریب ہی ہوئی۔ انھیں غالباً اس گنج شہیداں میں دفن کیا گیا جو قصبہ بالاکوٹ کے مغرب میں مٹی کوٹ کے ٹیلے سے قریب ہے۔ شہادت کے وقت ان کی عمر تیس برس سے کم تھی۔ [1]

مولوی سید جعفر علی نقوی کا بیان ہے کہ:

"میں اور منشی محمدی انصاری پاس کھڑے لڑ رہے تھے۔ اچانک قاضی علاء الدین لڑائی سے دست کش ہو کر حضرت کا پتہ پوچھتے ہوئے آئے۔ منشی انصاری نے بھی لڑنا چھوڑ دیا اور حضرت کی تلاش میں بائیں جانب چلے گئے۔ اسی حالت میں یہ دونوں بزرگ (یعنی قاضی علاء الدین اور منشی محمدی انصاری) گولیاں کھا کر شہید ہو گئے۔" [2]

---

[1] یہ حالات جماعت مجاہدین سے ماخوذ ہیں۔ [2] سید احمد شہید ج ۲ ص ۴۲۱

سید اولاد حسن قنوجی

موصوف ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۵ء میں قنوج میں پیدا ہوئے۔ باپ کے سایۂ عاطفت سے بچپن ہی میں محروم ہو گئے تھے۔ خاندان میں کوئی دوسرا ایسا بزرگ بھی موجود نہ تھا جو ان کی تعلیم و تربیت پر اپنی خصوصی توجہ مبذول کرتا۔ بایں ہمہ، چونکہ قدرت نے ان کو ایک خاص ملکہ، صلاحیت و استعداد عطا کیا تھا، اس لیے خود بخود محض اپنے ذوق طبعی اور شوقِ فطری سے اکتسابِ علم کی طرف ان کی عنانِ توجہ معطوف ہوئی۔

ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کی، پھر لکھنؤ پہنچے اور مولوی محمد نور صاحب اور جناب مرزا حسن علی صاحب محدثؒ کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے جو اس وقت اہلِ علم کے طبقہ میں سرآمدِ روزگار تھے۔ کچھ زمانے تک اکتسابِ علم کے بعد دہلی کا سفر کیا۔ وہاں حضرت شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر سے تفسیر، حدیث، فقہ اور دوسرے علوم پڑھے۔ ان بزرگوں کی تعلیم و تربیت اور فیضِ صحبت کے اثر سے انھوں نے اپنے خاندانی مذہب شیعیت سے تائب ہو کر اہلسنت کا مسلک اختیار کیا اور تمام اہلِ خاندان سے جو اربابِ تشیع میں سے تھے، اپنے تعلقات منقطع کر لیے۔ اور مراسمِ شادی و غمی کو یک قلم اٹھا دیا۔[1]

---

[1] مآثر صدیقی حصہ اول۔

بیعتِ جہاد:

تحصیل علم سے فراغت کے بعد سید احمد صاحب شہید کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ہر طرح کے ایثار و قربانی اور خدمتِ قوم و ملت کے لیے اپنے کو پیش کیا، ان سے بیعت کی، اور مجاہدین کی جماعت میں شامل ہو گئے، ان سابقین اولین میں شریک تھے جو سید صاحب کے ساتھ جہاد کے لیے سرحد پار گئے تھے۔ کچھ مدت کے بعد سید صاحب نے ان کو سندِ خلافت دے کر دعوت و تبلیغ کی غرض سے وطن واپس بھیج دیا۔ چنانچہ نواب صاحب ان کے حالات میں لکھتے ہیں۔

وجاهد معه فی سبیل الله وصار خلیفة له فی دعوة الحق الی دین الله تعالیٰ فرجع الی الوطن [1]

دعوت وارشاد:

مراجعت وطن کے بعد کامل بیس برس تک یعنی اپنی آخر حیات تک وہ اسلام کی تبلیغ اور قوم کی اصلاح میں سرگرم رہے۔ نواب صاحب لکھتے ہیں:

" وباجازت وخلافت مستعد گشتہ از ولایت بقنوج آمدند۔ و اشتغال بوعظ وہدایت خلق وتحریض ایشاں بر جہاد و اتباع خیر العباد فرمودند تا آنکہ در قلیل مدت نفع کثیر بخلق رسید و زیادہ از دہ ہزار کس سکنہ

---

[1] ابجد العلوم ص ۹۳۵

اطرافِ قنوج مسلمان و مومن شدند، و مومنان در تادیۂ احکام اسلام سرگرم گردیدند، مسجدہا آباد گردید، صوم و صلوٰۃ رونقِ دیگر گرفت، امام باڑہ ہا باخاک برابر شد، تعزیہ ہا را نام و نشان باقی نماند، سنتہائے بسیار زندہ گشت، بدعتہائے بے شمار بمرد[1]

ترجمہ: سید احمد شہید سے اجازت و خلافت کی سعادت حاصل کر کے وہ قنوج واپس آ گئے۔ ہدایتِ خلق اور وعظ و ارشاد میں مشغول ہو گئے۔ لوگوں کو جہاد کی ترغیب دیتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی اتباع پر آمادہ کرتے تھے، یہاں تک کہ تھوڑی ہی مدت میں ان کی ذات سے مخلوق خدا کو بڑا فیض پہنچا۔ اطرافِ قنوج کے دس ہزار سے زیادہ غیر مسلم ان کی تبلیغ سے مسلمان ہو گئے، اور جو مسلمان غافل تھے، وہ احکام اسلام کی پابندی میں سرگرم ہو گئے۔ مسجدیں آباد ہو گئیں۔ صوم و صلوٰۃ کی رونق بڑھ گئی۔ امام باڑے خاک میں مل گئے اور تعزیوں کا نام و نشان مٹ گیا۔ بہت سی سنتیں زندہ ہوئیں، اور بے شمار بدعتیں ختم ہوئیں۔"

خود سید صاحب ایک مکتوب میں انھیں لکھتے ہیں:

"آنچہ از مصروفیت خود در تبلیغ احکام رب العٰلمین نوشتہ اید موجب فرحت بسیار شد، جزاکم اللہ خیر الجزاء، بر ہر یکے از مومنین خصوصاً علمائے اعلام و مشائخ کرام لازم است کہ احکام اسلام را بر بندگان او تعالیٰ شائع و ذائع گردانند و بہ راہ مستقیم و رضائے ربّ کریم مستعد سازند، و ایں جانیاز

---

[1] اتحاف النبلاء، ص ۲۳۶

دعوت اہل سوات و بنیر فارغ شدہ برائے ازالۂ کفر و فساد تا بہ پنجتار رسیدہ است، ان شاء اللہ تعالیٰ عنقریب ابواب نصرت و فتح بر مجاہدین ابرار مفتوح خواہد شد۔ انتہیٰ بلفظہ۔ (اتحاف النبلاء ص۲۳۶)

ترجمہ: آپ نے رب العٰلمین کے احکام کی تبلیغ کے سلسلے میں اپنی مصروفیت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس سے بہت خوشی حاصل ہوئی، اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی نیک جزا دے۔ تمام مسلمانوں خصوصاً بڑے بڑے علماء و مشائخ پر لازم ہے کہ اسلام کے احکام کو اللہ تعالیٰ کے بندوں میں پھیلائیں، اور رب کریم کی رضا حاصل کرنے کے لیے ان کو تیار کریں، ان کو سیدھی راہ پر چلائیں۔ میں اہل سوات و بنیر کی اصلاح و دعوت سے فارغ ہو کر کفر و فساد کے ازالہ کے لیے پنجتار تک پہنچا ہوں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ عنقریب فتح و نصرت کے دروازے مجاہدین پر کھل جائیں گے۔

دعوت و ارشاد کے سلسلے میں کتابیں بھی لکھیں۔ ایک رسالہ "راہِ سنت" کے نام سے نظم میں تالیف کیا۔ اس کے کچھ اشعار ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

ہو اگر دنیا میں مردِ بامراد — عامل سنت بہنگام فساد
الغرض دیکھیں جب ان آنکھوں سے ہم — یہ بلا کے اختلافاتِ امم
اب کسی کا فعل ہو، یا قول ہو — چاہیے سنت سے اس کو تول لو
مولوی فاضل ہو یا استاذ بیر — یا ولی یا شیخ یا شاہ و فقیر
زندہ ہو مردہ ہو یا نہ دیکھو دور — ہو ولایت یا کرامت کا ظہور
ہو رسالہ یا کہ ہو کوئی کتاب — مجتہد ہو یا فقیہ لاجواب
گر اسے بر حسبِ سنت پائیے — بے خطر اس کو عمل میں لائیے

گر نہ ہو سنت سے اس کو اتفاق — چھوڑ دے اس کو، ہے کردارِ شقاق

ہے خطا کی پیروی کرنا خطا — یہ اجازت کب ہوئی ہم کو روا

ہر طرح تبعیّت اور تقلیدِ عام — غیر پیغمبر کی ہے جائے کلام

مذہبِ اربابِ سنّت کر یقیں — جز نبی معصوم عالم میں نہیں

مجتہد کے حق میں ہے تخطئہ معیب — ہے خطا جائز ولی سے اے لبیب

جو خطا تقلید میں ہوتی معاف — کس لیے پڑتا بھلا پھر اختلاف

کہتے ہیں اکثر گروہِ معتقد — ہے خطا سے پاک قولِ مجتہد

دشمنِ تحقیق ان کی بات ہے — جز نبی معصوم کس کی ذات ہے

علم میں رکھتے بہت عالم اگر — کس لیے نزدیکِ اربابِ خبر

راہ پر کچھ اور کچھ بے راہ ہیں — گرچہ اہلِ علم ہیں، آگاہ ہیں

اچھے اچھے ہیں خطا میں آ پڑے — مذہبِ باطل میں عالم ہیں بڑے

الغرض یہ وہم ہیں سب دور خیال — ہے بجائے خود یہ دعوائے محال

جان و دل سے چاہیے کرنا قبول — لطف قال اللہ اور قال الرسول

سن چکے تم حسنِ ارشادِ نبی
چاہیے سنت کی اب تو پیروی[1]

ان کے صاحبزادے نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ "اللہ تعالے نے میرے باپ کو سنی خالص محمدی صحیح بنایا تھا۔"[2]

---

[1] تراجم علمائے حدیث ہند جلد اول بحوالہ مطرق الحدید مولفہ حافظ عزیز الدین صاحب مراد آبادی۔

[2] ابقاء المنن ص ٦٠

وفات:

تقریباً ایک ہفتہ بیمار رہے، مگر اس درمیان میں فرض نمازیں برابر قیام کے ساتھ اوقات معینہ پر ادا کرتے رہے۔ البتہ نوافل میں کبھی کبھی بیٹھ جایا کرتے تھے۔ جب ان کو اپنی زندگی کی جانب سے قطعاً مایوسی ہوگئی تو حاضرین کو مخاطب کر کے کہا کہ "آپ لوگ گواہ ہیں کہ مجھ پر تبلیغ احکام دین کے باب میں جو واجب تھا اس کو میں نے اگرچہ حتی الامکان بغیر افراط یا تفریط کے پورا کیا اور اپنی تمام تر کوشش اس کام میں اتباعاً لسنۃ الید المختار صرف کی لیکن اب وقت سر پر آپہنچا کہ اپنے خدائے غفور و رحمٰن و رحیم کی بارگاہ میں حاضر کیا جاؤں۔ مجھ کو افسوس اور انفعال اس بات کا ہے کہ کوئی کام میرے ہاتھ سے لائق قبول عمل میں نہیں آیا۔ میں کسی طرح سزاوار عدل نہیں ہوں، محض اس کے فضل پر بھروسہ ہے۔"

ابھی یہ تقریر ختم نہیں ہوئی تھی کہ ان پر بیہوشی طاری ہوگئی۔ تھوڑی دیر کے بعد کسی قدر ہوش آیا۔ زبان سے کچھ کہنا چاہا، مگر بول نہ سکے۔ پھر اشارہ سے نماز کا وقت دریافت کیا، جب ان کو معلوم ہوا کہ نماز ظہر کے وقت میں ابھی کچھ دیر ہے تو آہستہ سے کہا کہ نماز کا وقت نہ آئے گا کہ ہم روانہ ہو جائیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ نماز ظہر سے پہلے ہی بروز پنجشنبہ ۱۲۵۳ / ۱۸۳۸ء میں ان کی روح عالم جاودانی کو پرواز کر گئی۔ محلہ شیخ پورہ قنوج میں دفن ہوئے۔ [1]

---

[1] سیرت والاجاہی حصہ اول

اولاد:

ان کے دو صاحبزادے تھے ایک مولانا سید احمد حسن عرشی دوسرے امیر الملک نواب صدیق حسن خاں والی بھوپال۔ دونوں کے سر سے ان کے والد کا سایۂ عاطفت بچپن ہی میں اُٹھ گیا تھا۔ اول الذکر کی عمر والد کے انتقال کے وقت قریباً سات برس کی تھی اور موخر الذکر کم و بیش پانچ سال کے تھے، اور تین لڑکیاں تھیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر ان دونوں صاحبزادوں کے حالات پر بھی کچھ تھوڑی سی روشنی ڈال دی جائے۔

سید احمد حسن عرشیؔ:

ان کی ولادت ۱۹/ رمضان ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء کو ہوئی، ابتدائی تعلیم اپنے وطن قنوج میں حاصل کی، پھر بغرض اکتساب علم کانپور، فرخ آباد، بریلی، علی گڑھ اور دہلی کا سفر اختیار کیا اور اساتذۂ وقت کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے، اور ان سے مستفید ہوئے۔ جملہ علوم نقلی و عقلی میں کمال حاصل تھا۔ عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں کے باکمال شاعر تھے، فارسی اور اردو شاعری میں غالب کے شاگرد تھے۔ ان کی شاعری کی بابت نواب صاحب لکھتے ہیں:

"در عربی ہمعنانِ شعرائے جاہلیت اند، و در فارسی ہم بزم عرفیؔ و نظیریؔ و در اردو مقتدائے آتشؔ و ناسخؔ۔"

یعنی عربی میں شعرائے جاہلیت کے ہم پلہ ہیں، اور فارسی میں عرفیؔ اور نظیریؔ

کے ہمنشیں، اور اردو میں آتش و ناسخ سے بلند۔"

ان کے مسلک کی بابت مصنف "سیرت والاجاہی"، لکھتے ہیں:

"مولانائے مرحوم کو عمل بالحدیث میں خاص شغف تھا۔ اور مقلدین مذہب سے (جن کو تحقیق و تدقیق سے کوئی حصہ نہیں ملا تھا۔) طبعی نفرت تھی۔ چنانچہ انھوں نے تقلید کے ذمائم و مفاسد کے متعلق بہت سے رسائل مطول و مختصر تالیف کیے۔ ج ۱ ص ۹۷

نواب صاحب لکھتے ہیں:

"دریں زمان آخر کسیکہ نصرت سنت کند ایشاں بودند، در رد تقلید ید طولیٰ داشتند۔ دیدہ نہ شد کہ باکسے دریں باب تقریرے و تحریرے بودہ باشد مگر آنکہ الزام سخت اورا دادند۔ در اصول فقہ امام عہد بودند، و سنن و آثار کتب ستہ گویا بر نوک زبان بود، تمام ہمت مصروف انتصار فرقہ اتباع می کردند۔ کتابے موسوم بشہاب ثاقب در ردِ تقلید بر وجہے نوشتہ اند کہ مثلش در ہند دیدہ و شنیدہ نہ شد۔

(اتحاف النبلاء، ص ۲۲۴)

یعنی اس آخری زمانے میں سنت کی حمایت کرنے والا اگر کوئی شخص ہے تو وہ یہ ہیں۔ رد تقلید میں ید طولیٰ رکھتے تھے، جس کسی سے بھی اس مسئلہ میں کوئی گفتگو ہوئی اس کو الزامی جواب میں سخت گرفت میں لے لیتے تھے۔ اصول فقہ میں اپنے زمانے کے امام تھے۔ صحاح ستہ کی حدیثیں گویا نوک زبان پر تھیں۔ اپنی تمام کوششیں فرقہ اتباع سنت (اہلحدیث) کی مدافعت میں صرف کرتے تھے۔ تقلید کی تردید میں "شہاب ثاقب" کے

نام سے ایک ایسی کتاب لکھی ہے کہ ہندوستان میں اس جیسی کوئی کتاب اب تک نہ دیکھنے میں آئی اور نہ سننے میں۔

اسی اتحاف النبلاء میں نواب صاحب نے "اسامی کتب و مؤلفین" کے ذیل میں جہاں اپنے بھائی مولانا سید احمد حسن قنوجی کی اس کتاب (شہاب ثاقب) کا ذکر کیا ہے وہاں لکھتے ہیں۔

"در استقرائی فقیر در رد تقلید کتابے جامع مثل وے دریں آخر زمان تالیف نیافتہ، ومؤلف وے در رسالۂ تنقید خود در حق وے گفتہ ـــ هو كتاب لو اجتمع اهل المشرق والمغرب على ابطاله لما قدروا بفضل الله تعالى - وفی الواقع ایں کتاب ہمچنیں است، وتصدیق ایں معنی ملتوی بر مطالعہ اوست بنظر انصاف ولیکن در حیات مؤلفش از سواد بر بیاض نرسیدہ فلیعلم۔ انتهى بلفظه۔

ترجمہ:۔ میرے استقراء میں رد تقلید کے باب میں ایسی جامع کتاب اس آخر زمانے میں نہیں پائی جاتی۔ اس کے مؤلف نے خود اس کتاب کے حق میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ (میری) اس کتاب کا جواب لکھنے کے لیے مشرق و مغرب کے سارے (مقلدین) جمع ہو کر بھی کوشش کریں تو انشاء اللہ وہ اس کا جواب نہ لکھ سکیں گے۔ نواب صاحب مؤلف کے اس دعوے کی تائید و تصدیق کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"فی الواقع یہ کتاب ایسی ہی ہے۔ مؤلف کے اس دعوے کی تصدیق اس بات پر موقوف ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ نظر انصاف سے کیا جائے۔ لیکن یہ کتاب مولف کی حیات میں شائع نہ ہو سکی۔"

نواب صاحب نے ان کے عمل بالحدیث اور انکار رائے و تقلید کا حال اس طرح بیان کیا ہے:

"دربارہ عمل بحدیث و انکار از رائے نمونہ حافظ ابن حزم و شیخ الاسلام ابن تیمیہ بودند، اما ایشاں را بر کتب ایں بزرگواراں اطلاعے نبودہ بجہت آنکہ تصانیف ایشاں در ہند موجود و میسر نیست۔ اگر روزے از دہر تو الیف ایں اکابر در انتصارِ سنت و رد بدعت و انکار تقلید و اختیارِ تحقیق بنظر ایشاں می گذشت و اطلاع و عبور بر ادلہ و براہین نقلیہ و حجج سمعیہ و دلائل سلفیہ ایشاں دست بہم می داد، خدا داند در رد تقلید چہ عجائب می نمودند زیرا کہ با وجود عدم اطلاع آنقدر ادلہ متفرقہ را یکجا کردہ بودند کہ در خیال نمی آید کہ کسی بعمرے دراز جمع می تواند کرد۔"

(اتحاف النبلاء ص ۲۲۴)

ترجمہ:۔ عمل بالحدیث اور انکار رائے کے بارے میں یہ حافظ ابن حزم اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا نمونہ تھے۔ البتہ ان بزرگوں کی تصانیف پر ان کو اطلاع نہ تھی اس لیے کہ ان حضرات کی تصانیف ہندوستان میں موجود اور میسر نہیں ہیں۔ اگر ان بزرگوں کی وہ کتابیں جو سنت کی حمایت، بدعت کی تردید، تقلید کے انکار اور تحقیق کے اختیار کرنے کے بارے میں ہیں ایک مرتبہ بھی ان کی (مولانا احمد حسن عرشی کی) نظر سے گزری ہوتیں اور ان اسلاف کے بیان کردہ براہین نقلیہ، حجج سمعیہ اور دلائل سلفیہ ان کے ہاتھ لگ گئے ہوتے تب تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ تقلید کے رد میں کیا کیا عجائبات دکھلاتے۔ جبکہ ان کتابوں پر اطلاع نہ ہونے کی صورت میں انھوں نے

اس قدر کثیر تعداد میں متفرق دلائل یکجا کر دیے تھے کہ کسی دوسرے کے لیے عمر دراز میں بھی ان کا اکٹھا کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

مولانا عرشی کا ایک خواب:

نواب صاحب نے اتحاف النبلاء اور ابجد العلوم، ان دونوں کتابوں میں مولانا سید احمد حسن عرشی مرحوم کا ایک خواب نقل کیا ہے۔ ہمارے نزدیک وہ بھی اس موقع پر قابل ذکر ہے، اس خواب کی تفصیلات عرشی صاحب نے خود اپنے قلم سے بیان کی ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

اما بعد فانی رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بمحروسۃ قنوج فی مبشرۃ اریتھا یوم الثلثاء فی الثامن من رمضان المبارک سنۃ خمس وستین بعد الف ومأتین من ھجرتہ صلی اللہ علیہ وسلم رأیتہ وھو حسین ولونہ ابیض من لون الحنطۃ وقد لایشتکی منہ قصر ولا طول، فرأیت انی اکلت معہ طعاماً واطال یدہ صلی اللہ علیہ وسلم الی قصعتی فقربت الادام الیہ فتناولہ بیدہ الشریفۃ، واخذ کانہ یاکل فی قصعتی وکانہ لم یکن فی قصعتہ طعام اوکان فاکلہ ولم یبق منہ شئ فقلت ایتھا الحضرۃ من رآکم فی ھذا الزمان وصحبکم فی المنام ھل یعد من اصحابکم؟ فاجاب بما مفھومہ انہ لا یعد منھم و

اعطانی فلوسا وسألت منه صلی اللہ علیہ وسلم ان بعض الناس یترکون حدیثکم بقیاس المجتہدین مع ان المجتہدین انما قاسوا اذا لم یجدوا حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، واوصوا اصحابہم بالعمل علی الحدیث، والناس فی ہذا الزمان قد غلوا فی ذالک وکفروا من ارشدہم الی اتباع السنۃ المخالفۃ لمذہبہم فشاہدت آثار الملال فی بشرتہ صلی اللہ علیہ وسلم من صنیع الناس ہذا، وصار یتحرک کان الملال بلغ فی القلب، وتیقنت من النظر الیہ انہ لا یرضی بصنیعہم ہذا، وکنت اذا سئلتہ عن شئی اری جسمی کانہ یمس جسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہو صلی اللہ علیہ وسلم لا یکرہ منہ بل یتعطف علی ویقبل الی بوجہہ، وجدت لہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد ہذہ المبشرۃ محبۃ عظیمۃ من قلبی حتی احببت ان جعلنی اللہ فداہ واقتل فی الجہاد وانا احمیہ، ووجدتہ صلی اللہ علیہ وسلم یرضی بالعمل للحدیث واللہ علی مانقول شہید وکفی بہ شہیدا انتہی۔

ترجمہ: میں نے قنوج میں ٨ رمضان مبارک ١٢٦٥ھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ آپ کا رنگ گیہوں کے رنگ سے بھی زیادہ صاف اور حسین تھا۔ آپ کا قد بھی معتدل اور متناسب تھا۔ میں نے دیکھا کہ میں کھانا کھا رہا ہوں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنا دست مبارک میرے برتن کی طرف بڑھایا۔ میں نے اپنا سالن آپ کے قریب کر دیا، آپ اس میں سے لیکر کھانے لگے، میں نے عرض کیا حضور!

جو شخص اس زمانے میں آپ کو دیکھے اور خواب میں آپ کی ہم نشینی کا شرف بھی حاصل کرے کیا وہ آپ کے صحابہ میں شمار کیا جائے گا۔؟ آنحضرتؐ نے اس کے جواب میں جو کچھ فرمایا تھا، اس کا مفہوم یہ تھا کہ نہیں۔ پھر میں نے دوسری گزارش یہ پیش کی کہ بعض لوگ مجتہدوں کے قیاس کے مقابلے میں آپ کی حدیثوں کو چھوڑ دیتے ہیں، حالانکہ ان مجتہدوں نے اسی وقت قیاس کیا تھا جب ان کو حدیث نہ ملی تھی، نیز انھوں نے یہ وصیت بھی کر دی تھی کہ جب حدیث مل جائے تو ہمارے قول کو چھوڑ کر حدیث پر عمل کیا جائے۔ اس زمانے میں تو لوگ اس معاملہ میں حد سے بڑھ گئے ہیں۔ یہاں تک کہ اس شخص کو کافر کہتے ہیں جو ان کو ان کے مذہب کے خلاف کسی سنت کی اتباع کی دعوت دیتا ہے۔ میں نے مشاہدہ کیا کہ لوگوں کے اس طرزِ عمل سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک پر رنج وملال کے آثار نمایاں ہیں۔ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی (اس وقت کی) کیفیت دیکھ کر یقین کر لیا کہ حضور کو لوگوں کا یہ طریقہ ناگوار اور ناپسند ہے۔ میں جب کوئی بات پوچھتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرا بدن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک کو چھو رہا ہے۔ مگر حضور اس کو برا نہ مانتے تھے۔ بلکہ مجھ پر جھک کر میری طرف مزید توجہ فرماتے تھے۔ اس خواب کے بعد سے میرے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بہت بڑھ گئی ہے۔ جی یہی چاہتا ہے کہ آپ کی حمایت میں خود کو قربان کر دوں۔ خدا کی راہ میں جہاد کروں اور قتل کیا جاؤں۔ میں نے محسوس کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حدیث پر عمل کرنے کی وجہ سے خوش ہیں۔ یہ جو کچھ میں نے کہا ہے اس پر اللہ گواہ ہے۔ اور اس کی گواہی کافی ہے۔"

وفات:

مولانا عرشی نے کئی بار حج بیت اللہ کا ارادہ کیا، لیکن ان کی والدہ ماجدہ یہ کہہ کر ان کو روکتی رہیں کہ انشاء اللہ تعالیٰ ہم سب مل کر ساتھ چلیں گے، تھوڑے دن ٹھہر جاؤ۔ کچھ روز تک وہ منتظر رہے مگر جب کوئی صورت سب کی روانگی کی نہ بن پڑی اور زیارتِ حرمین کے ذوق و شوق کے استیلاء نے ان کے دل میں زیادہ شورش پیدا کی تو وہ اکیلے ہی چل کھڑے ہوئے۔ منزل بمنزل طے کرتے ہوئے بڑودہ پہنچ گئے۔ مگر یہاں پہنچکر دفعتاً تپ اسہالی میں مبتلا ہو گئے اور ۹ر جمادی الاولیٰ ۱۲۷۷ھ / ۲۳ر نومبر ۱۸۶۰ء روزِ جمعہ کو انتقال فرما گئے اور وہیں دفن ہوئے۔

فرحمہ اللہ تعالیٰ وایانا برحمتہ الواسعة وغفرلنا وله بکرمه العمیم، وقد قال تعالیٰ ومن یخرج من بیته مهاجرا الی اللہ و رسوله ثم یدرکه الموت فقد وقع اجره علی اللہ۔

نواب صدیق حسن خاں صاحب:

مولانا سید اولاد حسن قنوجی رحمۃ اللہ علیہ کے دوسرے نامور صاحبزادے نواب صدیق حسن خاں قنوجی تھے۔ ۱۹ر جمادی الاولیٰ ۱۲۴۸ھ / ۱۴ر اکتوبر ۱۸۳۲ء کو بانس بریلی میں جہاں ان کی ننھیال تھی، پیدا ہوئے۔ کچھ دنوں کے بعد ان کی والدہ محترمہ ان کو بریلی سے لے کر قنوج میں جو آبائی وطن تھا چلی آئیں۔ یہ گزر چکا کہ ان کی عمر پانچ برس کی تھی کہ باپ کا سایہ ان کے سر سے اٹھ گیا۔ یتیمی کی حالت میں اپنی والدہ ماجدہ کی

آغوش میں پرورش اور تربیت پائی۔ لیکن والدہ محترمہ نے ان کی کس طرح تربیت کی۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایئے کہ نواب صاحب خود لکھتے ہیں کہ میں سات برس کا تھا۔ مکان کے دروازے پر مسجد تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب صبح کی اذان ہوتی اور میں سوتا پڑا ہوتا تو والدہ محترمہ مجھے اٹھا کر وضو کراتیں اور اپنے سامنے مجھ کو مسجد بھیج دیتی تھیں۔ کبھی گھر میں نماز پڑھنے نہیں دیتی تھیں۔ اگر نیند کی سستی کی وجہ سے میری آنکھ نہ کھلتی تو منہ پر پانی ڈال دیا کرتی تھیں۔ اس سبب سے نماز کی عادت لڑکپن سے برابر رہی۔ شاید دس برس کی عمر میں روزہ رکھوایا، تب روزہ کی عادت پڑی۔ [1]

اس تربیت کا یہ اثر ہوا کہ بری صحبتوں اور بری عادتوں سے ہمیشہ دور رہے۔ علماء اور صلحاء کی مجلسوں میں بیٹھنے انکی باتیں سننے اور ان کی نصیحتوں سے مستفید ہونے کا شوق دامنگیر رہا۔

علم دین کی تحصیل کی طرف بچپن ہی سے رغبت ہو گئی۔ خود لکھتے ہیں۔ "گھر میں والد مرحوم کا کتاب خانہ تھا۔ جب شیخ حسینی (ان کے والد کے خادم) کتابوں کو دھوپ دیا کرتے تھے تو ہمارا کھیل یہی تھا کہ ایک ایک کو کھول کر ہر جگہ سے دیکھتے اور پڑھتے۔ کوئی جگہ سمجھ میں آتی کوئی نہ آتی، محض ورق گردانی کی برکت سے علم کا شوق دل میں پیدا ہو گیا۔ [2]

اساتذہ:

اوائل عمر میں مختصرات فن کی تعلیم اپنے بڑے بھائی مولانا سید احمد حسن عرشی

---

[1] ابقاء المنن ص ۱۲، [2] ابقاء المنن ص ۱۲

سے حاصل کی پھر فرخ آباد، کانپور اور دہلی میں تکمیل کی۔ جن اساتذۂ علم سے انھوں نے سند لی ان کے نام یہ ہیں۔ شیخ حسین عرب بن محسن بن محمد الانصاری حدیدی، شیخ عبدالحق بن فضل اللہ نیوتنوی، مولانا شاہ محمد یعقوب دہلوی مہاجر مکہ معظمہ۔ شیخ یحییٰ بن محمد بن احمد بن حسن الحازمی قاضی عدن، علامہ سید نعمان خیرالدین آلوسی زادہ مفتی بغداد، صدر الافاضل صدر الدین خان دہلوی[1] دہلی کے قیام کے زمانے میں شیخ الکل حضرت میاں صاحب سید نذیر حسین محدث دہلوی مرحوم کو بھی دیکھا تھا مگر اتفاق صحبت کم ہوا۔[2]

ورود بھوپال پہلی مرتبہ:

اکیس سال کی عمر میں علوم متداولہ سے فراغت حاصل کر کے دہلی سے اپنے وطن قنوج واپس آئے۔ یہاں بمشکل چند ماہ ان کا قیام رہا۔ کیونکہ سوائے ان کے کوئی دوسرا مربی خاندان موجود نہ تھا۔ متعلقین اور عزیزوں کی معیشت کا دارومدار صرف ان کے قوت بازو پر تھا۔ وجہ کفاف بھی کوئی موجود نہ تھی جو زندگی کی ضرورتوں میں کافی ہوتی۔ اس پریشان حالی میں تلاشِ معاش کا خیال پیدا ہوا۔ اپنے محلہ کے ایک آدمی کی زبانی ریاست بھوپال کے حالات سن کر اور خدا کا نام لے کر بھوپال کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ ۲۵ روز کے بعد وہاں پہنچے اور ایک کرایہ کے مکان میں اترے۔

---

[1] ابجد العلوم ص ۹۳۹۔ [2] ابقار المنن ص ۱۳

اس وقت بھوپال کی ریاست نواب سکندر بیگم کے زیرِ حکومت تھی۔ ارکانِ حکومت میں کسی سے تعارف نہ تھا جس کی سعی و سفارش کی توقع ہو سکے۔ مجبوراً انھوں نے تائیدِ ربانی پر اعتماد کر کے اپنے ہاتھ سے ایک مختصر عرضداشت اپنے حالِ پر ملال کی لکھ کر منشی جمال الدین خان مدار المہام نائب اول ریاست کی خدمت میں پیش کی۔ شیخ علی عباس چریا کوٹی اتفاق سے وہاں موجود تھے، جو عالم بھی تھے اور کسی اعلیٰ عہدے پر وہاں فائز تھے انھوں نے ہمدردانہ حمایت و تائید کی۔ خدا کا فضل شاملِ حال تھا۔ رئیسہ معظمہ نواب سکندر بیگم کی خدمت میں نواب صاحب باریاب ہوئے، رئیسہ نے ان کی تقرری منظور فرمالی اور غرۂ رمضان ۱۲۷۱ھ سے تیس روپئے مشاہرہ پر منشی گری کی خدمت ان کو تفویض ہوئی۔ پھر حسن خدمت کے صلہ میں جلد ہی ترقی کر کے میر دبیری کے منصب پر پہنچے۔ مشاہرہ میں بھی اضافہ ہوا۔ اولاً چالیس روپئے اور بعد میں پچاس روپئے رہ گئے۔ مگر خدا کی شان اسی دوران میں شیخ علی عباس صاحب سے مسئلہ حقہ کشی پر بحث ہو گئی۔ نواب صاحب اباحت کے اور شیخ صاحب موصوف تحریم کے قائل تھے۔ بحث نے اس قدر طول کھینچا کہ مناظرہ سے مناقشہ اور مناقشہ سے منافرت کی نوبت پہنچی۔ یہی منافرت ریاست کی خدمت سے نواب صاحب کی معزولی کا سبب ہوئی۔

وطن کی طرف واپسی:

ریاست بھوپال سے جب سلسلۂ ملازمت منقطع ہو گیا تو ۱۶/ محرم ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۶ء کو وطن روانہ ہو گئے، وطن پہنچکر معاش کی بابت کوئی اطمینان کی صورت نہ پیدا ہوئی۔

اسی پریشانی اور فکر میں تھے کہ ملک میں انگریزی حکومت کے خلاف ۱۸۵۷ء کا مشہور ہنگامہ شروع ہوگیا۔ فرخ آباد اور قنوج بھی اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ فرخ آباد کے ایک رئیس کی فوج سے انگریزی فوج کی جھڑپ ہوگئی۔ اس جنگ میں تمام رعایائے شہر کے مکانات مسمار اور زراعتیں برباد ہوگئیں اور ان کا تمام اثاث البیت سکھوں اور پنجابیوں کی غارت گری کی نذر ہوگیا۔ دوسرے روز قتل عام کا غلغلہ زور وشور سے بلند ہوا اور مارشل لا کے جاری ہونے کی افواہیں فرخ آباد سے قنوج اور قنوج سے تمام نواح اور مقامات شہر میں پھیل گئیں۔ ہر طرف ایک بھگدڑ سی مچ گئی، سارا گھر لٹ گیا۔

افسوسناک تنگدستی:

نواب صاحب کے والد سید اولاد حسن قنوجی کے معتقدوں اور ارادتمندان خاص نے جب یہ حالت دیکھی تو وہ نواب صاحب کو اور ان کی بہنوں کو، ان کی والدہ کو اپنے ہمراہ بلگرام لے آئے۔ یہاں ایک مکان کرایہ کا لے کر یہ کاروانِ آفت رسیدہ اتارا گیا۔ چند مہینے یہاں قیام رہا۔ درحقیقت یہ زمانہ ہندوستان کے لیے بڑا مصیبت خیز اور اندوہناک زمانہ تھا۔ نواب صاحب کا یہ حال تھا کہ کئی مہینہ تک صرف ایک سیاہ موٹا کپڑا اور سوکھی ہوئی باسی روٹی پر وقت گزاری کرنا پڑی۔ جب کپڑا پھٹ جاتا، اپنے ہاتھ سے سی لیتے، جب میلا ہو جاتا خود دریا پر جا کر دھولاتے۔ متعلقین کا بھی اس سے زیادہ بہتر حال نہ تھا۔ مگر باوجود اس تنگدستی اور فاقہ مستی کے نہ کسی سے کبھی قرض لیا اور نہ کسی کے سامنے کبھی دست سوال پھیلایا۔ ایسی حالت بے مائیگی پر صابر اور قانع رہے۔ اسی زمانے کا ایک روز کا ذکر ہے کہ وہ نہانے اور کپڑا دھونے کے لیے دریا پر گئے۔ کپڑے اتار کر

کنارے پر رکھے اور پانی میں اتر کر غسل کرنے لگے۔ اتفاق سے سکھ اور پنجابی پلٹن کے کچھ سپاہی ادھر سے گزرے۔ چونکہ نواب صاحب کا سرخ وسفید کھلا رنگ تھا اس لیے سپاہیوں کو ان پر انگریز ہونے کا شبہ گزرا، ان سپاہیوں نے لپک کر ان پر بندوق کا فیر کرنا چاہا۔ مگر خوش قسمتی سے ایک دیہاتی اُدھر سے آرہا تھا جو چند سال قبل قنوج میں کاشتکاری کر چکا تھا اور وہاں کے دیہات کا مکھیا تھا۔ وہ دوڑا اور ان سپاہیوں سے چلا کر کہا، ایسا غضب نہ کرنا، یہ تو بڑے حضرت کے صاحبزادے ہیں۔ میں ان کو برسوں سے خوب جانتا پہچانتا ہوں۔ جب سپاہیوں کو اس کے بیان اور گواہی پر پورا اطمینان ہوگیا تو وہاں سے چلے گئے۔ نواب صاحب نے خدائے ارحم الراحمین کا شکر ادا کیا اور نہا دھو کر گھر واپس آئے۔

بلگرام میں قیام کے زمانے میں بیکاری اور روزافزوں تفردات سے تنگ آکر نواب صاحب نے چاہا کہ کوئی ایسا مفید مشغلہ اختیار کیا جائے جس میں وقت بھی اچھی طرح کٹے اور آشفتہ خاطری کو ایک گونہ تسلی وتشفی بھی حاصل ہو۔ یہ خیال کر کے انھوں نے قرآن مجید حفظ کرنا شروع کردیا، اور تھوڑے ہی دنوں میں یاد کرلیا۔ له جب ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی شورش رفتہ رفتہ کم ہوئی تو سب عزیزوں کو ساتھ لے کر بلگرام سے قنوج چلے آئے۔ یہاں پہنچنا تھا کہ خانہ داری کی ضرورتوں نے خیر مقدم کیا، چارو ناچار وطن کو چھوڑ کر تہیۂ سفر کیا۔

ورودِ بھوپال دوبارہ:

خوش قسمتی سے اسی دوران میں بھوپال کی رئیسہ جناب سکندر بیگم صاحبہ نے

ان کی طلبی کا فرمان دانہ خود بھیجا، برسات کا موسم تھا زور و شور سے بارش ہو رہی
تھی، اسی حالت میں ان کو جانب بھوپال روانہ ہونا پڑا۔ گیارہ روز میں ریاست
ریواں ہوتے ہوئے وہ جبل پور پہنچے، بارش کی کمی کے انتظار میں ایک جگہ بیس
تک مہمان رہے۔ مگر جب انھوں نے موسلا دھار پانی میں کسی قسم کی کمی نہ دیکھی تو
مجبوراً وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ایک ندی پر سے گزر ہوا جو متواتر بارش کے
سبب بالکل بھر گئی تھی، رات کا وقت تھا، کرایہ کا یکہ مع گھوڑے کے اس میں جا
طغیانی آب کی وجہ سے قریب تھا کہ وہ بھی غوطے کھا کر اس میں ڈوب جائیں۔ اتفا
سے ندی کے وسط میں ایک سنگ گراں پڑا ہوا تھا اور اس کا ایک بڑا حصہ باہر نکلا
ہوا تھا جو پانی کے بہاؤ اور موجوں کے تلاطم کا سد راہ تھا وہ اس کی سطح مرتفع پر چڑھ
بیٹھ رہے اور صبح تک اسی حالت میں اس پر بیٹھے رہے، بارش کا سارا پانی ان کے سر
سے گزر رہا تھا۔ جب صبح ہوئی اور آفتاب طلوع ہوا۔ راہ گیر ادھر ادھر آنے جانے
اس وقت ان کو اس مصیبت سے نجات ملی، کپڑے خشک کیے۔ سواری ٹھہرائی، اور
سوار ہو کر آگے روانہ ہوئے۔ اس طرح بہ ہزار تکلیف و دشواری یوکھی صفر
کو وہ بھوپال پہنچے۔

بھوپال پہنچ کر ریاست کے نائب اول مدار المہام منشی جمال الدین خاں بہا
سے ملاقات ہوئی۔ اپنی تمام سرگزشت ان سے بیان کی، وہ مصائب سفر کا حال
سن کر بہت دلگیر ہوئے، مگر بھوپال چلے آنے سے ان کو بہت خوشی ہوئی۔ پھ
انھوں نے رئیسہ معظمہ سے جا کر سب حال عرض کیا، اور ان کی حاضری کی اطلاع د
مگر چونکہ پہنچنے میں دیر ہو گئی تھی، اس درمیان میں معاندین اور حاسدین نے رخنہ اندا

ر کے حکم منسوخ کرادیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ریاست سے چلے جانے کا فرمان جاری ہوگیا۔
خر یہ شعر پڑھ کر ۹ ربیع الاول ۱۲۷۵ھ کو بھوپال سے رخصت ہوگئے ؎

ما ز بھوپال گزشتیم تو دل شاد نشیں

قفلے بر در مزن و خار بہ دیوار مبند

چند ماہ ٹونک میں:

اثنائے سفر میں ان کا گذر ریاست ٹونک میں ہوا۔ حضرت سید احمد شہید بریلوی
کے خویش سید اسمٰعیل صاحبؒ نے ان کو اپنا خاص مہمان بنایا۔ نواب وزیرالدولہ
امیر الملک محمد وزیر خاں کو اطلاع ہوئی تو والاجاہ سے ٹونک میں اقامت اختیار
رنے پر اصرار کیا، اور ساتھ ہی پچاس روپیہ مشاہرہ بھی مقرر کر دیا۔ اس تعلق نے ان
و ٹونک کے قیام پر مجبور کر دیا۔ مگر وہاں کی طرز معاشرت کی ناشائستگی اور طریقہ بود و
ش کی تمام خرابی سے والاجاہ ہمیشہ متنفر اور دل برداشتہ رہا کرتے تھے۔ آخر آٹھ ماہ
ں اقامت کے بعد ترک تعلق کا ارادہ کر کے چار مہینے کی رخصت کی درخواست دیدی۔
بھی اس درخواست کی منظوری کا حکم صادر نہیں ہوا تھا کہ یکایک بھوپال سے ایک خط منشی
جمال الدین خاں کا جو ریاست کے نائب اول تھے اور ایک فرمان طلبی نواب سکندر بیگم صاحبہ
ئیسہ کا پہنچا، اس خط اور فرمان کے مضمون سے ان سب شکوک و اوہام کا بھی پورا ازالہ
ہوگیا جو بعض افترا پردازوں نے رئیسہ محترمہ کے دل میں پیدا کر دیے تھے۔ دو چار روز
کے بعد دربار ٹونک سے درخواست رخصت بھی منظور ہو کر آگئی۔ ۲۰ ذی الحجہ ۱۲۷۵ھ
وانا جاہ ٹونک سے بھوپال کی طرف روانہ ہوگئے۔

ورودِ بھوپال تیسری مرتبہ :

۱۰ر محرم ۱۲۷۶ھ / ۱۸۵۹ء کو بھوپال پہنچے، اور یکم صفر کو ریاست کی تاریخ نگاری کی خدمت ان کو تفویض کی گئی، نواب صاحب کے حق میں بھوپال اب وہ پہلا بھوپال نہ تھا۔ عروج نے قدم چومے اور اقبال خود کو نچھاور کرنے لگا۔ چنانچہ کم و بیش ڈیڑھ سال کے بعد نائب اول ریاست مدار المہام منشی جمال الدین خان نے اپنی چھوٹی صاحبزادی سے (جو بیوہ تھیں) نکاح کر دیا۔ نواب صاحب کی یہ پہلی شادی تھی۔ انھیں کے بطن سے "سیرت والاجاہی" کے مصنف نواب علی حسن خاں پیدا ہوئے تھے۔ یہ بڑی دیندار راسخ الاعتقاد موحدہ خاتون تھیں۔ نماز بڑے اہتمام کے ساتھ اوقات معینہ پر ادا کرتی تھیں۔ اردو اور فارسی، دونوں زبانوں میں اچھی مہارت تھی۔ گلستاں کی سادہ عبارت اس کے شگفتہ جملے، اور بوستاں کے ناصحانہ دلکش اشعار ان کی نوکِ زباں پر تھے۔ بات بات میں وہ بے تکلف گلستاں کی ضرب المثلیں بول جاتی تھیں۔ تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں یکم رمضان ۱۳۰۱ھ / ۱۸۸۴ء کو بھوپال میں انتقال کیا، اور یہیں اپنے والد کے مزار کے پاس مدفون ہوئیں۔ نواب صاحب نے خود ہی ان کے جنازے کی نماز پڑھائی تھی۔

رئیسہ بھوپال نواب سکندر بیگم کے انتقال کے بعد ان کی صاحبزادی نواب شاہجہاں بیگم سریر آرائے سلطنت ہوئیں، ان کا پہلا نکاح نواب نظیر الدولہ بخشی باقی محمد خاں بہادر کے ساتھ ہوا تھا، جو نکاح کے بعد غالباً بارہ سال تک زندہ رہے نواب نظیر الدولہ کی وفات کے پانچ مہینے کے بعد نواب شاہجہاں بیگم مسند نشین ریاست ہوئی تھیں۔

عنانِ حکومت ہاتھ میں لیے ہوئے۔ جب تین سال گزر گئے تو رئیسہ عالیہ نواب شاہجہاں بیگم نے محسوس کیا کہ نظم و نسق ملکی کی ذمہ داریاں روز بروز بڑھتی جارہی ہیں۔ ضرورت ہے کہ کسی قابل اعتماد، مدبر، منتظم، عالم و خطیب، ذی وجاہت، شریف، خدا پرست اور ماہرِ اصولِ ریاست و معدلت کو مشیر امور مملکت اور اپنا ہمدم و محرم راز بنایا جائے۔ نگاہ انتخاب والا جاہ نواب صدیق حسن خاں پر پڑی جو سترہ سال سے ریاست کی خدمت محنت و جانفشانی اور دیانت و وفاداری کے ساتھ انجام دے رہے تھے۔ والا جاہ نے بھی منظور کیا۔ ۸ رشوال ۱۲۸۸ھ / ۱۸۷۰ء کو نکاح ہوگیا۔ پچیس ہزار روپیہ مہر مقرر ہوا تھا، جس کو بعد میں نواب صاحب نے یکمشت ادا کر دیا تھا۔ اور چھ ہزار روپیہ سالانہ مصارف نان و نفقہ کے طور پر برابر دیا کرتے تھے[1] اس رشتہ کے بعد اللہ نے آپ کو دین و دنیا کے اعلیٰ مراتب پر فائز فرمایا۔ علم دین اور علمائے دین کو عروج اور سربلندی حاصل ہوئی۔ عرصہ تک بھوپال کتاب و سنت کے حاملین کا مرجع بنا رہا۔ مختلف علوم و فنون پر خود والا جاہ نے بہت سی کتابیں لکھیں، اور بہت سی دینی کتابیں جو بیش قیمت ہونے کے ساتھ نایاب ہو چکی تھیں، عرب و عجم سے گراں بہا قیمتوں پر حاصل کر کے، مصر، بیروت اور ہندوستان کے مختلف مطابع میں لاکھوں روپیہ خرچ کر کے چھپوائیں، اور پھر تحفۃً قدر دانوں کو نذر کر دیں۔ فتح الباری کا قلمی نسخہ چھ سو روپیہ میں خریدا، اور ہزاروں کی لاگت سے چھپوا کر مفت تقسیم کیا۔ گورنمنٹ کی طرف سے "نواب والا جاہ امیر الملک سید محمد صدیق حسن خان بہادر" کا خطاب ملا تھا۔

---

[1] الفا المنن ص ۵۱

تیرہ چودہ سال تک یہ خطاب و منصب حاصل رہا پھر حاسدین و مبغضین کی ریشہ دوانیوں اور مخالفانہ کوششوں کی وجہ سے نوابی کا خطاب انگریزوں نے چھین لیا۔ جن شکایتوں سے انگریز افسروں کے کان بھرے ان میں بڑی شکایت یہ تھی کہ نواب صدیق حسن خان انگریزی حکومت کے خلاف جہاد کرنے کی ترغیب دیتے ہیں، اور مذہب وہابیت کی تبلیغ کرتے ہیں[۱] رئیسہ شاہجہاں بیگم ان الزامات کے دفعیہ اور خطاب کی واپسی کے لیے برابر کوشش کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ پانچ برس گے بعد ان کی درخواست کی منظوری اور دوبارہ خطاب کی واپسی کی اطلاع گورنمنٹ انگلشیہ کی طرف سے اس وقت آئی جبکہ نواب صاحب اس دنیا سے رحلت فرما چکے تھے۔ نواب صاحب کی وفات ۲۹ جمادی الاخری ۱۳۰۷ھ مطابق ۲۰ فروری ۱۸۹۰ء کو بھوپال میں ہوئی اور وہیں دفن کیے گئے۔ غفر اللہ لہ ورحمہ

مرثیہ:

شعرائے ہندوستان اور سخنوران ریاست نے والاجاہ کی وفات کے بعد بکثرت مرثیے اور قطعات تاریخ لکھے۔ ان میں سے مولوی جمیل احمد صاحب سہسوانی مرحوم کے مرثیے سے چند اشعار ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔ نواب صاحب کی دینی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اب کون یوں کرے گا اشاعت حدیث کی — ہے کس کے دل میں اتنی محبت حدیث کی
لطف اس کا کس زبان سے سن کر اٹھائیں گے — قرآن کا یہ مزا ہے یہ لذت حدیث کی

---

[۱] سیرت والاجاہی ص ۱۳۰

لغو و رفث سے ان کی زباں آشنا نہ تھی — کہتے جو کوئی بات تو آیت حدیث کی
بے مایۂ حدیث ہوئے کیسے مایہ دار — کیسی لٹی دھڑلّے سے دولت حدیث کی
دن رات، صبح و شام یہی مشغلہ رہا — حق تو یہ ہے کہ خوب کی خدمت حدیث کی
کیسا محدّث آہ زمانے سے اٹھ گیا — حالت ہے آج قابلِ رقت حدیث کی
اب قدرداں کہاں کوئی اہلحدیث کا — سمجھے ہوئے تھے کچھ وہی وقعت حدیث کی
افسوس کارخانۂ ملت بگڑ گیا — ہے ہے شگفتہ باغِ شریعت اجڑ گیا

دُعا:

اس مرثیے کے آخر میں والاجاہ مرحوم کے لیے جو دعائیں کی گئی ہیں۔ آئیے ہم بھی اس میں شریک ہو جائیں۔

اللہ ان کو روضۂ رضواں عطا کرے — حور و قصور و نعمت ایواں عطا کرے
جو بہ جائیں وہ حصول ہو جو مانگیں وہ وصول — اپنی طرف سے ان کو ان کی زباں عطا کرے
دے تیز رو نجیب وہاں سیر کے لیے — خدمت کے واسطے انھیں غلماں عطا کرے
پینے کو آبِ کوثر و تسنیم و سلسبیل! — کھانے کو میوہ ہائے فراواں عطا کرے
ملک کبیر و فوز عظیم و سرور و عیش! — اللہ انکو یاں کے عوض واں عطا کرے
اپنے جمالِ پاک کی رویت کرے نصیب — نقد و فور رحمت و رضواں عطا کرے

جو کان سے سنا ہو نہ دیکھا ہو آنکھ سے
جنت میں وہ نشاط کا ساماں عطا کرے

(سیرت والاجاہی حصہ سوم)

نواب صاحب کا مسلک:

آج اہلحدیث ہی نہیں، احناف میں بھی حضرت نواب صاحب قدس سرہٗ کا مسلکاً اہلحدیث ہونا اتنا مشہور و معروف ہے کہ شاید بہتوں کو اس پر تعجب ہوگا کہ اس عنوان پر گفتگو کرنے کی ہم نے ضرورت کیوں محسوس کی؟ قصہ یہ ہے کہ نواب صاحب کے صاحبزادے نواب علی حسن خاں مرحوم نے "مآثر صدیقی" (موسوم بہ سیرت والاجاہی) میں نواب صاحب کے مسلک کی بابت بعض ایسی باتیں لکھدی ہیں جو اب تک تو قابلِ التفات نہیں سمجھی گئی تھیں۔ لیکن آج کل بعض لوگوں نے ان کو اچھالا ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ دلائل اور واقعات کی روشنی میں اس مسئلہ کی حقیقت بھی واضح کردی جائے۔

سیرت والاجاہی کا بیان:

نواب صاحب کے مسلک کے متعلق مصنف سیرت والاجاہی کا ایک بیان تو یہ ہے لکھتے ہیں:

"سنی خالص، محمدی قح، موحد بحت، متبع کتاب و سنت، حنفی مذہب، نقشبندی مشرب تھے۔ اور ہمیشہ طریقۂ اسلاف پر مذہب حنفی کی طرف اپنے کو منسوب کرتے تھے، مگر عملاً واعتقاداً اتباعِ سنت کو مقدم رکھتے تھے۔ چنانچہ خود لکھتے ہیں۔ "باقتضائے نیاکان زیرک و دانشمندان سترگ در ظاہر انتساب بروش امام ابوحنیفہ معروف است، لیکن ہموارہ گفتار و کردار را باتباع سنت آرائش دارد۔" (سیرت والاجاہی حصہ چہارم ص ۱)

ان کا دوسرا بیان یہ ہے لکھتے ہیں:

"والاجاہ مرحوم نماز پنجگانہ حنفی طریقہ پر پڑھتے تھے۔ البتہ ان کو فاتحہ خلف الامام اور اول وقت کا خاص اہتمام مد نظر رہتا تھا۔"

(کتاب مذکورہ ص ٦٣)

نواب صاحب کی تالیفات ان کے مضامین اور تحریروں کا جہاں تک ہم نے مطالعہ کیا ہے، ان کی بنیاد پر اور اس زمانے میں جبکہ نواب صاحب کے رفقاء اور معاہدین ایک ایک کر کے سب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں، ان چیزوں کے سوا کوئی دوسری چیز اس بحث کی بنیاد بن بھی نہیں سکتی۔) ہم پورے وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ "سیرت والاجاہی" کے یہ دونوں بیان غلط اور ناقابل اعتبار ہیں۔ حتیٰ کہ فارسی کی وہ عبارت بھی ان کے مدعا کی مثبت نہیں ہے جس کو انھوں نے اس موقع پر اپنی تائید میں پیش کیا ہے۔ ہم ان دونوں بیانوں پر علی الترتیب الگ الگ گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

"سیرت والاجاہی" کے دعویٰ اور دلیل میں مطابقت نہیں

مصنف "سیرت والاجاہی" نے دعویٰ یہ کیا ہے کہ نواب صاحب "ہمیشہ مذہب حنفی کی طرف اپنے کو منسوب کرتے تھے۔" "منسوب کرنے" کے صاف معنی یہ ہیں کہ نواب صاحب اپنے متعلق خود کہا کرتے تھے یا لکھا کرتے تھے کہ "میں حنفی ہوں" اور ایسا وہ "ہمیشہ" کرتے تھے۔ بالفاظِ دیگر "سیرت والاجاہی" نے حنفی مذہب کی طرف سے انتساب کو خود نواب صاحب کا فعل بتایا ہے لیکن اس کے ثبوت اور تائید میں فارسی کی جو عبارت انھوں نے نقل کی ہے وہ ہرگز اس دعوے کے مطابق نہیں ہے۔ اس میں نواب صاحب

نے مذہب حنفی کی طرف انتساب کو اپنا فعل نہیں قرار دیا ہے اور نہ یہ تسلیم کیا ہے کہ میں حنفی ہوں۔ ہاں یہ البتہ کہا ہے کہ مذہب امام ابو حنیفہ کی طرف انتساب "معروف ہے" یعنی انتساب کی نسبت انھوں نے عرف کی طرف کی ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ لوگوں کا عمل ہے، خود ان کا اپنا عمل یہ نہیں ہے۔ اس لیے اس عبارت سے یہ دعوی تو ثابت نہیں ہوتا کہ نواب صاحب اپنے کو مذہب حنفی کی طرف منسوب کرتے تھے، اور جب یہ ثابت نہ ہوا تو یہ بھی ثابت نہ ہوگا کہ وہ "حنفی مذہب" تھے۔

رہا عرف کا معاملہ، تو اس کے اعتبار سے یہ عبارت دو معنوں کا احتمال رکھتی ہے، ایک یہ کہ لوگ اپنے کو حنفی مذہب کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اور ہر چند یہ انتساب لوگوں میں معروف و مشہور ہے۔ لیکن میں نے اس شہرت کی پیروی نہیں کی۔ میں نے اتباعِ سنت کو اختیار کیا ہے۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ نواب صاحب نے اپنے ہی متعلق یہ بات کہی ہو کہ بظاہر ان کا انتساب حنفی مذہب کی طرف معروف ہے، مگر پھر ساتھ ہی انھوں نے حرفِ استدراک (لیکن) سے اس توہم کو بھی دفع کیا ہے کہ اس ظاہری انتساب کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے کہ میں امام ابو حنیفہ کا مقلد اور ان کے اقوال کا پابند ہوں۔ میں نے اپنے قول و عمل کو تقلید کے عیب سے بچا کر اتباعِ سنت کی زینت سے آراستہ کیا ہے۔

اس عبارت کا ایک بڑا اہم لفظ مصنف "سیرت والاجاہی" نے نقل نہیں کیا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پوری عبارت قارئین کے سامنے رکھی جائے تا کہ نواب صاحب کا صحیح منشاء ان کی سمجھ میں آجائے۔ نواب صاحب لکھتے ہیں۔

عبارت کا پورا متن اور اس کا صحیح مطلب:

"امروز کہ چہل وہشت مرحلہ از عمر گرامی طے شدہ باآنکہ استخواں در تن ناتواں کہنہ شد، وموئے سر بسفیدی چوں شعلہ تاباں گردید، آثار گرمی درونی وسوز باطن ہمچناں افزائش دارد وبہ نکات دل افروز بروز ظہوری دارد، در آئین مالکؒ وشافعیؒ وابو حنیفہؒ وابن حنبلؒ گوناگوں دریافت اصولاً وفروعاً بہم آمد۔ وبقلم وزری بخت بیدار وتکاپوی طالع سازگار، بر پایۂ اجتہاد ومجتہداں وقوف حاصل شد، ہر چند باقتفاء نیاکان بزرگ ودانشمندان سترگ در ظاہر انتساب بروش ابو حنیفہؒ معروف است لکن ہموارہ گفتار وکردار را باتباع سنت آرائش دارد۔"

(المغنم البارد ص ۱۳)

ترجمہ:۔ آج جبکہ میں اپنی عمر عزیز کی ۴۸ منزلیں طے کر چکا ہوں، بدن کی ہڈیاں بھی پرانی ہوگئی ہیں۔ سر کے بالوں میں سفیدی چمک رہی ہے۔ سوز باطن بھی ترقی پر ہے امام مالک وامام شافعی وامام ابو حنیفہ وامام ابن حنبل رحمہم اللہ ہر ایک کی فقہ وآئین کو اصولاً وفروعاً ہر طرح سے جان چکا ہوں، اور خوش قسمتی سے مجتہدوں کے پایۂ اجتہاد سے بھی واقفیت حاصل کر چکا ہوں۔ ایسی حالت میں بزرگوں کی اتباع اور دانشمندوں کی پیروی میں ظاہری طور پر امام ابو حنیفہ کے طریقے کی طرف انتساب (چاہیے) چاہے بھی ہو مشہور ہو لیکن (اس انتساب کے معنی یہ نہیں کہ میں ان کا مقلد ہوں) میں اپنی گفتار وکردار کو تقلید کے عیب سے بچاکر اتباعِ سنت کی زینت سے آراستہ کرتا ہوں۔"

یہ پوری عبارت کے معنی اور مفہوم پر غور کیجیے۔ نواب صاحب نے سب سے پہلے اپنی عمر کی مدت بیان کی ہے، جس سے ان کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی عمر کی اس منزل میں پہنچ گئے ہیں جو طبعی طور پر ان کے فہم و دانش کے کمال کی منزل مانی جاتی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اللہ تعالیٰ کے اس انعام کا ذکر کیا ہے جو علم دین کے متعلق ان کو عطا کیا گیا تھا۔ انھوں نے بتایا ہے کہ چاروں اماموں نے فقہی مسائل اور ان کے استخراج و استنباط کے اصول و قواعد، آئین اور ضابطے، سب پر ان کو عبور حاصل ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ کون مجتہد کس درجے کا فقیہ ہے، کس کا اجتہاد کتاب و سنت کے موافق ہے اور کس کا اس کے خلاف۔ اپنے علم و فہم کے اس رسوخ اور کمال کا اظہار کر لینے کے بعد تب انھوں نے لکھا ہے۔ ہر چند باقتضائے نیاکان بزرگ ودانشمندان سترگ در ظاہر انتساب .... یعنی جب اللہ تعالےٰ نے عقل و فہم کے کمال کی منزل تک پہنچا دیا ہے اور فقہ و اصول فقہ کا علم بھی وافر عطا فرمایا ہے۔ ایسا علم جو چاروں اماموں کے اصول و فروع پر گوناگوں طریقے سے حاوی ہے۔ مجتہدوں کے باہم اجتہاد اور ان کے اقوال و آراء کے خطا و صواب کے معرفت کا ملکہ بھی حاصل ہو تو ایسی صورت میں کسی کا مقلد بن کر، ہر مسئلہ میں اس کی رائے کو بلا دلیل مان لینا اور خود کو اس کا پابند بنا کر رکھنا، یہ میرا کام نہیں ہے۔ اس لیے "ہر چند" اپنے بزرگوں کی پیروی میں لوگوں کا انتساب ظاہر میں (رسمی طور پر) حنفی مذہب کی طرف معروف ہے۔ لیکن میرے نزدیک اس شہرت کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ میں نے اتباع سنت کی راہ اختیار کی ہے۔ یا نواب صاحب کا مقصد یہ ہے کہ "ہر چند" ظاہر میں میرا انتساب حنفی مذہب کی طرف معروف ہے، لیکن اس ظاہری انتساب کا مطلب مقلد ہونا نہیں ہے۔

کیوں کہ یہ تو مجھ جیسے شخص کے لیے ایک عیب کی بات ہے۔ میں نے اپنے قول وعمل اور گفتار و کردار کو تحقیق و بصیرت کی روشنی میں سنت کی پیروی سے آراستہ کیا ہے۔

اہلِ علم سمجھ سکتے ہیں کہ نواب صاحب کی محولہ بالا عبارت میں لفظ "ہر چند" کو اپنے سیاق و سباق کے ساتھ کتنا گہرا تعلق ہے، اس کے بعد وہ خود فیصلہ کریں کہ کیا ہماری یہ شکایت بے جا ہے کہ مصنف "سیرت والاجاہی" نے اس عبارت کا ایک بڑا اہم لفظ نقل نہیں کیا ہے ؟۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اس عبارت سے نواب صاحب کا "حنفی" (بہ معنی مقلد امام ابو حنیفہ) ہونا ہرگز ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس کے برخلاف اسی عبارت سے ان کا محقق (غیر مقلد) متبعِ سنت ہونا واضح طور پر ثابت ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ اگر "انتساب معروف" سے اتباعِ سنت کا حق ادا ہو جاتا تھا تو پھر اس استدراک کے ذریعہ کس توہم کو دفع کیا گیا ہے کہ ..... ، "لیکن ہموارہ گفتار و کردار را باتباعِ سنت آرائش دارد"؟ نیز اگر وہ مقلد ہی تھے تو اس اہتمام کے ساتھ اپنے علمی کمال اور جامعیت کے بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی ؟

نواب صاحب کی بعض دوسری عبارتوں سے اس کی تائید:

"انتساب معروف" کا تعلق نواب صاحب ہی کی ذات سے مان کر عبارت زیرِ بحث کا جو مطلب ہم نے بیان کیا ہے اس کی تائید نواب صاحب کی دوسری کتابوں سے بھی ہوتی ہے۔ منجملہ ان کے ایک کتاب "القاء المنن بالقاء المحن" ہے جو نواب صاحب کی وفات سے ڈھائی تین سال پہلے کی تالیف ہے۔ اسی

کتاب[1] کے حوالے سے چند عبارتیں ہم یہاں نقل کرتے ہیں، نواب صاحب لکھتے ہیں:

● میں نے ابتدارِ طلب علم میں کتب فقہ حنفی کو بھی موافق رواج اس ملک کے پڑھا تھا۔ پھر شعور بڑھا تو مذاہب ائمہ ثلاثہ پر بھی عبور کیا اور فروع میں ادلۂ مذاہب اربعہ پر اطلاع حاصل ہوئی، اور اچھی طرح ہوئی۔ ہر مذہب کی دلیل کو میزان تحقیق میں بقاعدہ علمار جامعین وزن کیا، جس مسئلہ کو دلیلاً راجح پایا اسی کا میں قائل ہوا۔

بعد عبور کے مذاہب اربعہ پر میں نے اتباع دلیل کا اختیار کیا ہے۔ جو مذہب موافق دلیل قوی و صحیح کے ہوتا ہے وہی میرا مختار ہے، خواہ مذہب حنفی ہو یا شافعی یا مالکی یا حنبلی۔ میں کسی مذہب کا ترک و رد براہ تعصب کے نہیں کرتا ہوں۔ نہ کسی مذہب کا اخذ براہ ہوائے نفس کے۔ مثلاً مسئلہ آب میں مذہب مالک اقوی المذاہب ہے اور مسئلہ صیغ تشہد میں مذہب امام ابو حنیفہ اصح الاقوال ہے، اور مسئلہ صفات میں مذہب امام احمد اقوی المذاہب ہے۔ وعلیٰ ہذا القیاس میری کل تالیف میں اسی قاعدہ کی رعایت و حمایت ہے۔

اس اعتبار سے اگر میں آپ کو حنفی کہوں یا شافعی یا مالکی یا حنبلی کہوں تو کچھ کذب لازم نہیں آتا ہے، اور اگر سنی محض کہوں تو بالکل

---

[1] نواب صاحب کی وفات ۱۳۰۷ھ میں ہوئی اور اتقار المنن انھوں نے ذی الحجہ ۱۳۰۴ھ میں لکھی جیسا کہ کتاب کے آخر میں مذکور ہے۔

پر کچ ہے، اور اگر اس اعتبار سے کہ میں محب اور خادم ہوں ہر امام مجتہد کا، ان ائمہ اربعہ وغیرہم سے آپ کو طرف کسی امام کے مضاف کروں تو بھی یہ اضافت درست ہے۔ ؎ چنانچہ اکثر اضافات ائمہ علم کی طرف سلف امت کے اسی قبیل سے تھے۔" ص ۳۱

- "مشکل تو یہ ہے کہ میں تو دلیل کو مذہب کہتا ہوں نہ تقلید کو، اور لوگ اعتراض مجھ پر از روئے تقلید کرتے ہیں۔" ص ۲۶
- "ائمہ سلف پر طعن مخالفت سنت کی کرنا انصاف کا خون بہانا ہے، ہاں جو مقلد ان کے بعد وضوح دلیل کتاب و سنت کے تقلید رائے بحت پر جامد ہیں ان کو خاطی سمجھتا ہوں۔" ص ۲۷
- "مجھے یہ بات معلوم ہے کہ سوا اللہ و رسول کے کسی کا اتباع کسی شخص پر امت اسلام میں سے واجب نہیں ہے، اور اسی وجہ سے سارے سلف تقلید رجال سے منع کرتے آئے ہیں۔" ص ۱۱۸
- رجماً بالغیب مجھ پر یہ طوفان باندھا گیا کہ میں خدانخواستہ حق میں ائمہ اربعہ کے عموماً اور حق میں امام اعظم رضی اللہ عنہ کے خصوصاً بے ادب نامہذب ہوں ؎ حالانکہ یہ نرا افترا ہے، اس کی تکذیب کے

؎ دیکھیے مقلد ہونے کی حیثیت سے تو نواب صاحب کسی امام کی طرف اپنے کو منسوب کرنا درست نہیں سمجھتے البتہ دوسرے اعتبارات سے اس کو صحیح سمجھتے ہیں لیکن اس میں بھی حنفی مذہب کی خصوصیت نہیں ہے، چاروں اماموں اور چاروں مذہبوں کو وہ ایک ہی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ۱۲ ر ؎ ←

لیے مدار، مدارِ جلب المنفعۃ نام بس کرتا ہے اگر میں ایسا ہوتا تو اپنی کتب فقہ میں ہرگز کسی مسئلہ حنفی کی ترجیح نہ کرتا .... بے شبہ میں کسی کی رائے مجرد واجتہاد کا مقلد نہیں ہوں، جب تک کہ اس کو موافق دلیل و سنت کے نہ کرلوں، خواہ وہ علم ظاہر سے علاقہ رکھتا ہو یا علم باطن سے ...." ص ۱۱۹

● پھر مجھ سا شخص جو بعد حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی عالم اور امام امت کی تقلید کا دعوٰی قائل نہیں ہے وہ صاحب کتاب التوحید (شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی رحمۃ اللہ علیہ) کی تقلید کیوں کرنے لگا۔" ص ۱۲۰

● "ایک محنت مجھ پر یہ آئی کہ اہلِ تقلید نے مجھ پر تہمت تقلید امام محمد بن علی شوکانی کی لگائی۔ [۱] گویا میں اپنے دین میں ان کا مقلد ہوں، یہ تہمت نہایت ظرافت سے قابلِ تماشا ہے، اس لیے کہ جس طرح ائمۂ اربعہ مجتہدین وغیرہ سلف صالحین نے تقلید مذاہب سے منع کیا ہے اسی طرح یا اس سے زیادہ رد تقلید میں شوکانی نے میدانِ مباحثہ میں جولانی فرمائی ہے ... پھر میرا کسی اور کا اس نہی کے باوجود

---

[۱] سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر سیرت والا جاہی کا یہ بیان صحیح ہے کہ نواب حنفی مذہب تھے اور ہمیشہ مذہب حنفی کی طرف اپنے کو منسوب کرتے تھے تو پھر ان پر یہ طوفان کیسے باندھا گیا کہ وہ امام ابوحنیفہ کے حق میں بے ادب نامہذب ہیں۔ ۱۲

[۲] اگر واقعی نواب صاحب حنفی المذہب تھے اور ہمیشہ حنفی مذہب کی طرف اپنے کو منسوب کرتے تھے تو پھر ان دونوں الزاموں کی گنجائش کہاں سے نکل آتی کہ وہ شوکانی کے مقلد ہیں، یا یہ کہ وہ اولیاء اللہ کے معتقد نہیں ہیں؟ اس قسم کے الزام تو اہلحدیثوں کو لگائے جاتے ہیں نہ کہ کسی حنفی المذہب مقلد کو

ان کا مقلد بننا کیا معنی رکھتا ہے؟ میں نے اپنی تالیف میں کسی جگہ ان کا خلاف کیا ہے، اس لیے کہ ان کی تقریر پر دلیل واضح کی موافقت ظاہر نہیں ہوئی۔" ص ۱۱۸

● "بعض لوگوں کو یہ گمان ہے کہ میں اولیاء اللہ تعالیٰ کا معتقد نہیں ہوں۔ حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے کیونکہ ولایت خدا کا وجود کتاب وسنت دونوں سے ثابت ہے۔ اور کرامات کے وقوع پر بھی قرآن وحدیث دلیل ہیں۔ پھر ان کا انکار یعنی چہ؟... ہاں اتنی بات ہے کہ میں اس علم میں بھی بکتاب وسنت ہوں اس حال وقال کا قائل نہیں ہوں جو نص کتاب ودلیل سنت کے برخلاف ہے اور نہ ان رسوم مشائخ کو جائز جانتا ہوں جو کسی برہان پر مبنی نہیں ہیں، کیونکہ جس طرح تقلید فروع احکام میں بے اصل ہے، اسی طرح تقلید مکشوفات ورسوم میں بے سند ہے۔ صوفیۂ صافیہ میں کوئی شخص مقلد کسی مذہب خاص کا نہیں تھا اسی جگہ سے کہا ہے: الصوفی لا مذھب لہ۔ احیاء العلوم وفتوحات مکیہ وغیرہما کو دیکھو کہ کس قدر تحذیر انعتبار تقلید سے اور کس قدر تحریض ایثار اتباع پر کی ہے۔" ص ۱۲۵

یہ اقتباسات پوری وضاحت کے ساتھ اس بیان کی تردید کر رہے ہیں کہ نواب صاحب حنفی مذہب تھے اور ہمیشہ مذہب حنفی کی طرف اپنے کو منسوب کرتے تھے۔ لہذا "المغنم البارد" کی عبارت سے مصنف "سیرت والاجاہی" نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ بھی غلط ہے اور اس عبارت کا صحیح مطلب وہی ہے جو ہم نے بتایا ہے۔

اس سلسلے میں ایک اقتباس اور پڑھیے جس میں نواب صاحب نے اہلحدیث مسلک کی صحیح صحیح ترجمانی کی ہے اور تقلید کی پرزور مذمت کی ہے۔ لکھتے ہیں:

● "تقلید اس کو کہتے ہیں کہ ایک آدمی دوسرے شخص کی بات کو کسی قسم کی

حلت یا حرمت میں بلا دلیل و نص شارع کے قبول کر لے، سو یہ بات ظاہر ہے کہ سب مسلمان حضرت کی امت ہیں اور حلت و حرمت کسی شے کی بغیر حضرت کے بتائے معلوم نہیں ہو سکتی تو اس باب میں اتباع حضرت کا چاہیے نہ اور کسی شخص کا۔ ورنہ اس شخص کو پیغمبر ماننا پڑے گا۔ اور اگر کسی مجتہد نے کسی شئے پر بسبب نہ ملنے اور معلوم نہ ہونے کسی دلیل کے ایسا حکم اپنے اجتہاد اور رائے و قیاس سے لگا دیا ہے، اور بعد اس کے کوئی اور دلیل کسی دوسرے شخص پر قرآن یا حدیث سے واضح ہو گئی تو وہ مجتہد معذور رہے بلکہ اس کو ایک اجر جہد و سعی کا ملے گا۔ مگر یہ شخص جس کو آیت قرآن یا سنت صحیحہ پہنچ گئی ہرگز معذور نہ ہوگا، بلکہ اگر وہ دیدہ و دانستہ خلاف نص کے کرے گا تو مخالف خدا یا رسول ٹھہرے گا۔ اس بات کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے، کچھ مشکل بات نہیں ہے۔ اور ہم نے ساری کتب فقہ مذاہب اربعہ دیکھیں، کسی امام مجتہد سے یہ بات ماثور نہیں پائی کہ ہمارے اجتہاد کے آگے تم قرآن و حدیث کو چھوڑ دینا، بلکہ چاروں اماموں نے اپنی تقلید اور غیر کی تقلید سے منع کیا ہے، ان کے اقوال خود کتابوں میں ان کے مقلدین کی منقول ہیں۔

اس صورت میں مقلد صحیح صادق ان کا وہی مسلمان ہے جو اس قول حق میں ان کی پیروی کرتا ہے۔ نہ وہ مسلمان جو خلاف ان کی نہی کے عمل کرتا ہے، کیونکہ وہ تو ان کا مخالف ہوا نہ مقلد۔"

یہ نواب صاحب کی صرف ایک کتاب کے اقتباسات ہیں، اگر ان کی دوسری

کتابوں سے اسی قسم کی عبارتیں ہم نقل کریں تو مضمون بہت طویل ہو جائے گا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ "سیرت والاجاہی" کے بیان کی تردید کے لیے اتنے حوالے ہی کافی ہیں۔

"سیرت والاجاہی" کے دوسرے بیان پر تنقید:

اسی طرح نواب صاحب مرحوم کی کتابوں کی روشنی میں ہم اس بیان کو بھی ناقابلِ اعتبار سمجھتے ہیں کہ والاجاہ مرحوم نمازِ پنجگانہ حنفی طریقہ پر پڑھتے تھے۔ "سیرت والاجاہی" کے حصۂ چہارم کے آخر میں خود اسی کے مصنف نے نواب صاحب کی مؤلفہ کتابوں کی ایک طویل اور مفصل فہرست پیش کی ہے۔ یہ فہرست انھوں نے کتابوں کے ناموں کے پہلے حرف کو ملحوظ رکھ کر حروفِ تہجی کی ترتیب پر مرتب کی ہے اور اللہ کی شان ہے کہ "حرف الالف" سے لے کر "حرف الیاء المثناة" تک ہر حرف کے ذیل میں نواب صاحب کی تالیفات موجود ہیں۔ چنانچہ "حرف التاء" کے ماتحت "تعلیم الصلوٰۃ" کو بھی انھوں نے نواب صاحب کی تالیفات میں شمار کیا ہے، جو اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے۔ تقریباً بیس صفحوں کا ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں طہارت اور نماز کے کچھ مسائل بالاختصار مذکور ہیں[1]۔

مصنف "سیرت والاجاہی" کے مذکورہ بالا بیان کو پیش نظر رکھ کر جب ہم نے اس رسالہ کا مطالعہ کیا تو ہمیں یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ اس باب میں احناف اور اہلحدیث کے مابین جن جن مسائل میں اختلاف مشہور ہے ان سب میں نواب صاحب

---

[1] اس رسالہ کے آخری صفحہ پر درج ہے کہ ۴ رجمادی الاخریٰ ۱۲۰۵ھ کو چند گھنٹوں میں لکھا گیا۔ ۱۲

نے اہلحدیث ہی کے مسلک کو اختیار کیا ہے، کسی ایک مسئلہ میں بھی انھوں نے حنفی مذہب کی موافقت نہیں کی ہے۔ مثلاً "نماز کی ترکیب" کا عنوان قائم کر کے وہ لکھتے ہیں:

"نماز بے نیت کے نہیں ہوتی ہے۔ نماز کے سب رکن فرض ہیں، مگر بیچ کا تشہد و جلسہ استراحت اور نماز کے ذکروں میں کوئی ذکر واجب نہیں ہے۔ مگر تکبیر تحریمہ اور پڑھنا فاتحہ کا ہر رکعت میں اگرچہ مقتدی ہو۔ اور پچھلا تشہد اور سلام پھیرنا، یہ چار ذکر فرض ہیں۔ اس کے سوا جو کچھ ہے وہ سنت ہے، جیسے ہاتھ اٹھانا چار جگہ پر وقت تکبیر کہنے کے اور وقت رکوع کرنے کے اور سر اٹھانے کے رکوع سے، اور وقت کھڑے ہونے کے واسطے رکعت سوم کے، اور جیسے ہاتھ باندھنا وقت قیام کے، اور جیسے دعائے توجہ پڑھنا بعد تکبیر تحریمہ کے، سب سے زیادہ صحیح و متفق علیہ یہ دعا ہے اللّٰھُمَّ بَاعِدْ بَیْنِیْ وَبَیْنَ خَطَایَایَ ...... اور جیسے تعوذ کرنا ... پھر بسم اللہ الرحمن الرحیم کہے پھر فاتحہ پڑھے، اور آمین بہر سے کہے یہ آمین امام و مقتدی دونوں کو کہنا چاہیے، روایت جہر کی اصح و اقوی ہے، روایت خفض سے، اور جیسے پڑھنا کسی سورہ کا ہمراہ فاتحہ کے ... اور جیسے تشہد اوسط ... اور جیسے وہ ذکر جو ہر رکن میں آئے ہیں۔ مثل تکبیرات رکوع و سجود و قیام و قعود کے، پھر بعد تشہد اخیر کے جونسی دعا چاہے، ماثور یا غیر ماثور مانگے" ص ۹-۱۰

اس کے بعد نواب صاحب نے "فائدہ" کے ذیل میں ان حدیثوں کا ترجمہ کیا ہے جن میں تعدیل ارکان کی تعلیم اور تورک کے ساتھ نماز ادا کرنے کا ذکر ہے

پھر فرماتے ہیں:

"اب چاہیے کہ کوئی نمازی کیفیتِ نماز میں اس ہیئت سے تجاوز نہ کرے، ورنہ اس کی نماز میں خلل ہوگا۔" ص ۱۱

ان تصریحات کی موجودگی میں کسی کا یہ بیان کس طرح قابل اعتبار سمجھا جائے کہ . . . "والاجاہ نماز پنجگانہ حنفی طریقہ پر پڑھتے تھے"۔ مسلک الختام وغیرہ میں تو نواب صاحب نے ان مسائل کے بارے میں اہلحدیث کے موقف ومسلک کی تائید اس طرح کی ہے کہ اس کے خلاف حنفیہ کے شبہات ودلائل کے جوابات بھی دیے ہیں۔ یہی وہ حقائق ہیں جن کی بنا پر نواب صاحب اہل حدیث مشہور تھے جیسا کہ انھوں نے خود اس کا اقرار کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

نواب صاحب باقرار خود اہلحدیث مشہور تھے:

"ایک محنت مجھ پر یہ آئی کہ ہنگامِ انقلاب سنکر اہلِ غرائم نے بکر گھیرنا شروع کیا، عامہ خلق کے ذہن میں یہ بات جمی ہوئی ہے کہ امراء ورؤساء معتقد اعمال کے ہوتے ہیں، حالانکہ میں اول امیر نہیں ہوں، دوسرے علم سے فقیر بھی نہیں ہوں کہ دامِ تزویرِ اہلِ شرک وبدعت میں گرفتار ہو جاؤں۔ میں تو اپنے اعتقاد میں کسی شخص کا معتقد نہیں ہوں، خصوصاً ان فقراء ومشائخ کا جو اس زمانہ جہل میں دوکانداری کرتے پھرتے ہیں۔ مجھ کو ان کی حرکات بے برکات پر نہایت تعجب آتا ہے کہ باوجود ادعائے اہل وغیبت وشرک وبدعت کے یہ کسی موحد کو پھانسنے چلے۔ ان ممتعاسے

اتنا بھی نہ جانا کہ میں تو اہلحدیث مشہور ہوں اور تقویۃ الایمان و رسائلِ توحید کا پابند ہوں۔ میرے سامنے کسی رمّال جفار منجم عزیمت خواں کی اتنی بھی قدر نہیں ہے جتنی کہ دواب کی قدر نظر انسان میں ہوتی ہے، کیونکہ موحد ہر بلا در خار مصیبت و عافیت میں اللہ ہی کو پکارتا ہے۔"

(ابقاء المنن ص ۱۳۶)

نواب صاحب مرحوم کی عبارتوں کے یہ اقتباسات صاف اور صریح لفظوں میں ان باتوں کی تردید و تکذیب کر رہے ہیں کہ "وہ حنفی تھے اور ہمیشہ حنفی مذہب کی طرف اپنے کو منسوب کرتے تھے اور حنفی مذہب کے طریقہ پر نماز پڑھتے تھے۔" ؎

قد اصبحت ام الخیار تدعی

علیّ ذنبا کلہ لم اصنع

•••

مولانا خرم علی بلہوری

مہر صاحب لکھتے ہیں:

"بلہور کان پور کے مضافات میں سے ہے۔ مولوی صاحب موصوف نے لکھنؤ میں سید صاحب سے بیعت کی تھی۔ اس کے بعد خدمتِ دین میں مشغول ہو گئے۔ مشہور ہے کہ سید صاحب کے ساتھ جہاد کے لیے سرحد گئے تھے، وہاں سے واپس آ گئے۔ غالباً سید صاحب نے انھیں دعوت و تبلیغ کے لیے مقرر کر دیا۔ ردِّ بدعت اور احیاءِ سنت میں بہت سرگرم تھے۔ ۱۲۵۰ھ میں نواب ذوالفقار بہادر رئیس باندہ کے حکم سے "درِ مختار شرح تنویر الابصار" کا ترجمہ شروع کیا۔ محرم ۱۲۷۱ھ میں کتاب الحج تک ترجمہ مکمل کر چکے تھے۔ اسی سال وفات پائی۔ مولوی محمد احسن نانوتوی نے مولوی خرم علی کے وارثوں سے اس کتاب کا حقِ تالیف خرید لیا اور "غایۃ الاوطار" کے نام سے اسے شائع کر دیا۔ یہ ترجمہ ناتمام رہا۔ "مشارق الانوار" کا بھی ترجمہ کیا۔ "نصیحۃ المسلمین" ان کی مشہور کتاب ہے۔ "جہادیہ" منظوم ہے جس میں جہاد کے فضائل بیان کیے ہیں۔ سید صاحب کے لشکر میں "جہادیہ" جنگ کے وقت پڑھی جاتی تھی[1]۔ مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہری نے "تراجم علمائے حدیث ہند" (جلد اول) میں اس جہادیہ کی نسبت لکھا ہے کہ اس کی

---

[1] جماعت مجاہدین ص ۲۹۲

اشاعت کی اجازت نہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انگریزی حکومت کی نظر میں بھی اس کی خاص اہمیت تھی۔ اس "جہادیہ" کے کچھ اشعار مہر صاحب کی کتاب کے حوالے سے اس کتاب کے شروع میں نقل کیے گئے ہیں۔ وہاں ملاحظہ کیے جائیں۔ مولانا نوشہروی موصوف لکھتے ہیں:

"مولانا خرم علی بلہوری ولی اللّٰہی خانوادہ (دہلی) کے شاگرد تھے۔ اور ابتداءً روش عام کے مطابق غالی مقلد کہ بقول صاحب "تذکرہ علماء ہند" منع قراۃ الفاتحہ خلف الامام پر رسالہ لکھا، مگر جب قسمت نے یاوری کی اور اسمٰعیل شہید علیہ الرحمۃ کی مصاحبت نصیب ہوئی تو اتباع سنت کا رنگ چڑھ آیا اور اسی پر خاتمہ ہوا۔ اس غلبہ نے آپ کی زبان سے وہ شعر محبت حدیث رسولؐ میں نکلوائے کہ جنھیں ہندوستان کے پرانے اہلحدیث شوق سے پڑھا کرتے۔ یعنی

کیا تجھ سے کہوں احادیث کیا ہے دروازۂ درج مصطفیٰ ہے
صوفی عالم حکیم و نبی کرتے رہے اس کی خوشہ چینی
باباکے یہاں سے کون لایا جس نے پایا یہیں سے پایا
یہ شاہراہ محمدی ہے گنجینۂ راز احمدی ہے
مشعل افروز راہ سنت برہمزن بیخ و شاخ بدعت
ہوتے ہوئے مصطفیٰ کی گفتار مت دیکھ کسی کا قول و کردار
جب اصل سے نو نقش گیا ہے یاں وہم و خطا کا دخل کیا ہے
اب زیادہ تو مجھ سے نہ کر کل کل خورشید کے آگے کیا ہے مشعل

بالغرض خلاں ہے مردِ کابل اس نے تھا کیا کہاں سے حاصل
وہ بھی اسی در کا اک گدا تھا گو غوث و امام و مقتدا تھا
ملفوظ بہت ہیں تو نے دیکھے ملفوظ محمدی کو اب لے
ناحق تجھے اور کچھ ہوس ہے قرآن و حدیث تجھ کو بس ہے
حق ہوگا حدیث خواں سے خرم ارشاد رسول فخر عالم

(تراجم علمائے حدیث ص ۵۰۹)

صاحب تذکرہ علمائے ہند نے ان کے حق میں لکھا ہے "در قلع بدعت واحیائے سنت می کوشید۔"

(بدعت کے مٹانے اور سنت کے زندہ کرنے میں بڑے سرگرم تھے۔)

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ایک نامور مجاہد مولوی لیاقت علی صاحب [1]

---

[1] مولوی لیاقت علی صاحبؒ الہ آبادی کے نواسے قاضی محمد ایوب صاحب ابھی بحمد اللہ زندہ ہیں، اپنے گاؤں مہگاؤں ضلع الہ آباد میں رہتے ہیں۔ مولوی ابوالخیر صاحب فاروقی ساکن موضع بریوا ضلع پرتاب گڑھ نے مجھے بتایا کہ یہ بڑے دیندار اور اعتقاداً و عملاً نہایت پرجوش اور پختہ اہل حدیث ہیں۔ اپنے نانا مولوی لیاقت علی صاحب کے متعلق انھوں نے بڑے وثوق کے ساتھ کہا کہ وہ قطعی اہلحدیث تھے، بلکہ اہلحدیث گر تھے۔ وہ رفع یدین کرتے تھے۔ سنت نبیؐ کے عاشق تھے۔" جب ۱۸۵۷ء کی شورش ناکام ہوئی اور انگریز کامیاب ہو گئے تو مولوی لیاقت علی صاحب گرفتار کر لیے گئے، ان کو کالے پانی بھیجا گیا، وہیں ان کی وفات ہوئی۔ مولانا غلام رسول مہر ←

الہ آبادی کے جو کارنامے تاریخ میں محفوظ ہیں ان میں مذکور ہے کہ انھوں نے انگریزوں کے خلاف جب جہاد کا اعلان کیا اور خود تلوار لے کر میدان میں نکل آئے تو ملک کے دوسرے لوگوں کو اپنے ساتھ لینے کے لیے دو اشتہار چھپوائے۔ ایک اشتہار میں نثر نما عبارت تھی اور دوسرا اشتہار منظوم تھا۔ یہ دونوں اشتہار محاربۂ عظیم کے مصنف کنہیا لال نے اپنی کتاب میں شائع کیے ہیں۔ منظوم اشتہار میں یوں لکھا ہے۔

واسطے دین کے لڑنا نہ پئے طمعِ بلاد   اہلِ اسلام اسے شرع میں کہتے ہیں جہاد
جو مسلمان رہِ حق میں لڑا لحظہ بھر   روضۂ خلد بریں ہو گیا واجب اس پر
جو رہِ حق میں ہوئے ٹکڑے نہیں مرتے ہیں   بلکہ وہ جیتے ہیں جنت میں خوشی کرتے ہیں
گر رہے جیتے تو گھر بار میں پھر آؤ گے   اور گئے مارے تو جنت میں چلے جاؤ گے

مولوی لیاقت علی کے یہ دونوں اشتہار تلوار سے زیادہ کاٹ کرنے لگے جس نے بھی اسے پڑھا وہ تلوار لے کر میدانِ جنگ میں کود پڑا۔ ﻟﮧ

مذکورہ بالا اشعار مولانا خرم علی بلہوری کے ہیں جو ان کے رسالہ ''جہادیہ'' سے اشتہار میں نقل کیے گئے تھے۔ اس طرح بالواسطہ مولانا خرم علی بھی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شامل ہو جاتے ہیں اور اس انقلاب انگیز شورش میں ان کا بھی حصہ ہو جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ''رسالۂ جہادیہ'' کی اشاعت کی اجازت نہیں تھی۔

اپنی کتاب ''۱۸۵۷ء کے مجاہد'' میں فرماتے ہیں! ''دینی حمیت، ایمانی غیرت اور محبتِ آزادی کا یہ گرانمایہ گوہرِ بے بہا انڈمان کی آغوش میں محو خواب ہے۔''

ﻟﮧ اخبار ''ندائے ملت'' لکھنؤ بابت ۵ جولائی ۱۹۶۳ء ملاحظہ ہو۔

جیسا کہ ابو یحییٰ امام خاں نے لکھا ہے۔

"سید احمد شہیدؒ جب سرحد پار پہونچ گئے تو ہندوستانی مجاہدین کے قافلے ان کی خدمت میں وقتاً فوقتاً حاضر ہوتے رہے، ان میں ایک قافلہ مولانا خرم علی کا بھی تھا۔"

(سید احمد شہید جلد دوم ص ۲۳)

حکیم مومن خاں مومن

جہاد اور تجدید و احیائے دین کی اس تحریک میں حکیم مومن خاں مومن دہلوی بھی شریک تھے۔ حضرت سید احمد شہیدؒ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ اس تحریک کو فروغ دینے میں اپنی شاعری سے بھی کام لیا۔ مومن ۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے، ان کا خاندان طبیبوں کا ایک مشہور خاندان تھا۔ ان کے والد حکیم غلام نبی خان اپنے زمانے کے مشہور طبیبوں میں سے تھے۔ مومن کے گھرانے میں فارغ البالی تھی، لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ مذہبیت کا بھی چرچا تھا، ان کے والد کو شاہ عبدالعزیزؒ سے خاص ارادت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ جب مومن خان پیدا ہوئے تو ان کے والد کی فرمائش پر شاہ صاحب ہی نے ان کے کانوں میں اذان دی اور ان کا نام مومن خان رکھا۔ مومن کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی، جب سن شعور کو پہنچے تو ان کے والد نے انھیں شاہ عبدالقادرؒ کے سپرد کیا۔ مومن بلا کے ذہین تھے، اس لیے اس ماحول سے انھوں نے بہت جلد بہت کچھ حاصل کر لیا۔ مشہور ہے کہ استاد کی زبان سے جو الفاظ نکلتے تھے وہ انھیں ازبر ہو جاتے تھے۔

غرض مومن نے اس علمی ماحول میں شاہ عبدالقادرؒ جیسے استادوں سے درسیات کی تکمیل کی، اور اس کے بعد طب کی طرف متوجہ ہوئے جو ان کا آبائی پیشہ تھا۔ طب کی تکمیل کے بعد ان کی تنوع پسند طبیعت علم نجوم کی طرف راغب ہوئی، اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس فن میں بھی مہارت حاصل کر لی۔ نجوم کے ساتھ ساتھ شطرنج کی طرف بھی

راغب ہوئے اور اس فن پر بھی بہت تھوڑے عرصہ میں حاوی ہو گئے۔ اس عرصہ میں شاعری سے انھیں برابر خاص نسبت رہی، شعر کہتے رہے اور اس میں بھی جلد اپنی ایک حیثیت بنالی۔ یہاں تک کہ ان کا شمار اس دور کے مشہور اساتذہ میں ہونے لگا۔

ایک شاعر کی حیثیت سے مومن نے یوں تو تمام اصناف میں شاعری کی ہے۔ غزل، قصیدہ، مثنوی، قطعہ، رباعی، مثلث، مربع، مخمس، مسدس، مثمن، ترجیع، ترکیب بند سب میدانوں کی انھوں نے خاک چھانی ہے، لیکن ان کا خاص میدان غزل ہے۔ اس مخصوص صنعت میں انھوں نے جو کمال حاصل کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ انھوں نے اس صنعت میں جس مخصوص اچھوتے انداز کی طرح ڈالی ہے۔ اس نے خود غزل کی صنعت کو چار چاند لگا دیے ہیں۔[۱]

جذبۂ جہاد:

شاعری کے اس ذوق کے باوجود جذبۂ جہاد سے بھی ان کا دل معمور تھا۔ ان کی ایک رباعی ہے ؎

مومن تمھیں کچھ بھی ہے جو پاس ایماں ہے معرکۂ جہاد چل دیکھے وہاں
انصاف کرو خدا سے رکھتے ہو عزیز وہ [illegible] جسے کر سکتے تھے توں پر قرباں[۲]

بارگاہ الٰہی میں دعا کرتے ہیں:

---

[۱] مومن کے ابتدائی حالات اور ان کی شاعری کے متعلق یہ تفصیلات "کلیات مومن" کے مقدمہ سے ماخوذ ہیں [۲] کلیات مومن ص ۴۶۳

خدایا لشکرِ اسلام تک پہنچا کر آپہنچا　　لبوں پہ دم بنا ہے جوشِ خوں شوقِ شہادت کا
نہ کر بیگانہ مہر امام اقتدا سنت　　کہ ان کا آشنائے کفر ہے ان کی امامت کا
ہیر لشکر اسلام کا محکوم ہوں، یعنی　　ارادہ ہے مرا فوجِ ملائک پر حکومت کا
زمانہ مہدیٔ موعود کا پایا اگر مومنؔ
تو سب سے پہلے تو کہیو سلامِ پاک حضرت کا[1]

ان کی ایک مثنوی پورے چالیس اشعار کی، مثنوی جہادیہ، کے نام سے موسوم ہے جو درج ذیل ہے۔

پلا مجھ کو ساقی شرابِ طہور　　کہ اعضا شکن ہے خمارِ فجور
کوئی جرعہ دے دیں فزا جام کا　　کہ آجائے بس نشہ اسلام کا
برنگِ مے ایمان کو آجائے جوش　　نہ اپنا رہے اور نہ دنیا کا ہوش
عنادِ نہفتہ کو ظاہر کروں　　دم تیغ سے قتلِ کافر کروں
پیئے تشنہ کامی سبو در سبو　　پیوں شوق سے ملحدوں کا لہو
یہی اب تو کچھ آگیا ہے خیال　　کہ گردن کشوں کو کروں پائمال
بہت کوشش و جانفشانی کروں　　کہ شرع پیمبر کو جاری کروں
دکھا دوں بس انجام الحاد کا　　نہ چھوڑوں کہیں نام الحاد کا
نہ کیوں کر ہوں اس کام میں ناشکیب　　ظہورِ امامِ زماں ہے قریب
وہ خضرِ طریقِ رسولِ خدا　　کہ جو پیرو اس کا ہے سو پیشوا

---

[1] کلیات مومن ص ،

وہ نورِ مجسم وہ ظلِ الٰہ　　کہ سایہ سے جس کے خجل مہر و ماہ
زہے سیدِ احمد قبولِ خدا　　سراً متحانِ رسولِ خدا
نکو گوہری کا نہ پوچھو شرف　　علیؓ و حسینؓ و حسنؓ کا خلف
رہے حشر تک زندہ وہ نیک ذات　　ہے کفار کی موت اس کی حیات
خدا نے مجاہد بنایا اسے　　سرِ قتلِ کفار لایا اسے
دم اس دست و بازو پہ دیوے اجل　　لبِ تیغ کے بوسے لیوے اجل
جلو میں ہمیشہ رواں ہو ظفر　　رکاب اس کی پکڑے رواں ہو ظفر
کہوں کیا لوائے امامت کا اوج　　کہ ہیں غوث و ابدال سب اہلِ فوج
خبردار ہو جاؤ اے اہلِ دل　　کہ رحمت برستی ہے اب متصل
ہوا مجمع لشکرِ اسلام کا　　اگر ہو سکے وقت ہے کام کا
ضرور اس مجمع میں ہونا شریک　　کہ خوش تم سے ہو وحدہٗ لاشریک
جو داخل سپاہِ خدا میں ہوا　　فدا جی سے راہِ خدا میں ہوا
حبیبِ حبیبِ خداوند ہے　　خداوند اس سے رضامند ہے
امامِ زمانہ کی یاری کرو　　خدا کے لیے جاں نثاری کرو
سمجھ لو جو کچھ بھی ہے تم کو تمیز　　نہ جاں آفریں سے کرو جاں عزیز
کسی کو نہیں ہے اجل کی خبر　　کہ آ جائے بیٹھے ہوئے اپنے گھر
تو مقدور کس کا کہ آنے نہ دے　　تنِ خستہ سے جاں کو جانے نہ دے
تو بہتر یہی ہے کہ جاں کام آئے　　پسِ مرگ تربت میں آرام آئے
قیامت کو اٹھو تو تم بامراد　　لبِ الحمد گو اور دل شاد شاد

عجیب وقت ہے یہ جو ہمت کرو — حیاتِ ابد ہے جو اس دم مرو
جو ہے عمر باقی تو غازی ہو تم — سزاوار گردن فرازی ہو تم
یہ ملکِ جہاں ہے تمہارے لیے — نعیم جناں ہے تمہارے لیے
شراکت یہاں کی ہے طالع کا اوج — کہ ایسا امام اور ایسی ہے فوج
سعادت ہے جو جانفشانی کرے — یہاں اور وہاں کامرانی کرے
الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب — یہ افضل سے افضل عبادت نصیب
الٰہی اگرچہ ہوں میں تیرہ کار — پہ تیرے کرم کا ہوں امیدوار
تو اپنی عنایت سے توفیق دے — عروجِ شہید اور صدیق دے
کرم کر نکال اب یہاں سے مجھے — ملا دے امامِ زماں سے مجھے
یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں — مری جاں فدا ہو تری راہ میں
میں گنجِ شہیداں میں مسرور ہوں
اسی فوج کے ساتھ محشور ہوں[1]

مسلک کا اظہار :

مومن خان نے اپنے فقہی مسلک کے اظہار میں بھی جرأتِ ایمانی سے کام لیا ہے اور صاف صاف لفظوں میں بتا دیا ہے کہ میں حدیث کا متبع، تقلید کا منکر اور خالص محمدی ہوں۔ لکھتے ہیں:

---

[1] کلیاتِ مومن از ص ۳۶۴ تا ۳۸۱۔

ارباب حدیث کا میں فرماں بر ہوں ‏ تقلید کے منکروں کا سر دفتر ہوں

مقبول روایت ائمہ نہ قیاس ‏ یعنی کہ فقط مطیع پیغمبر ہوں[1]

ایک دوسری رباعی ہے:

خالص ہوں محمدی، میرا دین اسلام ‏ گو رائے صواب ہو، نہیں مجھ کو کام

تقلید کی ٹھہری تو بنوں گا شیعہ! ‏ کس واسطے چھوڑ دیجیے افضل ترمقام[2]

ایک غزل کا مقطع ہے ع

مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم[3]

توحید و سنت سے محبت اور اہلِ بدعت و ضلالت سے نفرت کا اظہار کس جوش

کے ساتھ کیا ہے، لکھتے ہیں ؎

فروغِ جلوۂ توحید کو وہ برق جولاں کر ‏ کہ خرمن پھونک دیوے ہستیِ اہلِ ضلالت کا

مرا جوہر ہو سرتاپا صفائے مہر پیغمبر ‏ مرا حیرت زدہ دل آئینہ خانہ ہو سنت کا

مجھے وہ تیغ جوہر کر کہ میرے نام سے خوں ہو ‏ دلِ صد پارہ اصحابِ نفاق اہلِ بدعت کا[4]

تحریکِ جہاد پر اعتراض کرنے والوں کے جواب میں ایک رباعی لکھی ہے ؎

یہ چند منافق سراپا بدعت ‏ ہے کفر و ضلال و فسق جن کی طینت

بتلاتے ہیں بدعتی امامِ حق کو ‏ گویا کہ جہاد ہے خلافِ سنت[5]

ان اشعار سے مومن خاں کا مسلک واضح ہے، اسی لیے ان کے بعض حنفی سوانح

نگاروں نے بھی تسلیم کیا ہے کہ وہ "موحد اور عامل بالحدیث" تھے، چنانچہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی

---

[1] کلیات مومن ص ۲۶۴، [2] ایضاً ص ۲۶۳، [3] ایضاً ص ۸۰، [4] ایضاً ص ۷، [5] ایضاً ص ۲۵۶

ہاشمی ان کے حالات کے ذیل میں ایک جملہ لکھتے ہیں :

"تمام خاندان ان کا سخت کٹر قسم کا مسلمان ، خود موحد، عامل بالحدیث، اور بیعت کے بعد اور بھی سخت ہو گئے تھے، چنانچہ اکثر و بیشتر (اشعار میں، مذہبی اصطلاحیں بھی آجاتی ہیں ، کبھی تو علانیہ یا اشاروں میں دوسرے مذاہب والوں پر سودا کی طرح چوٹیں بھی کر جاتے ہیں ۔

وفات :

۱۲۶۸ھ (۱۸۵۲ء) میں وفات پائی ۔ مہدی پورہ میں شاہ ولی اللہؒ کے خاندانی مقبرے کے پاس دفن ہوئے ۔ [1]

---

[1] جماعت مجاہدین ص ۲۹۶

مولانا ابوالحسن افغانیؒ

مشہور اہلحدیث عالم مولانا حکیم عبدالشکور صاحب شکراوی (ضلع گوڑگانوہ علاقہ میوات) نے "تاریخ میو چھتری" کے نام سے کوئی کتاب لکھی ہے جو ابھی تک شائع نہیں ہوسکی ہے۔ ہم مولوی محمد اسرائیل صاحب ندوی مدرس دار العلوم شکراوہ کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے اس کتاب کا کچھ حصہ جو بعض مجاہدین کے حالات پر مشتمل ہے اخبار "اہلحدیث دہلی" میں شائع کردیا ہے۔ اسی اخباری مضمون کو ہم یہاں نقل کررہے ہیں، اس مضمون میں تین مجاہدوں کا تذکرہ خاص طور سے کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ مولانا ابوالحسن افغانی، حاجی عبداللہ خاں، میاں جی کریم اللہ خاں، ۔ اب علی الترتیب ان تینوں بزرگوں کے حالات آئندہ صفحات پر پڑھیے۔

حکیم عبدالشکور صاحب مولانا ابوالحسن افغانی کے متعلق لکھتے ہیں۔

"آپ علاقہ میوات کے باشندے نہ تھے، بلکہ ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں علاقہ میوات میں وارد ہوئے تھے۔ آمد کا واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو جب دہلی میں ہنگامہ شروع ہوا تو سرحد کی اس جماعت میں سے جو مجاہدین کے نام سے بہت بڑی شہرت رکھتی تھی، ایک اچھی خاصی جماعت انگریزوں سے مقابلہ کرنے کے لیے ہندوستان میں چلی آئی تھی، اور ہنگامہ کے ابتدائی ایام میں انھوں نے باغی

فوج کے ساتھ مل کر انگریزوں سے مقابلہ کیا، بعد میں جب باغی فوج اور سلطان بہادر شاہ ظفر پر انگریزوں نے فتح پائی تو مجاہدین کی یہ مختصر سی جماعت دلی سے باہر نکل پڑی، اور جہاں ان کو راستہ اور موقع ملا دوسرے علاقوں میں چلے گئے۔ ان میں سے چار حضرات نے میوات کا رخ کیا (۱) مولوی نور علی (۲) مولوی محمد مرید (۳) مولانا ابوالحسن افغانی (۴) حضور کھیتی والے"۔ ایام ہنگامہ کے بعد یہ لوگ میوات میں رہنے لگے۔ ان چاروں کا مشغلہ تبلیغ اور اشاعت دین کے سوا کچھ نہ تھا۔ ان کے متعلق جو کچھ معلوم ہو سکا ہے اس کو ہم بروایت مولانا ڈاکٹر نذر محمد بادشاہ پوری (ضلع گوڑ گانوہ) بیان کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ایک بہت بڑے دیندار بزرگ اور عالم باعمل تھے، جماعت مجاہدین سے اچھا خاصا تعلق اور نسبت رکھتے تھے، روایت حسب ذیل ہے۔

"غالباً جولائی ۱۸۵۷ء کی بات ہے کہ چار اشخاص میرے پاس پہنچے جن کے خوبصورت چہرے کمھلائے ہوئے تھے۔ مگر ایمانی جلالت شان ان کی نہ بالوں سے مجھے محسوس ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر تک مجھ سے باتیں کرتے رہے اور پھر کھانے پینے سے فارغ ہو کر میں نے انھیں مکان میں آرام کرنے کے لیے کہا، تھوڑی دیر انھوں نے آرام بھی کیا، مگر ایک شخص ان میں سے کبھی کبھی کراہتے تھے، میں نے ان سے کہا کہ آپ کو کیا تکلیف ہے؟ انھوں نے مجھے بتایا کہ میرے پیر میں بندوق کی گولی لگی ہے، ہر چند اس کو نکلنے کی کوشش کی گئی مگر ناکامی رہی۔ میں نے کہا ذرا دکھاؤ۔ انھوں نے مجھے دکھایا۔ ان کے پیر میں گولی پھنسی ہوئی تھی، مجھ سے نکلنے کو کہا، میں نے آلات جراحی کے ذریعہ اس کو نکال لیا، وہ اس قدر مضبوط دل کے آدمی تھے کہ عمل جراحی کرنے پر

انھوں نے آہ بھی نہ کی ۔ میں نے خراب ساتھوں کو نکال کر ان کی مرہم پٹی کردی
ان چاروں کو بادشاہ پور کے شمال کی طرف دو فرلانگ کے فاصلے پر جو گنبد ہے، اس
میں ٹھہرا دیا ۔ وہ کئی دن تک ٹھہرے رہے ۔ میں ان کو رات میں کھانا پہنچا دیا کرتا
تھا ۔ یہ وہ زمانہ تھا، جبکہ انگریزوں کو دہلی پر تغلب حاصل ہو گیا تھا، اور باغیوں کی پکڑ
دھکڑ شروع ہو چکی تھی ۔ ایک دن صبح کو جو میں بازار میں نکلا تو چند آدمی یہ
گفتگو کر رہے تھے کہ گنبد میں کچھ آدمی ٹھہرے ہوئے ہیں ۔ دن میں اندر رہتے ہیں،
گھر ہے ماہے، انکے مدکے پیشاب پاخانہ کو بھی آتے جاتے دیکھا گیا ہے ۔ میں سمجھ گیا
کہ اب ان لوگوں کا راز فاش ہو چکا ہے، ان کو گنبد میں رکھنا مناسب نہیں ہے چنانچہ
اسی رات کو میں ان حضرات کے پاس پہنچا اور افشاۓ راز کا واقعہ جس طرح میں
نے سنا تھا، ان کے سامنے بیان کر دیا ۔ یہ لوگ رات ہی کو میوات کی طرف چلے گئے
ان میں سے دو آدمیوں کو میں پہچانتا تھا باقی دو کو بعد میں بھی نہ پہچان سکا ۔ ۔
پہلے بزرگ تو وہی ہیں جن کے بیر سے میں نے گولی نکال کر مرہم پٹی کی تھی، وہ
مولوی محمد مرید تھے جو فیروز پور جھرکہ میں مقیم ہو گئے تھے اور دوسرے مولوی نور علی
صاحب تھے جو ریواڑی میں مقیم ہو گئے تھے، اور میوات کو ان سے بڑا فیض پہنچا ۔

(انتہی کلامہ)

(اس کے بعد حکیم صاحب لکھتے ہیں ۔)

" ڈاکٹر صاحب کے اس بیان سے مجھے جستجو ہوئی کہ وہ دو حضرات کون
بزرگ تھے جو مولوی نور علی اور محمد مرید صاحبان کے ساتھ تھے ۔ میں نے میوات میں
ان آدمیوں کی تلاش شروع کی تو معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک بزرگ تو وہ تھے جو

موضع کھیتی کی،، ریاست الور میں خوانی خان کے یہاں مقیم تھے اور ساری عمر وہیں مقیم رہے۔ نوانی خان میوات کے وہ رئیس تھے جن کے یہاں ہمیشہ لنگر جاری رہتے تھے اور عام لوگ اس ،،مجاہد کو ،،حضور،، کہا کرتے تھے۔

دوسرے بزرگ وہ ہیں جو اہل میوات کے لیے ایک عرصہ تک مجوبہ بنے رہے۔ وہ بڑے سیاح اور صوفی و عالم بھی تھے، اور موضع بھونری میں تقریباً چالیس سال تک مقیم رہے۔ انھیں آخر عمر میں مالیخولیا ہو گیا تھا۔ یہ میوات کے نواح میں مولوی ابوالحسن کے نام سے مشہور تھے۔ ،،حکیم صاحب کا بیان ہے کہ ان چاروں میں سے میں نے مولوی نور علی، مولوی محمد مرید مولانا ابوالحسن کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ یہ حضرات اپنی ساری عمر میوات میں رہے مگر مولانا ابوالحسن ہندوستان کی سیاحت کر کے پھر موضع بھونری میں مقیم ہو گئے اور وہیں انتقال فرمایا۔ مولانا ابوالحسن کوئی معمولی لکھے پڑھے آدمی نہ تھے، بلکہ وہ جملہ علوم و فنون کے بڑے بھاری جید عالم تھے۔ فن مناظرہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ تبلیغ دین کا بے پناہ جوش رکھتے تھے۔ انھوں نے تبلیغ کے سلسلے میں سارے ہندوستان کا سفر بھی کیا تھا۔ مگر آخر عمر میں وہ اپنے قدیم محسن ،،تھوتمبردار،، کے مکان پر موضع بھونری ضلع بھرت پور میں مقیم ہو گئے تھے۔ بڑے باکمال بزرگ تھے۔ دہلی آگرہ وغیرہ بلاد ہند سے بہت سے لوگ ان سے ملنے آیا کرتے تھے۔ علم کیمیا کے متعلق بھی ان کے بارے میں یہ عام شہرت تھی کہ وہ یہ علم جانتے ہیں۔ جس وقت ان کی وفات ہوئی تو ان کے حجرے میں ستر جوڑی سونے کے بٹن اور کچھ کٹھیاں اور سنیاں پائی گئیں۔ ان کے انس اندوختہ سے بھونری اور گرد و نواح کے آدمیوں نے ایک عیدگاہ تعمیر کرائی اور ان کا مزار بنوایا۔

مولانا ابوالحسن طبیعت کے بڑے تیز تھے، مطالعہ کے بہت شوقین تھے، آخری زندگی میں تصوف کی جانب مائل ہو گئے تھے، تصوف میں گفتگو ہونے کیساتھ ان کی زبان پر فتوحاتِ مکیہ اور احیاء العلوم کے فقرے بڑی جلدی سے آیا کرتے تھے وہاپی آمد کے ابتدائی برسوں میں ان کو بحث و نظر سے واسطہ پڑا۔ اہلحدیث مسلک رکھتے تھے، اس لیے مختلف عالموں سے ان کے مناظرے ہوئے یہاں تک کہ فیروز پور جھرکہ میں جب حنفی اہلحدیث مناظرے کی تحریک اٹھی تو اس کی بحث و تمحیص میں آپ پیش پیش تھے۔ اور حضرت مولانا محمود حسن صدر مدرس دارالعلوم دیوبند سے مناظرہ کرنے کے لیے سرتوڑ کوشش کر رہے تھے۔ آخر عمر میں آپ بھونری کی مسجد کے ایک حجرے میں مقیم ہو گئے۔ تعویذ لکھانے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ خلق خدا نے ان سے بڑا فیض پایا، گرد و نواح کے اضلاع کے مسلمان اور میوات کے باشندے انھیں اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں۔ خود مجھے ان سے بارہا نیاز حاصل ہوا۔ آخر عمر میں اگرچہ ان کے دماغ میں خلل آ گیا تھا مگر جب راستی پر آجاتے تھے تو بڑی اچھی گفتگو کیا کرتے تھے اور ہر بات کا شافی جواب دیا کرتے تھے۔ ان کے متعلق عوام و خواص میں بہت سی کرامتیں مشہور ہیں۔ سو سال سے زائد عمر میں وفات پائی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ [1]

---

[1] اخبار اہلحدیث دہلی بابت یکم اگست ۱۹۶۳ء

حاجی عبداللہ خاں

آپ موضع کانکرکھیڑہ تحصیل تجارہ ضلع الور کے باشندے تھے۔ معتبر روایات کی بنا پر یہ سمجھا گیا ہے کہ جس وقت حضرت سید احمد صاحب بریلوی کی تحریک جہاد اٹھائی گئی اس وقت جو قافلے اور مسافر ٹونک اور دہلی میں آمدورفت رکھتے تھے انھی کے توسط سے آپ کو دینداری کی نسبت پیدا ہوئی۔ اس زمانے میں راجستھان کی آمد اس موجودہ پختہ سڑک سے نہیں تھی جو آج دہلی کو راجستھان سے ملاتی ہے۔ بلکہ اس وقت عام طور پر دہلی سے راجستھان جانے والے یا تو ریواڑی سے جاتے تھے، یا اس راستے سے گزرتے تھے جو قصبہ سوہنہ سے اراولی پربت کو کاٹ کر قصبہ تاؤڑو کا راستہ پکڑتی ہے۔ تاؤڑو سے تجارہ کو جاتے ہوئے موضع کانکرکھیڑہ راستہ میں ملتا ہے۔ حاجی عبداللہ خاں نے ان راستہ چلنے والوں سے جو ٹونک اور دہلی کے درمیان آمدورفت رکھتے تھے، دینی سبق حاصل کیا۔ یہاں تک کہ آپ دہلی پہنچکر سید احمد صاحب بریلوی کے مرید ہوگئے، اور مولانا اسماعیل شہید کے قافلے کے ساتھ جس میں اور بھی بہت سے اہل میوات تھے سرحد پہنچ گئے، اور وہاں سید صاحب کے ہمراہ متعدد جنگوں میں شریک رہے۔ جب بالاکوٹ میں مولانا اسماعیل اور حضرت سید احمد صاحب بریلوی شہید ہوگئے تو مجاہدین کے دو گروہ بن

ایک گروہ سرحد میں رہا اور دوسرا گروہ عازم ہندوستان ہوا۔ جس قدر بھی مجاہدین، حضرت سید احمدؒ اور مولانا اسماعیل شہید کے ہمراہ رہ چکے تھے اور ان کی مبارک صحبتوں سے فیض پا چکے تھے، ان لوگوں نے اپنے اپنے وطن پہنچکر لسانی جہاد شروع کردیا۔ ان میں ایک ہمارے حاجی عبداللہ خان بھی تھے اور انھی کے ایک ساتھی میاں جی کریم اللہ گوہانوی بھی تھے۔

حاجی عبداللہؒ اگرچہ بہت زیادہ لکھے پڑھے۔ عالم، فاضل نہ تھے، مگر حضرت مولانا اسماعیل شہید کے فیض صحبت سے وہ تبلیغ اور اشاعتِ دین کا جذبہ بے پناہ رکھتے تھے۔ اس وقت کا میوات آج کا میوات نہ تھا۔ بلکہ پورا علاقہ کفر و شرک و بدعات کی مکروہات سے پُر تھا۔ کھیڑہ ڈیوٹ، دیوی، دیوتاؤں کو مانتے تھے، دینی تعلیم کا کوئی رواج نہ تھا۔ ہزاروں مواضعات میں سے چند مواضعات ایسے تھے جہاں مساجد تھیں، اس وقت جو گاؤں در گاؤں مساجد کے منارے اور گنبد نظر آتے ہیں ان کا پتہ بھی نہ تھا۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ اور شاہ مدارؒ اور سید سالارؒ صاحب کے مجاور میوات میں آتے تھے اور اپنا نذرانہ اور بھینٹ لے جایا کرتے تھے۔

جب واقعہ بالاکوٹ ہو چکا تو خاندانِ ولی اللٰہی کے بعض فیض یافتگان عالم بھی میوات کا دورہ کرنے لگے تھے، جن میں مولوی سید محبوب علی اور مولوی حیدر علی ٹونک کا نام بڑی جلدی سے ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

حاجی عبداللہ مرحوم اپنے طریقے سے ایک تبلیغی وفد مرتب کرکے میوات کے دورے کرتے رہتے تھے، چنانچہ ان کی آمد کا حال بعض پرانے آدمیوں سے معلوم ہوا تھا۔ مشرقی میوات کے حصے میں اکثر ان کے دورے رہتے تھے، چونکہ "عقیدۃً" و "عملاً"

اہل حدیث تھے اور شاہ اسمٰعیل شہید کے تربیت یافتہ اہل حدیث تھے، اس وجہ سے ان کے فیض صحبت سے میوات میں حلقۂ اہلحدیث قائم ہوا گو ہانہ شکرادہ، جلال پور، لاڈمکا، بخارا کا وغیرہ میں انھوں نے اپنی رشتہ داریاں بھی کرلی تھیں۔ پھر یہ رشتہ داری کے تعلقات ایسے راس آئے کہ بہت سے مقامات پر اہلحدیث پیدا ہوگئے۔ آج جو کچھ اہلحدیث میوات میں پائے جاتے ہیں یہ سب حاجی عبداللہ کا فیضان ہے، چنانچہ جھاندلہ، شکرادہ، رہپوہ، جلال پور وغیرہ میں جو اہلحدیث کی بڑی تعداد پائی جاتی ہے، اس کا واحد سبب حاجی عبداللہ کے وہ رفقاء ہیں جن سے ہم نے اپنی مستعار زندگی میں ملاقات کی، اور ان سب حالات کے مرتب کرنے میں ہم نے مدد لی۔ ان حضرات کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

(۱) میانجی کریم اللہ خاں گوہانی (۲) میانجی الف خاں شکرادی (۳) نتھو خاں نمبردار جلال پوری (۴) حاجی یسع خاں ساکرسوی (۵) میانجی عبدالغفور باولوی (۶) پٹواری حاجی احمد خاں رہپوی (۷) مولانا ڈاکٹر نذیر محمد خاں بادشاہ پوری رحمہم اللہ۔

ؒ اخبار اہلحدیث دہلی بابت یکم اگست ۱۹۶۳ء

میانجی کریم اللہ خاں

(مولانا حکیم عبدالشکور صاحب شکراوی لکھتے ہیں ۔)

"میانجی کریم اللہ خاں موضع گوہانہ تحصیل نوح ضلع گوڑگانوہ کے باشندے تھے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو دین و ایمان کی دولت کا وافر حصہ عطا فرمایا تھا، جس کی بنا پر اپنا تعلق دینداروں سے قائم کیا اور یہی تعلق دینی آپ کو سید احمد بریلویؒ تک کھینچ کر لے گیا، جہاں آپ سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے مرید ہو گئے، اور مولانا اسماعیل شہید کے قافلے کے ساتھ سرحد پہنچ گئے۔ میاں جی مولانا شاہ اسماعیل شہید کے خاص معتقدوں میں تھے اور آپ کی جماعت میں شامل ہو کر متعدد جنگوں میں شریک ہوئے۔ شاہ شہیدؒ ہی کے اثر سے مسلک عمل بالحدیث اختیار کیا اور آخر عمر تک اسی پر گامزن رہے۔"

میانجی موصوف معرکۂ بالاکوٹ میں سید صاحبؒ کے ساتھ تھے، مولانا غلام رسول مہر اس معرکے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کریم اللہ خاں میواتی مولانا شاہ اسماعیل کی جماعت میں تھے، اس جماعت کو ملا لعل محمد قندھاری کے مورچے کے قریب متعین کیا گیا تھا، سب لوگ صبح ہوتے ہی مورچوں میں جا بیٹھے، کریم اللہ خاں کو سید صاحب کی زیارت

کے شوق نے روکے رکھا، وہ کہتے ہیں کہ مسجد بالا میں پہنچا تو آپ دعا و مناجات میں مشغول تھے، مسجد سے دس پندرہ ہاتھ نیچے (یعنی مغرب جانب) ایک مورچہ شاہینچیوں کا تھا، وہ سکھوں پر گولے پھینکتے تھے، سکھوں کے گولے ان کی طرف آتے تھے، لیکن کوئی گولہ کسی کو لگتا نہ تھا، میں چلے ہوئے گولے اٹھا اٹھا کر شاہینچیوں کو دینے لگا، اس وقت مسجد (یعنی مسجد بالا) میں بڑا ہجوم تھا۔ پھر حضرت کواڑ مسجد کے کھول کر باہر نکلے اور بالاکوٹ کے نیچے کو روانہ ہوئے اور سب لوگ آپ کے پیچھے آپ کے ہمراہ چلے۔ جب نیچے کی مسجد کے قریب پہنچے گلی تنگ تھی تمام آدمی اس میں گھس گئے اور ایک گلی مسجد کے داہنے طرف اور تھی، پھر حضرت تو مسجد مذکور میں تشریف لے گئے، اور کچھ لوگ اس گلی میں گئے۔ انھیں کے ساتھ میں بھی چلا گیا۔ اور دھانوں کے کھیت میں پہنچ کر بندوق سکھوں پر لگانے لگا۔ اس اثناء میں حضرت امیر المومنین اس مسجد سے حملہ کر کے آئے، اور ہم لوگوں کے بائیں طرف جو سکھوں کا بڑا ہجوم تھا ادھر چلے گئے۔ ادھر جانبین سے بندوق کی باڑھ بھی چلتی تھی اور تلوار بھی چلتی تھی، اور دھوئیں کی ایسی تاریکی تھی کہ دس قدم کا آدمی معلوم نہیں ہوتا تھا، ہوا مخالف تھی تمام دھواں ان کا ہماری طرف آتا تھا۔[۱]"

معرکۂ بالاکوٹ کے متعلق مختلف مجاہدوں کے بیانات مہر صاحب نے ایسی

---

[۱] سید احمد شہید جلد دوم ص ۳۹۷ - ۳۹۸

کتاب میں نقل کیے ہیں، ان میں سے کریم اللہ خاں کا ایک بیان بھی ذکر کیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

"کریم اللہ خاں کہتے ہیں، اس وقت کسی کو معلوم نہ تھا کہ کون کہاں ہے۔ مولانا اسماعیل نے ہم لوگوں سے پوچھا کہ حضرت امیر المومنین کہاں ہیں؟ لوگوں نے کہا اس ہجوم میں جہاں تلوار چل رہی ہے وہاں ہوں گے۔ پھر مولانا تو ادھر چلے گئے ..... جو غازی حضرت امیر المومنین کے مورچے سے آتا، یہی پوچھتا کہ حضرت امیر المومنین کہاں ہیں؟" [1]

خود میاں جی کریم اللہ خاں بھی بڑی بہادری اور جاں بازی کے ساتھ اس معرکے

مہر صاحب لکھتے ہیں:

"کریم اللہ خاں میواتی کی دائیں ہتھیلی پر گولی لگی تھی ایک گولی سے ان کی تلوار کا کندا ٹوٹ گیا تھا۔ ایک زرہ پوش سکھ نے ان پر تلوار کا وار کرنا چاہا، لیکن گولی کھا کر زمین پر گر گیا۔ کریم اللہ خاں نے بڑھ کر تلوار ماری جو زرہ سے ٹکرا کر ٹیڑھی ہو گئی، غازی کا ہاتھ بیکار ہو چکا تھا۔ جوتی کے نیچے تلوار کا سرا دبا کر اسے سیدھا کیا۔ دو اور سکھ ان کی طرف بڑھے تو کریم اللہ خاں نے بندوق اٹھالی، وہ دور ہی رک گئے، دوسرے غازیوں کے ساتھ یہ بھی میدان سے باہر نکل گئے۔" [2]

---

[1] سید احمد شہید جلد دوم ص ۴۰۷

[2] سید احمد شہید جلد دوم ص ۴۲۵

جنگ بالاکوٹ کے بعد ہندوستان واپس آ گئے، اور کافی عرصہ تک ٹونک میں مقیم رہے، جہاں پر شہیدین اور دیگر مجاہدین کے حالات مرتب کرانے میں کافی مواد فراہم کیا، پھر ٹونک سے آپ نے میوات کا قصد کیا، اور اپنے قدیمی گاؤں گوہانہ میں سکونت اختیار کی، جہاں آپ نے کتاب و سنت کی نشر و اشاعت کو اپنا مقصد اعلیٰ قرار دیا، اور بحمد اللہ آپ اس میں سو فیصدی کامیاب ہوئے۔

مولوی محمد اسرائیل صاحب ندوی لکھتے ہیں:

"حضرت مولانا حکیم عبدالشکور صاحب مرحوم نے میاں جی کریم اللہ خان سے ۱۹۱۴ء میں ملاقات کی اور مجاہدین کے حالات ان سے دریافت کیے، میاں جی موصوف نے ۱۹۱۵ء میں اس جہانِ فانی سے عالم جاودانی کو لبیک کہا۔ وفات کے وقت عمر سو سال سے زائد تھی۔ آپ کی ذات سے مسلک اہلِ حدیث کو کافی فروغ ہوا۔ ہمارے گاؤں موضع جھانڈہ میں بھی اہلحدیثیت آپ ہی کے ذریعہ پہنچی۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔ بڑے ہی باکمال اور محبِ کتاب و سنت بزرگ تھے۔"[1]

---

[1] اخبار اہلحدیث دہلی بابت یکم اکتوبر ۱۹۶۳ء

تحریک

کا

دورِ ثانی

مولانا ولایت علیؒ

مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم لکھتے ہیں :

"۔۔۔۔ فاجعہ بالاکوٹ کے بعد تمام ملک پر اداسی چھائی ہوئی تھی، جماعت تتر بتر ہوگئی۔ اچھوں اچھوں کے قدم لڑکھڑا رہے تھے، جہاد کا سارا کام درہم برہم ہوا چاہتا تھا کہ عظیم آباد پٹنہ محلہ صادق پور کے ایک فرد نے یہ گرتا ہوا علم اپنے ہاتھوں سے تھام لیا، اور زندگی بھر اپنے سینے سے لگائے رکھا۔ اور پھر اس "فرد کامل" کے بعد اس کے بھائیوں بھتیجوں، عزیزوں اور ماننے والوں نے جس طرح اپنے خون سے اس نخلِ خزاں دیدہ کی آبیاری کی ہے وہ اسلامی ہند کی پوری تاریخ میں اپنی آپ مثال ہے۔

۔۔۔۔ سید صاحبؒ کی شہادت کے بعد قیادت کی باگ مولانا ولایت علیؒ صادق پوری عظیم آبادی (مولود ۱۲۰۵ھ) نے اپنے ہاتھوں میں لے لی[1] ابھی وہ دکن میں تبلیغ و ارشاد کے فرائض انجام دے رہے

---

[1] یوں تو شہید بالاکوٹ کے بعد ہی مجاہدین کا ایک گروہ سرحد پار پہنچ گیا تھا اور مولانا ولایت علی ←

تھے کہ فاجعہ بالاکوٹ پیش آیا۔ امیر و شیخ کی شہادت کی خبر سنتے ہی وہ عظیم آباد واپس ہوئے اور دعوت و تبلیغ کی از سر نو تنظیم شروع کی۔"

(ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص ۵۶)

مولانا ولایت علی کا مسلک:

یہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ بلاشبہ سید احمد شہید رحمہ اللہ کی زندگی میں اس تحریک میں حنفی اور اہلحدیث دونوں ہی مسلک کے لوگ برابر شریک رہے، اور سید صاحب دونوں ہی کی سرپرستی فرماتے رہے، مگر ان کی شہادت کے بعد اس تحریک کو زندہ رکھنے اور چلانے میں زیادہ حصہ اہلحدیث ہی کا ہے۔ مولانا غلام رسول مہر نے اس تحریک کے آخری دور کے معاونین کے کچھ نام ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:

"گویا آخری دور میں اعانت مجاہدین کا اکثر و بیشتر کام زیادہ تر اہل حدیث حضرات ہی نے انجام دیا ہے۔ (۱)"

← کے سرحد پہنچنے (۱۲۶۲ھ/۱۸۴۶ء) سے پہلے وہ مختلف امراء (شیخ ولی محمد پھلتی مولوی نصیر الدین دہلوی اور حاجی سید عبدالرحیم سورتی اور مولانا عنایت علی) کی سرکردگی میں اپنا فرض انجام دیتے رہے، لیکن اندرون ہند اور بیرون ہند مجاہدین اور ان کے ہمدرد الٰہی کو اپنا امیر سمجھتے تھے۔ اور اسی لیے جب وہ سرحد پہنچ گئے تو مرابطین نے فوراً آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ باقی ملک کے اندر تو وہ سید صاحب کی شہادت کے بعد ہی سے امیر کی حیثیت سے دعوت و تبلیغ کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ (حاشیہ حوالہ مذکور) (۱) سرگزشت مجاہدین ص ۶۱۲

ہم کو اس تحریک کی پوری تاریخ لکھنا مقصود نہیں بلکہ اس کے ساتھ صرف اہلحدیث کی وابستگی اور ان کے خدمات کا اظہار مقصود ہے' اس لیے اس سلسلے میں ہم انھی افراد کا ذکر کر رہے ہیں جو اہلحدیث تھے۔ پس جب بقول مولانا مسعود عالم صاحب ندوی مرحوم سید صاحب رح اور مولانا اسماعیل رح کی شہادت کے بعد اس تحریک کی قیادت کی باگ مولانا ولایت علی رح کے ہاتھوں میں آئی تو اب ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ ان کی خدمات کا ذکر کرنے سے پہلے ان کا مسلک واضح کیا جائے۔

مولانا ولایت علی لکھنؤ میں عربی دینی تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ انھی دنوں میں حضرت سید احمد شہید رح کا وہاں ورود مسعود ہوا۔ مولانا ولایت علی سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے' اور پہلی ہی ملاقات میں ان کے گرویدہ ہو گئے' اور ان کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ سید صاحب ان کو اپنے ساتھ بریلی لے گئے اور مولانا اسماعیل شہید کی تربیت میں دیدیا۔

مولانا عبدالرحیم رح صادقپوری لکھتے ہیں:

"آپ عین قیام بریلی کے حضرت مولانا اسمٰعیل شہید کی جماعت میں بھرتی تھے' اور انھیں سے حدیث بھی پڑھا کرتے تھے۔ اور جب اپنی جماعت کے کام سے فرصت پاتے تو سید صاحب کی صحبت میں جا بیٹھتے یا تنہا نماز و دعا میں مشغول رہتے۔ مولانا شہید نے اپنی جماعت میں آپ کو اپنا نائب مقرر کر دیا تھا' مگر آپ کو اب اسوۂ حسنۂ نبوی سے ایسا ذوق حاصل ہو چکا تھا کہ آپ اپنی جماعت والوں کی آپ خدمت کیا کرتے تھے۔

(تذکرہ صادقہ، ص ۱۱۱)

مولانا اسماعیل شہید ہی کی صحبت اور تعلیم و تربیت کا یہ فیض تھا کہ سنت نبویہ بر راہ راست

عمل کرنے کا جذبہ پیدا ہوا اور تقلیدی جکڑ بندیوں کی زنجیریں کٹ گئیں، اور بعد ازاں ان کی تبلیغی زندگی کا یہ ایک بڑا کارنامہ بنا۔ چنانچہ مولانا عبدالرحیم صادق پوری لکھتے ہیں:

"آپ کی ترغیب تحصیلِ قرآن واحادیث اور وعظ ونصائح سے ملک ہندوستان میں عمل بالحدیث کا چرچا ہوا، اور تقلید وتعصب کی بنا کمزور ومضمحل ہونے لگی۔ کیونکہ قرآن وحدیث کی محبت اور ان کی ترویج نے حق کو روشن کردیا۔ جاء الحق وزھق الباطل۔"

(تذکرہ صادقہ ص ۱۱۷)

مولانا مسعود عالم ندوی نے لکھا ہے کہ:

"ردِّ بدعت پر متعدد کتابیں شائع کیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے خاندان میں عمل بالسنہ کی تجدید کی۔ صوبہ بہار اور بنگال میں نکاحِ بیوگان کا آغاز آپ ہی کے خاندان سے ہوا۔ اس سنت کو خوب جاری کیا، ہزاروں بیوہ عورتوں کے نکاح کرادیے...... آپ کی ذات سے جو احیائے سنت ہوا، اس کی تفصیل کے لیے ایک دفتر چاہیے۔"

اس موقع پر مولانا ندوی نے چند سنتوں کا ذکر کیا ہے، ان میں سے یہاں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ "ایک شخص عبدالغنی نگرنہسوی (جو زمرۂ مساکین سے تھے) کا عقد ایک بیوہ عورت سے تعلیم قرآن مہر قرار دے کر کردیا۔" (ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص...)

یہ ایک ایسی بات ہے جو مولانا ولایت علی کے اہلحدیث ہونے کی صریح دلیل ہے اس لیے کہ ہندوستان میں کوئی حنفی مقلد اس سنت پر عمل کرنے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوسکتا اور نہ کوئی حنفی عالم جس کو تقلید کا پاس ہوگا نکاح کی اس صورت کو صحیح کہے گا۔

مولانا مسعود عالم ہی نے ان کی تبلیغی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"دینیات کی تعلیم کے لیے گھر پر ظہر اور عصر کے درمیان قرآن وحدیث کا درس دیتے۔ آپ کے بڑے بیٹے مولوی عبداللہ (ف ۱۳۲۰ھ) قاری ہوتے، دوسرے علماء تفسیر کی کتابیں ہاتھ میں لے کر بیٹھتے۔ علماء کے علاوہ عام مریدوں اور معتقدوں کی بڑی تعداد موجود ہوتی، قرآن مجید اور بلوغ المرام کا لفظی ترجمہ مردوں عورتوں اور بچوں کو پڑھواتے۔ شاہ محمد اسحاق (ف ۱۲۶۲ھ) سے شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ قرآن اور مولانا شہید کے رسائل منگوا کر پہلے مطبع حسینی لکھنؤ میں طبع کرانے کی کوشش کی۔ مالکِ مطبع کے انکار پر آپ نے یہ خدمت اپنے ایک رفیق و عقیدتمند مولوی بدیع الزماں صاحب بردوانی کے سپرد کی، جنھوں نے خاص طور پر ایک ٹائپ پریس خرید کر پہلی مرتبہ یہ کتابیں چھپوائیں۔ نواب صدیق حسن خاں (ف ۱۳۰۷ھ) نے ان کے قنوج آنے اور وعظ کی تاثیر کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ ... لکھا ہے کہ جامع مسجد قنوج میں چند جمعہ تک وعظ کہا، مجھ سے کہہ گئے کہ تم کتاب بلوغ المرام ضرور پڑھنا ..... اس کہنے کا نتیجہ بعد ایک مدت دراز کے یہ ظاہر ہوا کہ میں نے بلوغ المرام کی شرح لکھی ..... مولانا ولایت علی جب حج کو تشریف لے گئے تو اسی سلسلے میں یمن اور دوسرے مقامات کی سیاحت کی۔ اور یمن کے نامور محدث و عالم قاضی محمد بن علی شوکانی سے حدیث کی سند حاصل کی اور ان کی بعض تصانیف ساتھ لائے۔"

(ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص: ۶۱ تا ۶۳)

ان اقتباسات سے حسب ذیل چار باتیں معلوم ہوئیں۔

(الف) عورتوں اور بچوں کو پڑھانے کے لیے قرآن مجید کے ترجمہ کے ساتھ "بلوغ المرام" کا انتخاب کیا، یعنی حدیث کی ایک ایسی مختصر کتاب جس میں بیشتر مسائل اہلحدیث کے موافق اور حنفی مذہب کے خلاف ہیں، اسی لیے مولوی محمد میاں نے "شاندار ماضی" میں مبہم طور پر صرف یہ لکھا ہے کہ قرآن وحدیث کا درس دیتے تھے، بلوغ المرام کا نام بتانے سے گریز کیا ہے۔

(ب) مولانا اسمٰعیل شہید (اہلحدیث) کے رسائل منگوا کر چھپوایا اور ان کو شائع کیا

(ج) نواب صاحب کو ان کی نوعمری میں خاص طور سے بلوغ المرام پڑھنے کی . . نصیحت کی۔ اس نصیحت کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے نواب صاحب کو ایک عرصہ کے بعد اس کی شرح لکھنے کی توفیق بخشی۔ جس سے ایک طرف اگر حدیث کی خدمت ہوئی تو دوسری طرف اہلحدیث مذہب کو بھی فی الجملہ قوت پہنچی۔

(د) امام شوکانی سے (جو حنفی نہیں بلکہ سلفی محدث اور تقلید کے منکر و مخالف تھے) حدیث کی سند حاصل کی اور ان کی بعض تصانیف بھی اپنے ساتھ لائے "بعض تصانیف" سے "الدرر البہیہ" مراد ہے۔ جیسا کہ مولانا مسعود عالم ندوی نے حاشیہ میں اس کی وضاحت کردی ہے، اور لکھا ہے کہ "الدرر البہیہ" کا وہ نسخہ جو مولانا ولایت علی یمن سے ساتھ لائے تھے اب تک صادق پور میں محفوظ ہے، اور راقم الحروف کی نظر سے گزر چکا ہے۔" — "الدرر البہیہ" کو کوئی حنفی عالم کبھی پسند نہیں کر سکتا، یہ فقہ کی ایک ایسی کتاب ہے جس کے مسائل زیادہ تر اہلحدیث کے موافق اور حنفیہ کے خلاف ہیں۔ اسی کے ساتھ اہلِ حدیث کے ایک خاص "مہربان" کی شہادت بھی سن لیجیے۔

مولانا عبید اللہ سندھی فرماتے ہیں :

"پٹنہ کے مولانا ولایت علی مرحوم معرکہ بالا کوٹ میں موجود نہ تھے۔ موصوف مولانا اسماعیل شہید کی اس جماعت کے خاص رکن تھے جو مولانا شہید نے حجۃ اللہ پڑھنے کے بعد اس پر عمل کرنے والی ایک جماعت بنائی تھی، یہ لوگ رفع یدین اور آمین بالجہر کیا کرتے۔"

(شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک اشاعت دوم صفحہ ۱۳۰)

بتائیے! اس شہادت کے بعد کیا شبہ باقی رہ جاتا ہے اس بات کے ثبوت میں کہ مولانا ولایت علی علیہ الرحمہ اہلحدیث تھے، لیکن ان سب کے علاوہ ایک بڑا اور قوی ثبوت خود ان کی بعض تصانیف ہیں۔ ان کا ایک چھوٹا سا رسالہ "عمل بالحدیث" ہے جو فارسی زبان میں ہے اور ترجمہ کے ساتھ شائع ہوا ہے "تذکرہ صادقہ" کے مصنف مولانا عبد الرحیم صادق پوری کی ایک کتاب "مجموعہ رسائل تسعہ" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اس مجموعے میں مولانا ولایت علیؒ کے کئی رسالے شامل ہیں۔ انھی میں یہ رسالہ (عمل بالحدیث) اور ایک دوسرا رسالہ "تعمیر الصلوٰۃ" بھی ہے۔ انھی دونوں رسالوں کے کچھ اقتباس ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔ جن سے اچھی طرح واضح ہو جائے گا کہ مولانا ولایت علی مسلکاً حنفی تھے یا اہلحدیث؟ رسالہ "عمل بالحدیث" تو اس قابل ہے کہ پورا کا پورا یہاں نقل کر دیا جائے۔ لیکن اختصار کے خیال سے فی الحال ہم اس کی چند عبارتوں ہی کے نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ سب سے پہلے اس رسالے کا سبب تالیف مولانا ہی کی زبانی سنیے، فرماتے ہیں۔

"اما بعد چوں کثرت سوال یاراں در حمد و صلوٰۃ کے بعد واضح ہو کہ چوں کہ

اتباع حدیث و فقہ بریں فقیر وارد می گشت بدل گفتم کہ مختصرے یکبار تحریر نمایم و پیش ہر سائلے عرض دارم کہ رفع تکلیف بار بار و پیش دوستاں یادگار باشد

حدیث اور فقہ کی پیروی کرنے کے بارے میں دوستوں کے سوالات اس فقیر کے پاس بکثرت آتے تھے اس لیے میں نے اپنے دل میں سوچا کہ ایک دفعہ ایک رسالہ مختصر سا لکھ دوں، اور ہر پوچھنے والے کے سامنے پیش کر دوں تاکہ بار بار کی تکلیف دور ہو جائے اور دوستوں کے پاس یادگار رہے۔

اس رسالے میں تین فصلیں ہیں۔ پہلی فصل دین کی سمجھ کی خوبی اور فضیلت کے بیان میں، دوسری فصل تقلید کے محل جواز و عدم جواز کے بیان میں، اور تیسری فصل قرآن اور حدیث کے سہل ہونے کے بیان میں۔ پہلی فصل میں تفقہ فی الدین کی فضیلت اور اس کی حقیقت وغیرہ بیان کرنے کے بعد قرآن اور حدیث میں غور و فکر کرنے کے بارے میں لوگوں کے طرز عمل کی شکایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

دیدنِ قرآن و حدیث و تامل دراں بالکل موقوف نمودند و ہر سخنے کہ در کتاب نوشتہ بینند خواہ موافق قرآن و حدیث باشد خواہ مخالف بے تکلف قائلِ آں می شوند بعضے از ایشاں قرآن و حدیث را مطلقاً نمی بینند، و بعضے اگر می بینند

قرآن اور حدیث کا دیکھنا اور اس میں تامل کرنا لوگوں نے بالکل موقوف کر دیا ہے اور جو بات کسی کتاب میں لکھی ہوئی دیکھتے ہیں قرآن و حدیث کے موافق ہو یا مخالف بے تکلف اس کے قائل ہو جاتے ہیں، ان میں بعض تو مطلقاً قرآن اور حدیث کو دیکھتے ہی نہیں اور بعض اگر دیکھتے بھی ہیں تو اس کے

بمعنی آں تامل نمی کنند و بعضے اگر
تامل می کنند فکر در نصائح و
اخبار قیامت و برزخ و ترکِ
دنیا و مثلِ آں می کنند، اما
استنباط احکام را مفروغ
عنہا شمردہ ہرگز قصد تامل
دراں نمی نمایند، واگر احیاناً
حکمے در قرآن و حدیث خلافِ
کتب معتقد خودہا می یابند
بعضے قرآن و حدیث را تاویل
کردہ موافق از کتب می نمایند
و نمی فہمند کہ مقصود اصلی
اتباعِ قرآن و حدیث ست، و
بعضے چشم پوشی و گریز نیز ازاں
مقام اختیار می کنند، از حال
ایں چنیں فقہاء مخبر صادق خبر دادہ
ربَّ حاملِ فقہٍ غیرُ فقیہٍ
معاذاللہ عن کل ذالک عیاذاً
کثیرا ص ۳۲

معنی میں تامل نہیں کرتے ہیں اور بعض
اگر تامل کرتے ہیں تو قیامت اور برزخ
اور ترکِ دنیا وغیرہ کی خبروں اور
نصیحتوں کے مضمون میں فکر دوڑاتے
ہیں، رہا شرعی احکام کا نکالنا سو یہ سمجھ
کر کہ اس سے تو فراغت حاصل ہو چکی ہے
ہرگز اس میں تامل کرنے کا ارادہ نہیں
کرتے۔ اور کبھی اگر اپنے عقیدہ اور مذہب
کی کتابوں کے خلاف قرآن و حدیث میں
کوئی حکم پاتے ہیں تو بعض لوگ تو قرآن
اور حدیث کے ظاہری معنی کو پھیر پھار کر
اپنی کتابوں کے موافق کر لیتے ہیں اور اس
کو نہیں سمجھتے کہ مقصود اصلی قرآن اور
حدیث کی تابعداری ہے۔ اور بعض آدمی تو
ایسے مقام سے بھاگتے اور نظر بچا کر نکل جانے
کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ ایسے فقہاء کے
حال سے مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے
یوں خبر دی ہے کہ بہت سے فقہ کے حامل غیر فقیہ
ہیں، ہم ان سب باتوں سے بار بار اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

اس اقتباس کو پڑھنے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ مولانا ولایت علیؒ ایک ایسے عالم تھے جن کے نزدیک مروجہ مذاہب اربعہ میں سے کسی ایک کی پابندی ضروری تھی اور جو اس بات کے قائل تھے کہ اب کسی اہل علم کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ قرآن اور حدیث سے شرعی احکام کا استنباط براہ راست کرے۔ اب تو ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ کسی معین امام کے اقوال واجتہادات ہی کو اپنا دستور العمل بنائے اور انھی اقوال واجتہادات کی روشنی میں قرآن وحدیث پر غور کرے۔ مولانا ولایت علیؒ تو اس ذہنیت سے ہزار بار اللہ کی پناہ مانگتے ہیں اور فرماتے ہیں معاذ اللہ عن کل ذلک عیاذا کثیرا۔

فصل دوم میں لکھتے ہیں:

باید دانست کہ انسان اگر عامی باشد و لسبب مشاغل دیگر از نوشت و خواند دور ماند و اکتفا بر دریافت از علماء نماید برائے آں مناسب ایں است کہ از علماء محدثین و دیندار کہ در دیانت و خوف خدا و دانست قرآن و حدیث مشہور شدہ باشند سوال نماید بایں طور کہ ما را دریں مسئلہ طور محمدی تعلیم نمائید۔ (ص ۳)

جاننا چاہیے کہ جو آدمی ان پڑھ ہو اور اپنے دوسرے مشاغل کی وجہ سے لکھنے پڑھنے سے دور ہو اور علماء سے پوچھ لینے ہی پر اکتفا کرتا ہو تو اس کے لیے مناسب یہ ہے کہ علماء محدثین و دیندار سے جو دیانت اور خوف خدا میں اور قرآن و حدیث کے جاننے میں مشہور ہوں ان سے اس طرح سوال کرے کہ مجھے اس مسئلہ کے بارے میں محمدی طریقہ بتائیے۔

لیجیے! مولانا ولایت علیؒ ان پڑھ اور جاہل کے لیے بھی تقلید شخصی کو واجب نہیں کہتے، وہ اس کو یہ مشورہ بھی نہیں دیتے کہ مسئلہ پوچھنے کے لیے کسی ایسے عالم کے پاس

جائے جو کسی خاص امام کے فتاوی اور مجتہدات کا ماہر ہو، اور نہ یہ کہتے ہیں کہ اس کو کسی امام کا قول دریافت کرنا چاہیے، بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ان پڑھ بھی مسئلہ ایسے شخص سے پوچھے جو قرآن اور حدیث کا علم رکھنے میں مشہور ہو اور اس سے بھی کسی فقہی مذہب کا طریقہ نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ دریافت کرے اور قرآن وحدیث کی بات معلوم کرے۔

اس کے بعد لکھتے ہیں:

واگر مرد طالب علم است و شوق تحصیل علوم در دل دارد مناسب این است کہ اول قرآن و حدیث بخواند، بعد ازاں بکتب دیگر نظر ہمت گمارد، تا آئینہ وار ظاہر شود کہ برائے کدام بزرگوار در کدام جا صواب یافتہ وکجا روئے خطا دیدہ۔ پس ہر مسئلہ کہ مصرح بقرآن وحدیث یابد درآں تقلید ہیچ مجتہدین نکند کہ در مصرحات اجتہاد را دخلے نیست۔

اور اگر کوئی شخص علم کا طالب ہے اور دل میں دینی علوم کی تحصیل کا شوق رکھتا ہے تو اس کے لیے مناسب یہ ہے کہ پہلے قرآن وحدیث پڑھے، اس کے بعد دوسری کتابوں پر نظر ڈالے، تاکہ آئینہ کی طرح ظاہر ہو جائے کہ کس بزرگ کی رائے نے کس جگہ امر حق کو پالیا ہے اور کہاں غلطی ہوئی ہے۔ پس جو مسئلہ قرآن وحدیث میں صاف صاف پاوے اس میں کسی مجتہد کی تقلید نہ کرے، کیونکہ کھلے ہوئے مسائل میں اجتہاد کو کچھ دخل نہیں ہے۔

بتائیے! اگر مولانا ولایت علیؒ مقلد ہوتے اور تقلید کو ضروری جانتے تو طالب علم کو یہ کیسے مشورہ دیتے کہ اس کو پہلے قرآن اور حدیث پڑھنا چاہیے تاکہ مجتہدین کے خطا اور

صواب کو پہچان سکے۔ چنانچہ آگے چل کر صاف لکھ دیا ہے۔

خلاف آں اگر در کتبِ مجتہدین برآید ازاں چشم پوشی نمودہ دست آویزہ باقرآن وحدیث ضرور است وگرنہ نسخ قرآن وحدیث از قولِ مجتہدین لازم خواہد آمد۔

اگر مجتہدین کی کتابوں میں قرآن وحدیث کے خلاف نکل آوے تو اس سے آنکھیں بند کرکے قرآن وحدیث پر چنگل مارنا ضروری ہے، ورنہ مجتہدوں کے قول سے قرآن اور حدیث کا منسوخ ہونا لازم آئے گا۔

مولانا ولایت علیؒ فرماتے ہیں "بعضے می فہمند کہ در خلائق حنفی مشہور شدن نیز از ضروریات دین ست پس اگر مخالفت قول ابی حنیفہؒ نمودیم حنفیت نخواہد ماند۔" یعنی بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خلائق میں حنفی مشہور ہونا بھی دین کی ضروری باتوں میں سے ہے، اس لیے اگر ہم امام ابوحنیفہؒ کے قول کی مخالفت کریں گے تو حنفیت باقی نہ رہے گی۔"

اس کے بعد مولانا نے "تفصیل جوابش باید فہمید" (اس کے جواب کی تفصیل سمجھنا چاہیے) کہہ کر اس کا جواب دیا ہے، جواب کے آخر میں لکھا ہے۔ "محققین را مقصود اتباع حق می شود نہ انتساب بمردماں" یعنی تحقیق والوں کو حق کی پیروی مقصود ہوتی ہے نہ کہ لوگوں کی طرف منسوب ہونا۔

مولانا بڑی جرأتِ ایمانی کے ساتھ فرماتے ہیں:

"واز ہمیں اسباب تلامذہ و دیگر علماء در بعض مقام از مذہب ابی حنیفہ متخلف شدند، ایں مقلدان ہم دراں مقام جانب علمائے دیگر اختیار کردہ اند

اور انھی وجہوں سے امام صاحب کے شاگرد اور دوسرے علماء بعض مقام میں امام ابوحنیفہ کے مذہب سے علیحدہ ہوگئے ہیں، اور ان مقلدوں نے بھی ان مقامات میں دوسرے

وتقلید امام را گزاشتند، پس در بعض جا علماء کی جانب کو اختیار کیا ہے اور امام کی تقلید
حنفی می شوند و بعض جا ابو یوسفی و کو چھوڑ دیا ہے، بعض جگہ حنفی ہوتے ہیں اور بعض
محمدی و جائے دیگر زفری و جائے جگہ ابو یوسفی اور محمدی اور دوسری جگہ زفری اور
ابو اللیثی، پس حنفیت ایشاں کے کسی جگہ ابو اللیثی، تو ان کی حنفیت
باقی ماند ؟ کہاں باقی رہی ؟

بتائیے ! کسی حنفی مقلد کی گفتگو کے یہ تیور ہو سکتے ہیں ؟

یہ رسالہ "عمل بالحدیث" کے چند اقتباسات ہیں۔ اب رسالہ "تیسیر الصلوۃ"، سے چند مسائل یہاں نقل کر دینا چاہتا ہوں، جن سے واضح ہوتا ہے کہ مولانا ولایت علی حنفی مقلد نہیں بلکہ عامل بالحدیث تھے۔ اس رسالہ میں الگ الگ فصل مقرر کر کے مسئلے بیان کیے گئے ہیں۔

پانی کے بیان میں لکھتے ہیں :

"فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے الماء اذا کان قلتین لم یحمل الخبث۔ (ترجمہ) پانی جب ہوئے دو کھال تو نہ اٹھاوے نجاست کو، مگر جب نجاست کی بو یا رنگ یا مزا پانی میں پیدا ہو، پھر کتنا ہی پانی زیادہ ہو ناپاک ہے۔ اس پانی کو نکالا چاہیے۔ یہاں تک کہ نجاست کا رنگ و بو و مزا جاتا رہے۔" (ص ۸۰)

"طہارت کے بیان میں" لکھتے ہیں۔

"غسل اور وضو کی نیت بدعت ہے، ملّاؤں نے بنائی ہے، غضب تو یہ کیا کہ ہاتھ دھونے کی جدا اور منہ کی جدا۔ لوگ اتنا نہیں سمجھتے کہ

نیت دل سے علاقہ رکھتی ہے نہ منہ سے ۔ ۔ ۔ ۔ لڑکا جب تک دودھ پر رہے، اس کے پیشاب کو دھونا ضرور نہیں۔ اگر لڑکی ہو تو ضرور ہے۔ فرمایا رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے انما یغسل من بول الانثی وینضح من بول الذکر۔ (ترجمہ) دھویا جائے پیشاب لڑکی کا اور پانی چھڑکا جاوے پیشاب پر لڑکے کے یعنی ایک چلو اٹھا کر اس پر مارا جاوے۔

"فرض نماز کے بیان میں،" جو فصل مقرر کی ہے اس کے ذیل میں مسافر کے لیے جمع تقدیم اور جمع تاخیر دونوں صورتوں کو جائز بتایا ہے، بلکہ احناف پر حجت تمام کرنے کے لیے یہ بھی لکھا ہے کہ "شیخ عمر جو مکے میں حنفی مذہب کے مفتی اور پیشوا تھے انھوں نے سفر میں جمع کا فتویٰ بھی دیا ہے، اور وہ فتویٰ ہندوستان میں وارد اور مشہور ہوا۔ (ص ۸۲)

اسی فصل میں یہ مسئلہ بھی لکھا ہے کہ جس کا لڑکا گود سے نہ اترے اس کیلئے لڑکا لیے لیے نماز پڑھنی درست ہے۔ اور اس کی دلیل میں وہ حدیث نقل کی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کی امامت کرتے تھے اس حال میں کہ اپنی نواسی اُمامہ بنت ابوالعاص کو اپنے کندھے پر بٹھائے رکھتے، جب رکوع (اور سجدہ) میں جاتے تو اتار دیتے، اور جب سجدہ سے اٹھتے تو پھر امامہ کو اپنے کندھے پر بٹھا لیتے۔

حاشیہ میں لکھا ہے:

"در مفتاح الصلوٰۃ آوردہ کہ اگر سگ بچہ ہمراہ او باشد کہ دہن او بستہ باشد نماز جائز است پس از بچۂ آدم بچۂ سگ بہتر نیست۔"

یعنی "حنفی مذہب کی کتاب مفتاح الصلوٰۃ میں لایا گیا ہے کہ اگر کتے کا بچہ جس کا منہ باندھ دیا گیا ہو نمازی کے ہمراہ ہو تو اس کی نماز جائز ہے۔ (مولانا فرماتے ہیں) "پس از بچہ آدم بچہ سگ بہتر نیست" یعنی آدمی کے بچہ سے کتے کا بچہ بہتر نہیں ہے۔ (جب کتے کے بچہ کو ساتھ لے کر نماز پڑھنا جائز ہے تو آدمی کے بچہ کو گود میں لے کر نماز کیوں جائز نہیں ہوگی۔)

حنفیہ جنازہ کی نماز میں سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے قائل نہیں ہیں، لیکن مولانا ولایت علیؒ نے اس رسالہ میں نماز جنازہ کی جو ترکیب لکھی ہے، اس میں بتایا ہے کہ دعا ثنا کے بعد الحمد کی سورہ پڑھے اس کی دلیل میں حدیث پیش کی ہے۔ اسی طرح حنفیہ غائبانہ جنازہ پڑھنے کے بھی قائل نہیں ہیں اور جب مردہ دفن ہو جائے تو اس کی قبر پر جا کر نماز جنازہ پڑھنے کے لیے چند قیود اور شرطیں بیان کرتے ہیں۔ مگر مولانا کسی شرط و قید کے بغیر ان دونوں باتوں کے قائل ہیں، لکھتے ہیں۔

"اور جو مردہ دفن ہو چکا ہے تو نماز اس کی قبر پر جا کر پڑھے اور جو کوئی ایک بھی مسلمان قبر پر کسی طرح حاضر نہ ہو سکے تو نماز اس کی دور ہی سے پڑھ لے۔" (ص ۸۷)

ان تصریحات کی روشنی میں کون کہہ سکتا ہے کہ مولانا ولایت علیؒ مسلکِ فقہی کے اعتبار سے اہلحدیث نہیں، حنفی تھے۔

ایک شبہ اور اس کا جواب:

"تذکرۂ صادقہ" کی بعض عبارتوں کی بنا پر مولانا کے مسلک کے متعلق یہ شبہ کیا گیا ہے

کردہ حنفی تھے ۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اسی سلسلہ میں اس شبہ کا بھی ازالہ کردوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر "تذکرہ صادقہ" کی پوری بات سامنے ہو تو شبہ آپ سے آپ دور ہو جائے گا۔

"تذکرہ صادقہ" کے مولف لکھتے ہیں۔

"آپ کی ترغیب تحصیل قرآن واحادیث اور وعظ و نصائح سے ملک ہندوستان میں عمل بالحدیث کا چرچہ ہوا اور تقلید و تعصب کی بنا کمزور و مضمحل ہونے لگی، کیوں کہ قرآن و حدیث کی محبت اور ان کی ترویج نے حق کو روشن کر دیا۔ جاءَ الحقّ وزھقَ الباطِل۔ اور آپ کے مریدان مسائلِ حنفیہ پر جب تک وہ کسی حدیثِ صریح غیر منسوخ کے مخالف نہ ہوتے عمل کرتے، کیونکہ سارے عمل کا خلاصہ اللہ کی خوشنودی کا ڈھونڈنا ہے نہ کہ اختلاف پیدا کرنا۔ اگر یہ غرض پیش نظر رہے تو زیغِ اختلاف خود خشک اور ڈھیلی پڑ جائے۔" (ص ۱۷۱)

فرمائیے! یہ کیسے حنفی اور مقلد تھے جن کے وعظ اور نصائح اور قرآن وحدیث کی تحصیل کی ترغیب سے تقلید کی بنیادیں ہل گئیں۔ اور ہندوستان میں براہِ راست حدیث پر عمل کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ مذکورہ بالا اقتباس پر غور کیجیے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا اور ان کے عقیدتمندوں کا طریقہ یہ تھا کہ وہ حنفی مذہب کے مسائل کو قرآن اور حدیث پر پیش کرتے تھے۔ جو مسائل قرآن اور حدیث کے خلاف معلوم ہوتے، ان کو چھوڑ دیتے اور جو موافق ہوتے ان کو مان لیتے۔

بس یہی ہے اہلحدیث کا مذہب۔ اس اصول کو تسلیم کر لینے کے بعد اگر کوئی شخص

اپنے آپ کو اہلحدیث کہلوانے کے بجائے حنفی کہلوانا پسند کرتا ہے تو کرے ہمیں اس پر اعتراض نہیں ہے۔ احناف کے ساتھ ہمارا حقیقی اختلاف نام کا نہیں ہے، بلکہ اصول کا ہے۔ نام کا اختلاف تو محض ظاہری اور تعارفی ہے۔ مولانا ولایت علی کس اعتبار سے اپنے کو حنفی کہتے تھے اس کی وضاحت کے لیے ایک مناظرہ کا واقعہ یہاں قابلِ ذکر ہے۔

مولانا عبدالرحیم مؤلف "تذکرہ صادقہ" لکھتے ہیں۔

"اس ملتِ حقہ کی روز افزوں ترقی اور اشاعت قرآن و احادیث دیکھ کر کوتاہ بیں لوگوں نے مولوی محمد فصیح صاحب غازی پوری کو دو ہزار انعام کے وعدہ پر علمار حق سے مناظرہ کرنے کے لیے مدعو کیا۔ مناظرہ کے دن مولوی ولایت علی صاحب نے مولوی محمد فصیح کی مع ان کے ہمراہیوں کے دعوت کی۔ بہت سے علمار اور فضلار اور خاص و عام جمع ہوئے۔ مگر مولانا ولایت علیؒ نے مولوی محمد فصیح صاحب کو علیحدہ کمرہ میں لے جاکر (کیونکہ مجلس عام میں گفتگو ہونے سے انسان حق کے قبول کرنے سے شرم کرتا ہے اور اصرار پر آمادہ ہو جاتا ہے) بحاضری چند اشخاص ان سے فرمایا کہ میں حنفی المذہب ہوں۔ اور یہ مسئلہ متفق علیہ ہے کہ اگر کوئی حنفی کسی حدیثِ صریح غیر منسوخ کو دیکھ کر کسی مسئلہ فقہی کے خلاف عمل کرے تو وہ مذہبِ حنفی سے خارج نہیں ہوتا بفحوائے قول امام علیہ الرحمہ اترکوا قولی بخبر الرسول (میرے قول کو حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں ترک کر دو) یہ کلیہ مناظر صاحب کے فہم عالی میں آگیا۔

اور انھوں نے حق کی طرفداری کرتے ہوئے مجمع عام میں باآواز بلند فرمایا کہ یہ جماعت حق پر ہے۔ احادیث الرسول پر عامل ہونے سے کوئی شخص حنفیت سے خارج نہیں ہوتا۔ ہمارا اور ان کا مسلک ایک ہے۔ اس روز جلسہ برخاست ہوگیا۔ مگر جب مناظر صاحب اپنے قیام گاہ محلہ لودیکرہ واپس گئے، تو ان کے مریدوں نے اور جن لوگوں نے ان کو دعوت دی تھی سخت تخجل اور شرمندہ کیا اور آپ کو دوبارہ برسرعام بحث کرنے پر مجبور کیا۔ اور چند دیگر علماء خصوصاً مولوی واعظ الحق صاحب کو ان کی تائید کے لیے مقرر کیا، چنانچہ مولوی محمد فصیح صاحب مع معاونین بحث کے لیے مولوی الٰہی بخش صاحب کے مکان پر تشریف لائے، مولانا ولایت علی صاحب نے بحث کے لیے مولوی فیاض علی صاحب کو اور ان کی اعانت کے لیے مولوی حکیم ارادت حسین صاحب کو بھیجدیا۔ حکیم صاحب کتابیں کھول کھول کر مقامات مبحوث عنہ دکھلاتے جاتے۔ اس مرتبہ بھی مولوی محمد فصیح صاحب نے اعتراف حق کیا، مگر اس بار ضرورۃً مباحث بالا اختصار قلمبند کرکے مناظر مولوی محمد فصیح صاحب غازی پوری سے اقرار دستخطی کرالیے گئے، جن کا خلاصہ یہ تھا کہ پابند مذہب حنفی اگر بوجہ ترجیح بالدلیل کسی حدیث صحیح غیر منسوخ پر مثل رفع یدین، آمین بالجہر وغیرہ کے عمل کرے تو وہ اپنے امام کے اتباع سے خارج نہیں ہوتا۔ (تذکرہ صادقہ ص ۱۱۹)

دیکھیے مولانا ولایت علیؒ اپنے کو حنفی المذہب اس لیے نہیں کہتے کہ ان کے نزدیک فقہ حنفی کے سب مسائل حق ہیں۔ اور نہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ان مسائل کو

اب قرآن اور حدیث سے جانچنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ وہ صرف اس اعتبار سے اپنے کو حنفی المذہب کہتے ہیں کہ حدیثوں پر ان کا عمل امام ابو حنیفہ علیہ الرحمہ کے اس ارشاد کے مطابق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے مقابلہ میں میرا قول چھوڑ دو، اور حدیث پر عمل کرو، حتیٰ کہ وہ علماء جن کو انھوں نے مولوی محمد فصیح صاحب غازی پوری حنفی کے مقابلے میں مناظرہ کے لیے بھیجا تھا، انھوں نے رفع یدین اور آمین بالجہر تک کو اسی اصول کے ماتحت صحیح ہونا منوا لیا، جس کا مطلب یہ ہوا کہ مولانا ولایت علی بھی اسی کے قائل تھے۔ کیونکہ یہ علماء مولانا ولایت علی ہی کی طرف سے گئے تھے، اور جو کچھ گفتگو انھوں نے کی وہ مولانا کی نیابت اور وکالت میں کی۔ یہ دونوں مولانا کے عزیز اور ان کی تعلیم و تربیت سے خاص طور پر فیض یافتہ تھے۔

الحاصل اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ مولانا ولایت علی عقیدہ اور مسلک کے اعتبار سے اہلحدیث ہی تھے، مگر چونکہ مجاہد، مبلغ اور داعی تھے اور ان کے نزدیک تحریک جہاد کے ساتھ ساتھ ان مسلمانوں کے عقائد اور اعمال کی اصلاح کا اہم کام مقدم تھا جو طرح طرح کی بدعات و خرافات کے علاوہ شرکیہ جرائم تک کی گندگیوں میں مبتلا تھے اور ان کے دل و دماغ پر جاہل پیروں اور دنیا پرست مولویوں کا قبضہ تھا جو اپنے ذاتی اغراض کی خاطر نام کے بہلانے فتنہ برپا کرتے جیسا کہ بعد میں ہوا۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ۔ (اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلاؤ۔) کے مطابق مولانا نے نام کی بحث میں الجھنا مناسب نہ سمجھا ہو۔ ورنہ آخر یہ کیا بات ہے کہ خود مولانا یا ان کے صحبت یافتہ بزرگوں کے قدم جہاں جہاں پہنچے ہر جگہ انھیں سنتوں کا احیاء اور رواج ہوا جن کے

اہلحدیث قائل ہیں۔ اور حنفیت کے بجائے اہلحدیثیت کو فروغ ہوا۔ گاؤں کے گاؤں اور علاقے کے علاقے اہلحدیث ہوگئے، جیسا کہ آئندہ صفحات میں اس کا ذکر آئے گا

مولانا ولایت علیؒ کے خاندان اور دوسرے اقرباء کا مسلک:

مہر صاحب مولانا ولایت علیؒ کے متعلق لکھتے ہیں:

"مولانا رائے بریلی میں تربیت پاکر وطن گئے تو زندگی کا ایک ایک لمحہ وعظ و تبلیغ کے لیے وقف کر دیا، انھی کی کوشش سے ان کا خاندان اور دوسرے اعزہ و اقرباء سید صاحب سے وابستہ ہوئے۔ مثلاً مولانا کے والد مولوی فتح علی، ان کے بھائی مولانا عنایت علی، مولانا طالب علی اور مولانا فرحت حسین۔ ان کے اقرباء میں سے مولانا شاہ محمد حسین، مولوی الٰہی بخش، مولانا احمد اللہ، مولانا یحییٰ علی، مولانا فیاض علی، مولوی قمر الدین، مولوی باقر علی، غرض ان سے تعلق رکھنے والوں میں ایک بھی فرد ایسا باقی نہ رہا، جس نے سید صاحب کی ارادت کا حلقہ اپنی گردن میں نہ ڈال لیا ہو۔ اور ان حضرات کی قربانیاں تاریخ مجاہدین کا نہایت شاندار اور درخشاں باب ہیں۔"

(سرگزشت مجاہدین ص ۲۲۶)

جب دلائل اور شواہد سے وضاحت کے ساتھ یہ ثابت ہوگیا کہ مولانا ولایت علیؒ اہلحدیث تھے تو اب اسی سلسلے میں ہم چاہتے ہیں کہ مولانا موصوف کے خاندان اور دوسرے اعزہ و اقرباء کے مسلک کے متعلق بھی بات صاف ہو جائے، کیونکہ بقول مہر صاحب

ان حضرات کی قربانیاں بھی تاریخ مجاہدین کا نہایت شاندار اور درخشاں باب ہیں۔

● ابھی اوپر "سرگزشت مجاہدین" کے حوالے سے جو اقتباس پیش کیا گیا ہے، اس میں مولانا عنایت علی کا ذکر بھی ہے۔ یہ مولانا ولایت علی کے منجھلے بھائی ہیں، ان کو مولانا ولایت علیؒ نے بنگال کے خطہ میں تبلیغ و ہدایت کے لیے مقرر فرمایا تھا۔ ان کے حالات میں لکھا ہے کہ:

"آپ نے بار اول مسلسل سات برس اس خطہ میں قریہ بقریہ نہایت جانفشانی اور حلم کے ساتھ گشت فرمایا، لاکھوں خلقت کو قعر ظلمت سے نکال کر شمع ہدایت کا گرویدہ کر دیا، اور قرآن و احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی طرف توجہ دلایا۔ جناب کے مسترشدین اور ان کی اولاد آج تک خطہ بنگال میں محمدی لقب سے ممتاز ہیں۔"

(تذکرہ صادقہ ص ۱۳۳)

اہلحدیث ہی کا دوسرا نام "محمدی" بھی ہے۔ سید احمد شہیدؒ کی جماعت میں جو گروہ مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ کے زیر تربیت تھا وہ "محمدی" کہلاتا تھا۔ چنانچہ ایک انگریز نے سید صاحب کی جماعت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ:

"دو مختلف اور متضاد گروہوں سے مرکب تھی جنھیں متحد رکھنے میں وہ (یعنی سید صاحب) مدت العمر ساعی رہے۔ ان میں سے ایک گروہ کے سردار مولوی عبدالحی اور مولوی کرامت علی جونپوری تھے جو اہلسنت کا طریقہ رکھتے تھے، اور دوسرے گروہ کے سردار مولوی اسمٰعیل تھے جو چاروں اماموں کی تقلید سے آزاد تھے اور براہ راست حدیث کو اپنا ماخذ قرار

دیتے تھے، خود سید احمد صاحب عمل کے اعتبار سے حنفی تھے مگر اسی کے ساتھ مولوی اسمٰعیل صاحب کی جماعت کی سرپرستی کرتے تھے جو اپنے کو محمدی کہتے تھے۔" (مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۱۰۴)

مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری مرحوم کو کون نہیں جانتا کہ وہ پنجاب سے نکل کر دوسرے مقامات کے جلسوں اور مناظروں میں بھی تشریف لے جایا کرتے تھے۔ ۲۵ اپریل ۱۹۱۳ء کے اخبار "اہلحدیث" میں بنگال کے اپنے ایک سفر کا کچھ حال شائع کیا ہے، ضلع ڈھاکا اور ضلع مرشد آباد کے متعدد گاؤں مثلاً لال پور اسلام پور جنگی پور، سورج نرائن پور وغیرہ میں جانے کا خاص طور پر ذکر فرمایا ہے۔ اسی سلسلے میں لکھتے ہیں۔

"اس کے علاوہ میں اس سفر میں یہ بات بھی سوچتا رہا کہ بنگالہ میں اہلحدیث جماعت کی اتنی کثرت کیسے اور کس کے ذریعہ سے ہوئی؟ تو مجھے بتلایا گیا کہ جناب مولانا عنایت علی اور مولانا ولایت علی صاحبان کی یہ برکت ہے۔"

(اہلحدیث جلد دہم ۲۶)

ان شواہد کے بعد کیا شبہ باقی رہ جاتا ہے اس بات کے ثبوت میں کہ مولانا عنایت علی مسلکاً اہلحدیث تھے۔

● مولانا ولایت علی کے ایک خاص عزیز اور خلیفہ مولانا فیاض علی تھے۔ مولانا ولایت علی کے مسلک کے بارے میں گفتگو کے سلسلے میں مولوی محمد فصیح صاحب غازیپوری حنفی کے ساتھ مناظرہ کا جو واقعہ بیان کیا گیا ہے اس میں گزر چکا ہے کہ مناظر یہی مولانا فیاض علی تھے، جنھوں نے حنفی مناظر سے یہ اقرار کرا لیا کہ حنفی مذہب کا پابند اگر بوجہ ترجیح بالدلیل کسی حدیث صحیح غیر منسوخ پر مثل رفع یدین، آمین بالجہر وغیرہ کے عمل کرے تو وہ اپنے امام

کی اتباع سے خارج نہیں ہوتا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مولانا فیاض علی کے نزدیک یہ مسائل حدیث صحیح غیر منسوخ سے ثابت ہیں اور دلیل کی رو سے انھی پر عمل کرنا راجح ہے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک نزاعی مسائل کو دلیل سے جانچنا چاہیے کہ کون راجح ہے اور کون مرجوح، کون قوی ہے اور کون ضعیف۔ اور ایسا کرنے والا حنفی مذہب سے خارج نہیں ہوگا۔

اہلحدیث بھی یہی کہتے ہیں کہ آج جو لوگ تقلید شخصی کو واجب کہتے ہیں اور اپنے آپ کو امام ابوحنیفہؒ کا مقلد بتاتے ہیں وہ درحقیقت امام صاحب کے پورے اور سچے مقلد نہیں ہیں۔ کیوں کہ ان لوگوں نے امام صاحب کے قول "اترکو قولی بخبر الرسول" (حدیث رسولؐ کے مقابلہ میں میرا قول چھوڑ دو) اور "اذا صح الحدیث فھو مذھبی" (جب صحیح حدیث سے کوئی بات ثابت ہو جائے تو وہی میرا مذہب ہے۔) کو نظر انداز کر دیا ہے۔ پس اصول کو ماننے والا اور عملاً اس کو برتنے والا اگر اپنے کو حنفی کہتا ہے تو کہے "حقیقۃً" وہ اہلحدیث ہے۔

اس کے علاوہ مولانا فیاض علیؒ کے اہلحدیث ہونے کا ایک بڑا ثبوت ان کا رسالہ "فیض الفیوض" ہے۔ یہ رسالہ بھی مجموعہ رسائل تسعہ میں (جس کا ذکر گزشتہ سطر میں آچکا ہے) شامل ہے۔ اصل رسالہ فارسی زبان میں ہے، اس کا ترجمہ مولوی الٰہی بخش صاحب بہاری نے کیا ہے، اسی ترجمہ کے ساتھ یہ رسالہ شائع ہوا ہے۔ یہ رسالہ مجموعہ رسائل تسعہ کے ص۱ سے شروع ہو کر ص ۳۸ پر ختم ہوا ہے۔ اس میں شروع سے آخر تک تمام باتیں تقلید اور عمل بالحدیث ہی کے متعلق سوال اور جواب کے عنوان سے بیان کی گئی ہیں، اس کا ایک ایک حرف اہلحدیث مذہب کے مطابق ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ میں تو یہ کہوں گا

کہ اس میں بڑی بصیرت کے ساتھ، بہترین انداز میں اہلحدیث مذہب کی پوری پوری ترجمانی کی گئی ہے، سوالات کے جواب میں حسب موقع آیت اور حدیث کے علاوہ تائید کے لیے بکثرت علمائے سلف کے اقوال بھی نقل کیے گئے ہیں۔ مختصر طور پر کچھ اقتباسات ہم یہاں پیش کرتے ہیں:

سوال: از علمائے ربانیین و فقہائے راسخین دیگر کہ بدرجہ اجتہاد نرسیدہ است خواہ عالم باشد خواہ عامی عمل بر حدیث نمودن اورا جائز است یا نہ؟ بینوا و توجروا

جواب: الحکم للہ وھو احکم الحاکمین عالمیکہ بتامیل عبارت عارف است و ناسخ را از منسوخ می فہمد و صحیح را از ضعیف می شناسد و بر کتب متداولہ محدثین قدرت می دارد عمل بر حدیث نمودن اورا جائز است بالاتفاق امام اعظم و صاحبیہ رحمہم اللہ تعالے۔ اما کسے کہ عامی باشد عمل بر حدیث نمودن او را ہم واجب است

علمائے ربانیین و فقہائے راسخین سے سوال ہے کہ جو شخص اجتہاد کے درجہ پر نہیں پہنچا ہو خواہ وہ عالم ہو یا جاہل اس کو حدیث پر عمل کرنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: حکم اللہ ہی کے لیے ہے اور وہ سب حاکموں سے بڑا حاکم ہے، جو عالم کہ عبارت کا مطلب بیان کرنا جانتا ہے اور ناسخ کو منسوخ سے (امتیاز کرنا) پہچانتا ہے اور صحیح کو ضعیف سے جدا کرتا ہے، اور محدثین کی متداول کتابوں کے سمجھنے کی قدرت رکھتا ہے، اس کو حدیث پر عمل کرنا جائز ہے، اس پر اتفاق ہے۔ امام اعظم (ابوحنیفہؒ) اور ان کے دونوں شاگرد (امام ابو یوسفؒ و امام محمدؒ) کا۔ لیکن وہ شخص جو عامی (جاہل) ہے سو اس کو بھی حدیث

نزدِ امام اعظمؒ و محمدؒ خلافاً لابی یوسف۔

پر عمل کرنا واجب ہے، امام اعظمؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک، امام ابو یوسفؒ اس کے خلاف ہیں۔

سوال: تابع مجتہدے را اگر حدیثے صحیح صریح غیر منسوخ مخالف قول امام خود رسد عمل بر حدیث نماید یا بر قولِ امام؟ واگر بر قولِ امام کند و حدیث را ترک سازد حالِ او عند اللہ چیست؟ بیان کنید ایں مسئلہ را از اقوال فقہاءِ عظام وصوفیائے کرام۔ بتوفیق اللہ الملک العلام۔

سوال: ایک شخص ایک مجتہد کا مقلد ہے اگر اس کو کوئی ایسی صحیح صریح غیر منسوخ حدیث ملے جو اس کے امام کے قول کے مخالف ہو تو اس کو اپنے امام کے قول پر عمل کرنا چاہیے یا اس حدیث پر؟ اگر وہ اپنے امام کے قول پر عمل کرے اور حدیث کو چھوڑ دے تو اس کا حال اللہ تعالیٰ کے نزدیک کیا ہوگا؟ اس مسئلہ کو فقہاء اور صوفیاء کے اقوال سے بیان کیجیے۔

جواب: وقتیکہ کسے حدیثِ صحیح صریح غیر منسوخ یابد عمل بر حدیث نمودن اورا واجب است، بلکہ از عبارت ہدایہ و نہایۃ البیان و بحرالرائق و درمختار و عنایہ وغیرہ کہ بالا مذکورؔ اند مفہوم می شود کہ اگر حدیث

جواب: جب کوئی شخص حدیث صحیح غیر منسوخ پاوے تو اس کو اس حدیث پر عمل کرنا واجب ہے بلکہ ہدایہ و غایۃ البیان و بحرالرائق و درمختار و عنایہ وغیرہ کی جو عبارت اوپر مذکور ہوئیؔ اس سے سمجھا جاتا ہے کہ اگر حدیث صریح بھی نہ ہو بلکہ

ؔ یہ عبارتیں اس رسالہ میں مذکور ہیں یہاں ہم نے اختصار کے خیال سے ان کو نقل نہیں کیا ہے ۱۲ رحمانی

هر ترک هم نباشد بلکہ احتمالِ تاویل یا نسخ داشتہ باشد و اطلاع بر تاویل و نسخِ آں نشود آں وقت هم غیر مجتهد را عمل بر ظاهر آں حدیث کردن واجب است، و استفسار از کدام مفتی و مجتهد لازم نیست نزدیک امام اعظم و محمد رحمهما اللہ، و نزد ابی یوسف نیز در وقتیکہ عامی جاہل محض نباشد ہمیں حکم است، و ہر کہ حدیث یا آیۃ معارض قول امام خود را ترک سازد و عمل بر قول امام خود کند شیخ اکبر محی الدین ابن العربی رضی اللہ عنہ کہ از علمائے ابرار و امام صوفیائے کبار است آنکس را در کتاب فتوحات مکیہ گمراہ و خارج از دینِ خدا نوشتہ است

احتمال تاویل یا نسخ کا رکھتی ہو اور اس کی تاویل اور نسخ پر اطلاع نہ ہو تو اس وقت بھی غیر مجتہد کو اس ظاہر حدیث پر عمل کرنا واجب ہے، اور کسی مجتہد اور مفتی سے پوچھنا لازم نہیں ہے۔ نزدیک امام اعظمؒ اور امام محمدؒ کے۔ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک بھی جس وقت کہ عامی جاہل محض نہ ہو یہی حکم ہے، اور جو شخص کہ اس حدیث یا آیت کو جو اس کے امام کے قول کے مخالف ہے ترک کر دے اور اپنے امام ہی کے قول پر عمل کرے اس کی نسبت شیخ محی الدین ابن العربی رضی اللہ عنہ جو علمائے ابرار اور صوفیائے کبار میں سے ہیں، کتاب فتوحات مکیہ میں فرماتے ہیں کہ وہ شخص گمراہ اور خدا کے دین سے خارج ہے۔

اس سلسلے میں مولانا فیاض علیؒ نے تقلید کی مذمت اور ممانعت کے بارے میں بہت سی کتابوں کی عبارتیں اور علمائے سلف کے اقوال کثرت سے نقل کیے ہیں۔ مثلاً لکھتے ہیں:

وقال الشيخ الكردري في رسالته ان طريقة المشائخ الصوفية عموما وطريقة الاكابر النقشبندية خصوصاً اتباع السنة النبوية وعدم التقيد بمذهب معين او قول عالم صدق محقق و ليس التعصب بمذهب معين من آداب القوم و اخلاقهم انتهى۔

اور شیخ کردری نے اپنے رسالہ میں فرمایا ہے کہ سنت کی اتباع کرنا ہی مشائخ صوفیہ کا عموماً اور اکابر نقشبندیہ کا خصوصاً طریقہ ہے۔ ان کا طریقہ کسی معین مذہب کی پابندی نہیں ہے اور کسی سچے محقق عالم کی تقلید ان کا شیوہ ہے اور مذہبِ معین پر تعصب کرنا آداب و اخلاقِ صوفیہ سے خارج ہے۔

... ...

کتب تمام فقہائے عظام و صوفیائے کرام ازیں معنی مملو و مشحون است اگر ہمہ را ذکر کنم یک بار شتر گردد۔

کل فقہائے عظام اور صوفیائے کرام کی کتابیں اس مضمون سے بھری پڑی ہیں، اگر ہم ان سب کو ذکر کریں تو ایک اونٹ کا بوجھ ہو جائے،

قال الشيخ عبد الوهاب الشعراني في اليواقيت والجواهر روى عن ابي حنيفة انه كان يقول لا ينبغي لمن لم يعرف دليلي ان يفتي بكلامي وكان الامام مالك يقول ما من احد الا وماخوذ من كلامه ومردود عليه الا رسول الله

شیخ عبد الوہاب شعرانی یواقیت والجواہر میں لکھتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ رح فرماتے تھے کہ جو شخص میری دلیل کو نہیں جانتا ہے، اس کو لائق نہیں ہے کہ میرے قول پر فتویٰ دے، اور امام مالک رح فرماتے تھے کہ کوئی شخص نہیں ہے مگر اس کا قول لیا بھی جاتا ہے اور رد بھی کر دیا جاتا ہے، سوائے رسول اللہ

صلی اللہ علیه وسلم وروی الحاکم
والبیهقی عن الشافعیؒ انه کان
یقول اذا صح الحدیث فهو
مذهبی وفی روایة اذا رأیتم
کلامی یخالف الحدیث فاعملوا
بالحدیث واضربوا بکلامی
الحائط وکان الامام احمدؒ یقول
لیس لاحدٍ مع الله ورسوله کلام
لا تقلدنی ولا تقلدن مالکاً
ولا الاوزاعی ولا النخعی ولا
غیرهم وخذ الاحکام من
حیث اخذوا من الکتاب والسنة
انتهی۔

وقال السیوطی فی کتابه الرد
علی من اخلد الی الارض معزیاً
الی کتاب التخلیص هل اباح
مالکؒ وابوحنیفةؒ والشافعیؒ قط
لاحدٍ تقلیدهم حاشا الله من هذا
بل انهم قد نهوا عن ذلک و

صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ حاکم اور بیہقی نے
امام شافعیؒ سے روایت کیا ہے کہ وہ کہتے تھے
جب حدیث صحیح ثابت ہو جائے تو وہی
میرا مذہب ہے اور ایک روایت میں ہے
کہ جب میرے کلام کو حدیث کے خلاف
دیکھو تو حدیث پر عمل کرو اور میرے کلام کو
دیوار پر مارو۔ اور امام احمد فرماتے تھے
کہ اللہ اور رسول کے ساتھ کسی کے کلام کو
وزن نہیں کیا جاتا۔ ہرگز میری تقلید نہ کرنا
اور نہ مالکؒ کی، نہ اوزاعی کی، نہ نخعی کی،
نہ ان کے علاوہ کسی اور کی۔ بلکہ تم بھی احکام
وہیں سے لو جہاں سے ان لوگوں نے لیا ہے
یعنی کتاب اور سنت سے۔

سیوطی نے لکھا ہے کہ کیا امام مالک اور امام
ابوحنیفہؒ نے یا امام شافعیؒ نے کسی کو اپنی تقلید
کی اجازت دی ہے۔ حاشا اللہ، انھوں نے
کبھی ایسا نہیں کیا بلکہ ان لوگوں نے تو اس
سے منع کر دیا ہے۔ (اور کسی کو اس کی گنجائش نہیں
دی ہے) روضۃ العلماء میں امام ابوحنیفہ سے منقول

منعوا منه ولم يفتحوا الا حد فيه انتهى وفى روضة العلماء عن الامام ابى حنيفة اتركوا قولى بخبر الرسول وخبر الصحابة

ہے کہ میرے قول کو حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور خبر صحابہؓ کے مقابلہ میں چھوڑ دو۔

.... وقدوة المحدثين ابن حزم رح ایں چنیں تقلید را کہ حدیث صحیح را متروک سازد و بر مسائل قیاسیہ امام خود عمل نماید حرام نوشتہ حیث قال فی کتاب النبذ الکافیۃ فی علم الاصول التقلید حرام ولا یحل لاحد ان یاخذ قول احد غیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلا برھان۔

قدوۃ المحدثین ابن حزمؒ نے ایسی تقلید کو حرام لکھا ہے جس میں کوئی شخص حدیث کو چھوڑدے اور اپنے امام کے مسائلِ قیاسیہ پر عمل کرے، چنانچہ انھوں نے کہا ہے کہ تقلید حرام ہے اور کسی کے لیے حلال نہیں ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی (امتی) کا قول بلا دلیل مان لے۔

مولانا فیاض علی نے اسی جواب کے ذیل میں اپنی تائید میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی کتابوں سے بھی عبارتیں نقل کی ہیں، آخر میں مولانا اسماعیل شہیدؒ کی ایک عبارت بڑی عقیدت سے پیش کی ہے، لکھتے ہیں:

ومحدث اکمل، فقیہ بے بدل، عالم باعمل واصل الی اللہ شہید فی سبیل اللہ حضرت مولانا اسماعیل علیہ الرحمۃ در کتاب صراطِ مستقیم نوشتہ کہ در اعمال اتباعِ مذاہبِ اربعہ

اور محدث اکمل، فقیہ بے بدل، عالم باعمل واصل الی اللہ، شہید فی سبیل اللہ حضرت مولانا اسماعیلؒ نے صراطِ مستقیم میں لکھا ہے کہ اعمال میں مذاہبِ اربعہ کی اتباع

کہ رائج در تمام اہلِ اسلام است بہتر و خوب است لیکن علم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم را منحصر در علم یک شخص از مجتہدین ندانند، بلکہ علم نبوی منتشر در آفاق گردیدہ است بموجب مقتضیات وقت بہر کسی رسیدہ و بعد آں کہ کتب مصنف شدہ جمعیت آں علوم ظاہر گشتہ پس در ہر مسئلہ کہ حدیث صریح غیر منسوخ یابد اتباع ہیچ مجتہد دراں نکند، و اہلِ حدیث را مقتدائے خود شناسد، و بدل محبت ایشاں دارد و تعظیم ایشاں لازم شمرد کہ حاملان علم پیغمبر اند و نوعے فائدہ مصاحبت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم حاصل کردہ مقبول جناب رسالت مآب گشتہ اند، و مقلدان تعظیم و توقیر مجتہداں بخوبی می دانند محتاج آگاہی برآں نیستند۔

جو تمام اہلِ اسلام میں رائج ہے بہتر اور خوب ہے لیکن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کو کسی ایک ہی مجتہد کے علم میں منحصر نہ سمجھے کیونکہ علم نبوی سارے جہان میں پھیلا ہے اور مقتضائے وقت کے مطابق ہر آدمی کو پہنچا ہے، اور کتابوں کی تصنیف کے بعد اجتماعی حالت ان علوم کی ظاہر ہوئی، پس جس مسئلہ میں حدیث صحیح صریح غیر منسوخ پاوے اس میں کسی مجتہد کی پیروی نہ کرے، اور اہلحدیث کو اپنا مقتدا جانے، اور دل میں ان کی محبت رکھے۔ اور ان کی تعظیم کو لازم شمار کرے کیونکہ وہ لوگ علم پیغمبر کے حامل ہیں۔ اور ایک طرح پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی مصاحبت کا شرف حاصل کر کے مقبول جناب رسالتمآب ہوئے ہیں، اور مقلدین مجتہدوں کی تعظیم و توقیر کو خوب جانتے ہیں، بتلانے کے محتاج نہیں ہیں۔

اس سوال کے جواب میں کہ عامی کے لیے تمام مسائل میں مذاہب اربعہ میں سے کسی ایک مذہب کی تعیین واجب ہے؟ یا اس کے لیے جائز ہے کہ ایک مسئلہ میں کسی مجتہد کی اتباع کرے اور دوسرے مسئلہ میں دوسرے مجتہد کی؟ فرماتے ہیں۔

قول ارجح ومحقق دریں باب آنست کہ عامی را تعیین مذہب معین واجب نیست بلکہ ہر مفتی ربانی کہ عامی را اعتماد براو باشد ازو فتوی بطلبد ہماں فتوی مذہب اوست واگر فتوی نرسد وعمل او موافق مذاہب کسے از مجتہدین افتادہ آں ہم کفایت می کند۔۔۔

قول ارجح اور محقق اس باب میں یہ ہے کہ عامی کے لیے کسی معین مذہب کی تعیین واجب نہیں ہے بلکہ جس مفتی ربانی پر اس کا اعتماد ہو اس سے فتوی پوچھے وہی فتوی اس کا مذہب ہے۔ اور اگر فتوی نہ پہنچے مگر اس کا عمل کسی مجتہد کے مذہب کے موافق پڑے تو یہ بھی کافی ہے۔۔۔۔

اپنے اس جواب کی تائید میں بحر الرائق کی عبارت نقل کرنے کے بعد مولانا عبد العلی بحر العلوم کا یہ کلام بھی بحوالہ شرح مسلم الثبوت پیش کیا ہے:

لا واجب الا ما اوجبہ اللہ تعالیٰ ولہ الحکم ولم یوجب علیٰ احد ان یتمذہب بمذہب رجل من الائمۃ فایجابہ تشریع جدید۔

(واجب وہی ہے جس کو اللہ نے واجب کیا ہے کیونکہ وہی حاکم ہے اور اللہ نے کسی پر واجب نہیں کیا ہے کہ وہ اماموں میں سے کسی امام کے مذہب کو اپنا مذہب بنالیے۔ لہذا اس بات کو واجب قرار دینا ایک نئی شریعت نکالنا ہے۔)

آیت اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَھُمْ وَرُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللہِ کی تفسیر میں حضرت عدی بن حاتمؓ کی مرفوع روایت نقل کرنے کے بعد مولانا فیاض علی نے لکھا ہے:

پس از آیہ کریمہ حسب تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مستفاد گشتہ کہ تقلید بحت را واجب کردن واز تتبع آیات واحادیث اعراض نمودن شرک است العیاذ باللہ۔

پس اس آیت کریمہ سے حسب تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معلوم ہوا کہ تقلید محض کو

واجب کرنا اور روایات و احادیث کے تتبع سے منہ پھیر نا شرک ہے۔ اللہ پناہ دے۔

مولانا فیاض علیؒ نے اس خیال فاسد کی بھی پرزور تردید کی ہے کہ اجتہاد مطلق ائمہ اربعہ پر ختم ہوگیا۔ ائمہ اربعہ کے بعد کوئی مجتہد مطلق پیدا نہیں ہوا، اور نہ آئندہ ہوگا۔ فرماتے ہیں:

"حکم اختتام اجتہاد مطلق بر ائمہ اربعہ و اختتام اجتہاد فی المذہب بر علامہ نسفی تعصب بحت است، و رجم بالغیب و محض خالی از دلائل و براہین است بلکہ ناشی از ضلال مبین، اخبار بالغیب خاصہ رب العالمین است۔ قال اللہ تعالیٰ وعندہ مفاتح الغیب۔"

(اجتہادِ مطلق کے ائمہ اربعہ پر اور اجتہاد فی المذہب کے علامہ نسفی پر ختم ہو جانے کا حکم لگانا محض تعصب ہے، اور بغیر دیکھے پتھر پھینکنا ہے، اور دلائل و براہین سے بالکل خالی ہے بلکہ صریح گمراہی ہے، کیونکہ غیب کی خبر دینا رب العٰلمین کا خاصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں۔)

اپنے جواب کی تائید میں مولانا نظام الدین سہالوی اور مولانا عبدالعلی کی کتابوں سے عبارتیں نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"بعد ائمہ اربعہ جمعے از علماء بدرجہ اجتہاد مطلق مستقل رسیدہ اند و احداث مذاہب جدیدہ نمودہ و مذہب بعضے از آنہا شیوع یافتہ مثل ابی ثور کہ از ائمہ مشہورین و مجتہد مستقل بود۔۔۔۔ و مثل محمد بن اسماعیل بخاری کہ صاحب مذہب مستقل بود۔۔۔۔ و مثل داؤد ظاہری کہ مجتہد مستقل بود۔ و مثل ابی جعفر محمد بن جریر طبری کہ صاحب مذہب مستقل بود۔۔۔۔"

(ائمہ اربعہ کے بعد علماء کی ایک جماعت اجتہاد مطلق مستقل کے درجہ کو پہنچی ہے اور مذہب جدید کی بانی ہوئی ہے، ان میں سے بعض کا مذہب شائع بھی ہوا۔ جیسے امام ابوثور ہیں، جو ائمہ مشہورین میں سے ہیں اور مجتہد مستقل تھے۔۔۔۔ اور جیسے محمد بن اسمٰعیل بخاری ہیں، یہ بھی مستقل مذہب والے تھے۔۔۔۔ اور جیسے داؤد ظاہری ہیں۔۔۔ اور ابوجعفر محمد بن جریر طبری کہ یہ دونوں صاحب مذہب مستقل تھے۔۔۔۔)

اپنی اس بات کے ثبوت میں مولانا نے کبار علمائے سلف کے اقوال با حوالہ پیش کیے ہیں۔ ہم نے اختصار کے خیال سے ان کو حذف کر دیا ہے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں۔

القصہ جملہ علمائے مجتہدین کہ بعد ائمہ اربعہ شدہ اند قرناً بعد قرن الیٰ یومنا ہذا کہ مذہب بعض آنہا شیوع یافتہ و مذہب اکثرے آنہا در ازمنہ فاسدہ بسبب تعصب متعصبین شیوع نیافتہ، اگر اسامی ہمہ آنہا ذکر کردہ شود یک دفتر عظیم گردد، و حال ہر اقلیم دریافتن مشکل، در ملک، یعنی در ملک ہندوستان در دوازدہ صدی حضرت شیخ الشیوخ مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ گزشتہ اند کہ تبحر علم و اجتہاد شاں از تصانیف شاں ظاہر است، کتاب حجۃ اللہ البالغہ بینہ قویہ آں است بر وسعت علم و اجتہاد شاں، و بعدہ صاحبزادہ والاتبار یعنی حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہ نیز منصب اجتہاد می داشتند تصانیف شاں دلیل

حاصل کلام علماء مجتہدین جو ائمہ اربعہ کے بعد یکے بعد دیگرے ہمارے اس زمانے تک ہوئے ہیں، بعض کا مذہب تو شائع ہوا اور اکثر کا مذہب خراب زمانوں میں متعصبوں کے تعصب کی وجہ سے رواج نہیں پا سکا اگر ان سب کے نام لکھے جائیں تو ایک بڑا دفتر ہو جائے اور ہر ملک کا حال معلوم ہونا بھی مشکل ہے۔ ہمارے ملک ہندوستان میں بارہویں صدی میں حضرت مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ گزرے ہیں جن کا تبحر علم و اجتہاد ان کی تصنیفات سے ظاہر ہے۔ کتاب حجۃ اللہ البالغہ قوی دلیل ان کے وسعت علم و اجتہاد کی ہے۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادے حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہ بھی اجتہاد کا منصب رکھتے تھے ان کی تصانیف بھی اس کی روشن دلیل ہیں، اور ہمارے زمانے میں فاضل اکمل، محدث بے بدل، شیخنا مولانا

بمن برآں است ، و در زمانِ ما
فاضلِ اکمل ، محدثِ بے بدل شیخنا
مولانا محمد اسماعیل علیہ الرحمہ ملکۂ اجتہاد
بائم الوجوہ می داشتند۔ جم غفیر و
جمع کثیر از علمائے ربانیین در ملک
ہندوستان قائل بملکۂ اجتہاد حضرت
ایشاں ہستند، بلکہ صیت علم شاں
تابلاد عرب رسید۔ افضل علمائے
مکہ معظمہ الشیخ عبداللہ سراج قائلِ
سعت علم وملکۂ اجتہاد حضرت ایشاں
بود، اگر چندے در دیارِ عرب قیام می
فرمود صیت علم حضرت شاں تمام جہاں
را فرامی گرفت، وکسانیکہ درحق حضرت
ایشاں طعن می کنند محض تعصب و عناد
است، اعتبار را نشاید المعاصرۃ اصل
المنافرۃ .... ومجتہد فی المذہب وفی
بعض المسائل صدہا قرناً بعد قرنٍ بودہ
اند، ذکر اسامی آنہا را ایں مختصر ہرگز
متحمل نیست بلکہ احاطۂ اسامی

محمد اسماعیل علیہ الرحمہ اجتہاد کا ملکہ پورے
طور پر رکھتے تھے۔ ملک ہندوستان میں
علماء ربانیین کی ایک بڑی جماعت
ان کے ملکۂ اجتہاد کی قائل ہے، بلکہ
ان کے علم کا شہرہ بلاد عرب تک پہنچ گیا
ہے۔ مکہ معظمہ کے افضل ترین عالم شیخ
عبداللہ سراج مولانا (اسمٰعیل) کے
وسعتِ علم اور ملکۂ اجتہاد کو مانتے تھے،
(اگر مولانا شہید) دیارِ عرب میں کچھ دن
قیام فرماتے تو ان کے علم کی شہرت تمام
جہان میں پھیل جاتی، جو لوگ ان پر
طعن کرتے ہیں یہ ان کا محض تعصب اور
عناد ہے جو قابلِ اعتبار نہیں ہے ۔
معاصرت اصلی سبب ہے نفرت کا ..
... (یہ مجتہد مطلق کا ذکر تھا) رہے مجتہد
فی المذہب اور مجتہد فی بعض المسائل تو
یہ تو ہر زمانے میں سیکڑوں ہوئے ہیں، اس
مختصر رسالے میں ان سب کے نام ذکر کرنے کی
گنجائش نہیں ہے بلکہ ان سب کے ناموں کا

شاں متحذر۔۔ احاطہ کرنا مشکل ہے۔

اختصار کے باوجود یہ اقتباسات کافی طویل ہو گئے ہیں مگر فائدے سے خالی نہیں ہیں۔ صادق پور کے ان مجاہد بزرگوں کے متعلق بعض بزرگوں نے بھی لکھ دیا ہے کہ "وہ حنفی تھے، اہلحدیثیت تو ان کے ہاں بہت بعد میں آئی۔" اس لیے اس غلط فہمی کو دور کرنے کی ضرورت تھی۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ جس نے عمل بالحدیث اور تقلید کی نسبت اتنی صاف صاف باتیں لکھی ہوں، جو مروجہ مذاہب اربعہ میں سے کسی ایک کی تعیین اور پابندی کو عامی یعنی جاہل کے لیے بھی ضروری نہ جانتا ہو، جو ائمہ اربعہ پر اجتہاد مطلق کے ختم ہو جانے کے عقیدہ کو "ناشی از ضلال مبین" قرار دیتا ہو، اس کی نسبت ہم کس طرح یہ دعویٰ تسلیم کر لیں کہ وہ اہلحدیث نہیں بلکہ حنفی اور مقلد تھے؟ حاشا ثم حاشا۔

جاں نثاران راہِ حق صادق پوریوں میں ایک بزرگ مولانا یحییٰ علی علیہ الرحمہ بھی ہیں۔ یہ مولانا فیاض علیؒ مذکور کے بھائی ہیں جو عمر میں مولانا فیاض علی سے دس برس چھوٹے تھے، ان کے حالات میں لکھا ہے کہ آمین و رفع الیدین کی متروکہ سنت کا احیاء صوبہ بہار میں آپ ہی نے فرمایا۔" (تذکرہ صادقہ ص ۶۶)

بتائیے! اس کے باوجود ان کو حنفی سمجھا جائے یا اہلِ حدیث؟۔

---

[1] ظاہری انتساب اور تسمیہ کے اعتبار سے اہلحدیثیت ان کے ہاں بعد میں آئی ہو تو آئی ہو۔ لیکن عقیدے کے اعتبار سے یہ حضرات یقیناً بہت پہلے اہلحدیث ہو چکے تھے۔ ۱۲

تذکرہ صادقہ کے مؤلف مولانا عبدالرحیم صادق پوریؒ بھی انگریز کے معتوب رہ چکے ہیں، جس کا ذکر اپنے موقع پر آئے گا۔ یہ مولانا ولایت علیؒ کے حقیقی بھتیجے ہیں، انھوں نے مولانا یحییٰ علیؒ کے متعلق مذکورہ بالا الفاظ جس انداز میں لکھے ہیں یہ بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ مولانا عبدالرحیم بھی اہلحدیث تھے۔ اس لیے کہ کسی حنفی عالم سے یہ بہت بعید ہے کہ وہ آمین اور رفع یدین پر عمل متروک ہونے کو "سنت کا مردہ ہونا"۔۔۔۔ اور اس کے رواج پانے کو سنت کا زندہ ہونا قرار دے۔ یہ تو وہ حضرات ہیں جن کے متعلق خصوصیت کے ساتھ ہم کو اہلحدیث ہونے کا ثبوت مل جاتا ہے۔ اب رہے وہ حضرات جن کا معاملہ معرض سکوت میں ہے۔ نہ ان کے حنفی ہونے کا کوئی واضح ثبوت ہے اور نہ اہلحدیث۔ تو ان کی نسبت ہم کہہ سکتے ہیں کہ بقول مولانا غلام رسول مہر جب یہ لوگ مولانا ولایت علیؒ کی کوشش اور ان کے وعظ و ارشاد سے متاثر ہو کر اس تحریک میں داخل ہوئے تھے تو ظاہر یہی ہے کہ جو مسلک مولانا ولایت علی کا تھا وہی ان حضرات نے بھی اختیار کیا ہوگا۔ لہٰذا جب تک اس کے خلاف کوئی واضح دلیل نہیں ملے گی ہم ان سب حضرات کو بھی اہل حدیث ہی قرار دیں گے۔ اس موقع پر ہم مولانا عبیداللہ سندھی کا ایک بیان بھی قابل ذکر سمجھتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

"مولانا ولایت علی کی تحریک کے متعلق ہمارا اپنا خیال یہ ہے کہ وہ مولانا اسمٰعیل شہید کی اس خاص جماعت کو جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، زندہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، اسی لیے مولانا نذیر حسین اور نواب صدیق حسن جیسے عالم بھی ان کا ساتھ دیتے ہیں۔"

(شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص ۱۳۲)

مولانا اسماعیل شہید کی یہ "خاص جماعت" کون تھی؟ سندھی صاحب ہی نے ہمیں بتایا ہے کہ "یہ وہی لوگ تھے جو رفع یدین اور آمین بالجہر کیا کرتے تھے" اور بقول سندھی صاحب مولانا ولایت علی "اسی جماعت" کو زندہ کرنے اور باقی رکھنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

تو اب صاف ظاہر ہے کہ مولانا ولایت علی کی کوشش اور دعوت و تبلیغ سے جو لوگ اس جماعت میں داخل ہوئے ہوں گے انھوں نے وہی مسلک اختیار کیا ہوگا جس پر یہ وہ خاص جماعت عمل پیرا تھی بس مولانا سندھی کے اس "نکتہ" سے بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ مولانا ولایت علی کے اعزہ واقارب اور جن کی قربانیاں تاریخ مجاہدین کا درخشاں باب ہیں سب اہلحدیث تھے۔ اسی لیے حضرت میاں صاحب مولانا نذیر حسین اور جناب نواب صاحب اس تحریک کے حامی اور معاون تھے اور اس کے برخلاف مولانا محمود حسن دیوبندی اور ان کے متبعین اس تحریک سے بالکل الگ رہے۔ ان لوگوں نے اس کے بجائے اپنا تعلق ترکوں سے قائم کیا جو حنفی تھے۔

ان حضرات کے فقہی مسلک کے متعلق بحمد اللہ بات صاف ہو گئی لہذا وقت آگیا کہ اب ہم ان کی مجاہدانہ خدمات آپ کے سامنے پیش کریں۔

مولانا ولایت علی کی مجاہدانہ خدمات کا نہایت مختصر اور اجمالی تذکرہ:

ان حضرات کے حالات، ان کی دینی خدمات اور ان کے جہاد وغیرہ کی تفصیلات پر متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ بالخصوص مہر صاحب کی کتاب اس موضوع پر نہایت جامع اور آخری کتاب ہے۔ اس لیے ہم تفصیلات میں تو جانا نہیں چاہتے۔ البتہ سلسلۂ بیان کا ربط قائم کرنے کے لیے مختصراً چند باتیں یہاں ذکر کر دیتے ہیں جن کا زیادہ تر ماخذ

یہی شائع شدہ کتابیں ہیں۔

مولانا ولایت علی سید احمد شہیدؒ کے ساتھ ہجرت کر کے بغرض جہاد سرحد پار گئے تھے۔ لیکن سید صاحبؒ نے انھیں باصرار دعوت و تبلیغ کی غرض سے حیدرآباد (دکن) بھیج دیا۔ جہاں کم و بیش چار سال یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ بالاکوٹ میں سید صاحبؒ اور مولانا اسمٰعیلؒ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا اور اسی اثناء میں مولانا کے والد ماجد کا انتقال ہوگیا تو مولانا حیدرآباد سے برہان پور، سیونی، نرسنگھ پور، جبل پور ہوتے ہوئے عظیم آباد پہنچے اور اصلاح عقائد و جہاد کا مقصد پیش نظر رکھتے ہوئے بہار، بنگال، اڑیسہ اور الہ آباد میں دعوت و تبلیغ کا منظم سلسلہ قائم کر دیا۔ طریق تبلیغ یہ تھا کہ مولانا خود ان کے مقرر کیے ہوئے داعی ایک ایک قریے اور ایک ایک موضع میں جاتے، مسلمانوں کو پابند شریعت بناتے، مسجدیں آباد کرتے، اور ارشاد و ہدایت کا مستقل سلسلہ جاری کر دیتے۔ مذکورہ بالا تمام مقامات پر آج تک اہلحدیث موجود ہیں جو ان بزرگوں کی مساعی جمیلہ کی یادگار ہیں۔ مولانا ولایت علی اور ان کے منجھلے بھائی مولانا عنایت علیؒ پوری سرگرمی سے دعوت و تبلیغ میں مصروف تھے اور ان کی نگاہیں اس امر پر جمی ہوئی تھیں کہ وقت اور ماحول کے سازگار ہوتے ہی موزوں مقام سے جہاد کا آغاز کر دیں، یہاں تک کہ سرحد پار کے سکھوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی، ان کی حکومت میں ابتری پیدا ہوئی، اور میدان عمل میں قدم رکھنے کا سازگار موقع پیدا ہو گیا۔

سید ضامن شاہ نے (جو کاغان کے رہنے والے اور ان دنوں سکھوں سے برسرپیکار تھے) مولانا ولایت علی کو دعوت بھیجی کہ آپ تشریف لائیں، اور یہاں آغاز جہاد کے لیے جو سازگار فضا پیدا ہو چکی ہے اس سے فائدہ اٹھا کر اسلامی حکومت کے استحکام و استواری

کا بندوبست کریں۔ مولانا نے اپنے بھائی مولانا عنایت علی کو بھیجنے کی تجویز کی، وہ اس وقت بنگال میں دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ انھیں سرحد جانے کا پیغام ملا تو دو ہزار مجاہدین ساتھ لے کر عظیم آباد پہنچے، جس سے انگریزی حکومت کے کارکنوں میں تشویش پھیل گئی۔ مولانا ولایت علی نے مصلحت و دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے جمعیت منتشر کر دی۔ اور فیصلہ کیا کہ تمام لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ کر یکے بعد دیگرے جائیں، اور سکھوں کے علاقے سے گزرنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہ تھی۔ چنانچہ جمادی الاخریٰ ۱۲۵۹ھ (جولائی ۱۸۴۳ء) سے چار چار، پانچ پانچ، چھ چھ آدمیوں کی ٹولیاں روانہ ہو گئیں۔ اور غالباً چار پانچ مہینے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

سرحد پہنچ کر مولانا عنایت علی نے سکھوں کے ساتھ کئی لڑائیاں لڑیں۔ ایک مکتوب سے جو ذیقعدہ ۱۲۶۳ھ (اکتوبر ۱۸۴۶ء) کا مرقومہ ہے واضح ہوتا ہے کہ مولانا عنایت علی سادات کاغان اور دوسرے مقامی لوگوں کی امداد سے ذی الحجہ ۱۲۶۱ھ (دسمبر ۱۸۴۵ء) میں بالاکوٹ پر قابض ہو چکے تھے۔ وہیں انھیں باقاعدہ امیر جہاد تسلیم کیا گیا۔ سید ضامن شاہ کاغانی نے بھی ان کی اطاعت قبول کر لی، اور آس پاس کے علاقوں کو سکھوں کے قبضے سے آزاد کرانے کے لیے زبردست جہاد شروع ہو گیا۔ تقریباً دو سال کے بعد (اور بعض بیان کے مطابق تین سال کے بعد) ۱۷ شوال ۱۲۶۲ھ (۹ اکتوبر ۱۸۴۶ء) کو مولانا ولایت علی بھی علاقہ مجاہدین میں پہنچ گئے۔ مولانا کے ساتھ مجاہدین کے علاوہ جنگی سامان، ہتھیار، گھوڑے اور اونٹ وغیرہ بھی تھے۔ مولانا کے پہنچنے کے بعد ۲۴ شوال ۱۲۶۲ھ (۱۶ اکتوبر ۱۸۴۶ء) کو جمعہ کے دن مولانا عنایت علی نے امارت کا بوجھ مولانا ولایت علی کے حوالے کر دیا اور جملہ مجاہدین نے آپ کے ہاتھ پر بیعت امارت کی۔

(سرگزشت مجاہدین)

اس وقت کشمیر کے راجہ گلاب سنگھ ڈوگرہ اور مجاہدین کے درمیان جنگ جاری تھی۔ راجہ کو شکست ہوئی، اور اس نے انگریزوں کے سائے میں جاکر پناہ لی جو اس وقت تک پنجاب کے ایک معقول حصہ پر قابض اور ملکی معاملات میں پوری طرح دخیل ہو چکے تھے، پھر تھوڑے ہی دنوں کے بعد نہ صرف پنجاب بلکہ سکھوں کا پورا مقبوضہ انگریزی عملداری میں آگیا۔ حکومت نے مولانا ولایت علی کو اطلاع دی کہ اب گلاب سنگھ پر حملہ کرنا خود انگریزی حکومت سے لڑائی مول لینا ہوگا۔ حکومت کی پالیسی یہ تھی کہ جب تک ان پر براہِ راست زد نہ پڑے، مجاہدین سے ٹکر نہ لی جائے، اور انھیں سکھوں سے لڑنے دیا جائے۔ مجاہدین اور سکھوں میں سے جس کی بھی شکست ہو، سرکار انگریزی کا بہرحال فائدہ ہے۔

اسی لیے شروع شروع مجاہدین سے روک ٹوک نہیں کی گئی، لیکن جب پنجاب کا بڑا حصہ انگریزوں کے قبضے میں آگیا تو مجاہدین حکومت کی نگاہوں میں کھٹکنے لگے مجاہدین بھی خواہ مخواہ حکومت سے برسرِ پیکار ہونا خلافِ مصلحت خیال کرتے تھے مگر پھر بھی درّہ دُوبٹ کے مقام پر مجاہدین اور انگریزی فوج کے درمیان لڑائی ہو گئی، جس میں مجاہدین کو شکست ہوئی۔ اس لڑائی نے مجاہدین کے لیے قیام کی کوئی جگہ باقی نہ چھوڑی۔ کئی سال کی محنت سے جہاد کے لیے جو مرکز بنایا گیا تھا وہ چھن گیا، مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی دونوں بھائی گرفتار کر کے انگریزی فوج کی حراست میں پٹنہ واپس بھیج دیے گئے۔ واپسی پر پٹنہ کے مجسٹریٹ کے روبرو حاضر ہو کر دو سال کے لیے مچلکہ دینا پڑا کہ شہر سے باہر نہ جائیں گے۔ البتہ ان کے ساتھیوں میں سے میر اولاد علی ساکن سورج گڑھ ضلع مونگیر کسی طرح بچ کر نکل گئے اور مجاہدین کی ایک جماعت کے ساتھ ستھانہ پہنچ گئے

مولانا ولایت علی دو سال تک وطن میں رہ کر تبلیغ و تذکیر کرتے رہے مختلف علاقوں میں خاص مبلغ بھیجے۔ اپنے منجھلے بھائی مولانا عنایت علی غازی کو پھر بنگال بھیجا اور تمام مشاغل اس طرح جاری کر دیے کہ عام طور پر یہ خیال کیا جانے لگا کہ اب مولانا سرحد کا رخ نہیں کریں گے۔ حکومت بھی مطمئن ہو گئی، لیکن پورے دو سال قیام کے بعد جب مچلکہ کی میعاد ختم ہو گئی تو پھر سرحد کی طرف ہجرت کا ارادہ کر لیا۔

سرحد کی طرف مستقل ہجرت:

۱۳ شوال ۱۲۶۵ھ (یکم ستمبر ۱۸۴۹ء) کو گھر بار چھوڑا اور مستقل ہجرت کے راستہ میں قدم رکھا۔ مولانا یحییٰ علی (ابن مولانا الٰہی بخش) اور چند احباب مولانا کے ساتھ روانہ ہوئے۔ چلتے وقت اپنے خلف اکبر مولانا عبداللہ اور مولانا فیاض علی ابن مولانا الٰہی بخش سے فرما گئے کہ سفر کا سامان مکمل کر کے اہل و عیال کے ساتھ ایک ہفتہ کے اندر موضع گڈھانہ میں آ کر ملو، پورے قافلہ کے افراد کا تخمینہ دو اڑھائی سو سے کم نہ ہوگا، پیچھے مکان پر صرف پانچ مرد رہ گئے اور دو عورتیں۔

اس ہجرت کی قربانیوں کی بابت مہر صاحب لکھتے ہیں:

"مولانا ولایت علی اس گھرانے کے فرزند تھے جو بہار کے رؤسا میں شمار ہوتا تھا، بہت بڑی جائداد کے مالک تھے، اور ان کے تمام اقربا بھی رؤسا ہی میں محسوب تھے۔ لیکن دیکھیے عشق حق اور خدمت دین کے جذبۂ صادقہ نے کس طرح ان سے سب کچھ چھڑا دیا، اور اس زندگی کی تڑپ دل میں پیدا کر دی جس میں تکلیفوں، اذیتوں اور پریشانیوں کے

سوا کچھ نہ تھا۔ یہ کارنامے صرف ارباب عزیمت انجام دے سکتے ہیں،
مولانا ولایت علی اور ان کے اکثر اقربا سید صاحب کے فیض تربیت سے
یقیناً ارباب عزیمت کا درجہ حاصل کر چکے تھے۔"

(سرگزشت مجاہدین ص ۲۷۰)

دہلی میں ورود اور قیام:

ہجرت کے دوران میں کہاں کہاں پہنچے اس کی پوری تفصیل اور کیفیت تاریخ سے معلوم نہ ہو سکی۔ اتنا ملتا ہے کہ پہلے گڈھانہ میں ٹھہرے جو عظیم آباد سے سات کوس جانب مغرب واقع ہے آگے گئے تو کوئلور (دانا پور اور ڈمراؤں کے درمیان) کے رئیس حاجی امام علی نے بڑے اہتمام سے دعوت کی تیاری کی، مولانا نے روک دیا۔ اور فرمایا کہ ہم صرف ستو کھائیں گے جو آپ کے مزاوعین (ہل چلانے والے) کھاتے ہیں۔ آرہ میں چودھری ہدایت بشیر رئیس اعظم نے پر تکلف دعوت کرنی چاہی اسے بھی روک دیا اور صرف کھچڑی پکوائی۔ اس کے بعد غازی پور میں مولوی محمد فصیح کے یہاں قیام کا ذکر ہے۔ یہاں سے رخصت ہو کر قریہ بقریہ شہر بشہر وعظ و نصیحت اور ہدایت کرتے ہوئے ڈیڑھ برس کے بعد دہلی پہنچے۔ دہلی میں مولانا تقریباً دو مہینے ٹھہرے رہے یہ بہادر شاہ ظفر کا زمانہ تھا۔ بادشاہ نے دعوت نامہ بھیج کر قلعۂ معلی میں بلایا۔ مولانا بہ جہتر آدمیوں کے ساتھ قلعے میں پہنچے۔ بادشاہ نے تخت سے اتر کر لب فرش تک آپ کا استقبال کیا، مصافحہ اور معانقہ کے بعد اپنے ساتھ بٹھایا۔ خاطر تواضع کے بعد آپ نے وعظ شروع کیا اور یہ آیت تلاوت کی۔ اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّلَھْوٌ

وَزِينَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ ... الآیہ، جب آپ عَذَابٌ شَدِيدٌ پر پہنچے تو وزیر اعظم نے آپ کے کان میں کہا کہ بادشاہ سلامت کے سامنے عذاب کے بیان کرنے کا دستور نہیں ہے، جو عالم یہاں وعظ کہتے ہیں وہ صرف جنت ہی کا بیان کرتے ہیں، لیکن مولانا بے تکلف عذاب قبر، ہنگامہ حشر، دوزخ کے عذاب کی شدت شدومد کے ساتھ دل گیر طریقے سے بیان کرتے رہے، جس سے بادشاہ، شہزادگان، زینت محل (بادشاہ کی بیگم)، اور تمام حاضرین مجلس بے حد متاثر ہوئے اور زار زار رونے لگے۔ بعد وعظ ظفر شاہ نے فرمایا کہ میں نے بھی درباب ترک دنیا کچھ اشعار کہے ہیں، آپ نے ان کے سننے کا اشتیاق ظاہر فرمایا۔ وہاں سے رخصت ہو کر جب قیام گاہ پر پہنچے تو پچاس خوان کھانوں کے مطبخ شاہی سے پہنچے۔ اور کنلے (ایک انگریز) کا بیان ہے کہ دہلی میں مولانا کے وعظ بڑے شوق سے سنے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے بادشاہ کے سامنے جہاد کا وعظ کہا جس پر اس نے پسندیدگی کا اظہار کیا۔

دہلی سے روانگی اور ستھانہ میں ورود:

رمضان کا مہینہ قریب آگیا تھا، اور بادشاہ کی خواہش تھی کہ مولانا رمضان قلعۂ معلّٰی میں گزاریں، تاکہ قلعہ کے لوگ ان کے ساتھ نماز تراویح ادا کریں اور وعظ سنیں۔ لیکن ریزیڈنٹ نے مولانا کے متعلق ایسے انداز میں پرسش شروع کر دی تھی کہ رکاوٹ کا اندیشہ لاحق ہو گیا تھا، لہٰذا زیادہ ٹھہرنا قرینِ مصلحت نہ سمجھا گیا اور مولانا معذرت کر کے روانہ ہو گئے۔ جمنا پار پہنچے تو رمضان کا چاند دیکھا، وہاں سے کوچ کر کے اور منزل در منزل طے کرتے ہوئے لدھیانہ کے قریب پہنچے، کھنہ میں کچھ دن مولانا عنایت علی

کا انتظار کرتے رہے جو مولانا ولایت علیؒ سے کم و بیش دس مہینے بعد ۸ ر شعبان ۱۲۶۶ھ (۱۹ ر جون ۱۸۵۰ء) کو وطن سے روانہ ہوئے تھے۔

کھنتہ یا لدھیانہ میں دونوں بھائیوں کی ملاقات ہوئی، یہاں سے دونوں بھائی چند ہمراہیوں کو ساتھ لے کر سرحد کی طرف روانہ ہوئے اور ۸ ر ربیع الآخر ۱۲۶۷ھ (۱۰ ر فروری ۱۸۵۱ء) کو ستھانہ پہنچ گئے۔ ان کے اہل و عیال بھی آٹھ روز کے بعد وہیں پہنچ گئے۔

ستھانہ میں قیام اور وفات:

"تذکرۂ صادقہ" میں مرقوم ہے کہ مولانا اپنے زمانے کے فنونِ حرب سے بھی خوب واقف تھے۔ گھوڑے کی سواری، دریا میں تیرنا، تیر اندازی، بندوق چلانا، پٹا، بانا اور تلوار چلانے میں بڑی مہارت تھی۔" مہر صاحب کی تحقیق کے مطابق سرحد پہنچنے کے بعد صرف بیس مہینے مولانا کو زندگی کی مہلت ملی۔ ابھی ابتدائی انتظامات اور جہاد و قتال کی تیاریوں ہی میں مصروف تھے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس دارِ فانی کو چھوڑ دینے کا پیغام آگیا۔ آپ نے خندہ پیشانی کے ساتھ اس پیغام کو لبیک کہا۔ اور رحمتِ الٰہی کی آغوش میں پہنچ گئے۔ آپ کا انتقال سید صاحب کی شہادت کے بعد — ۲۲ ر محرم ۱۲۶۹ھ (۵ ر نومبر ۱۸۵۲ء) میں ہوا۔ ستھانہ کے قریب مرکز کے قبرستان میں دفن ہوئے "تذکرۂ صادقہ" کے بیان کے مطابق چونسٹھ سال کی عمر پائی۔ ربِ غفور اس مہاجر اور غازی فی سبیل اللہ کی تربت پر اپنی رحمتوں کی بارش فرمائے۔ آمین۔

مولانا عنایت علیؒ

مولانا ولایت علیؒ کی وفات کے بعد بالاتفاق سب مجاہدین نے مولانا عنایت علی کو اپنا امیر تسلیم کرلیا۔ یہ شروع سے آخر تک اپنے بھائی کے ساتھ ان کے تمام کاموں میں دست وبازو بنے رہے۔ سید صاحب سے بیعت کے بعد ایک منٹ کے لیے بھی کبھی آرام نہیں کیا، پہلے سید صاحب کے احکام کے مطابق تبلیغ و جہاد میں مصروف رہے۔ ان کی شہادت کے بعد اپنے بڑے بھائی مولانا ولایت علی کے مشوروں اور ہدایت کے مطابق اعلائے کلمۃ اللہ کی خدمت انجام دیتے رہے۔ ان کی شانِ عزیمت کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ اپنے بڑے بھائی کی معیت میں ہندوستان سے مستقل ہجرت کا ارادہ کیا تو آپ کی والدہ ماجدہ نے ضلع گیا کے ایک گاؤں کا وثیقہ آپ کے حوالے کر دیا تھا۔ آپ نے یہ گاؤں بیس یا بائیس ہزار روپے میں ایک رئیس کے ہاتھ بیچ دیا اور دوسرے مواضعات سے دست برداری کی ایک تحریر لکھ دی۔ اندازہ فرمایئے کہ خوش حالی اور فارغ البالی کے کیسے مہتم بالشان سامان انھیں میسر تھے۔ لیکن ان میں سے کوئی چیز انھیں راہِ حق میں مجاہدانہ اقدام سے نہ روک سکی۔

(سرگزشت مجاہدین ص ۲۸۲)

غزوات :

ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ جہاد فی سبیل اللہ یا اس کی تیاریوں اور اہتمام میں صرف ہوا۔ حادثہ بالاکوٹ کے بعد جب سید ضامن شاہ کاغانی نے مولانا ولایت علی کو سرحد آنے کی دعوت دی تو مولانا نے انھیں (مولانا عنایت علی) کو امیر مجاہدین بنا کر بھیجا، جہاں پہنچ کر ایک مدت تک راجہ گلاب سنگھ ڈوگرہ والیٔ کشمیر سے لڑتے رہے۔ مولانا مسعود عالم ندوی لکھتے ہیں :

" مولانا عنایت علی غازی کی صحیح جگہ میدانِ جنگ تھی اور یہیں ان کے حقیقی جوہر کھلتے تھے، ان کے جہاد کے چار دور ہیں۔ "

۱۔ پہلا دور سید صاحب کی معیت میں، جب تک وہ وہاں سے دوسری مہم پر نہ بھیج دیے گئے۔

۲۔ دوسرا دور مشہد بالاکوٹ کے تقریباً تیرہ برس بعد شروع ہوتا ہے جب وہ سید ضامن شاہ کی درخواست پر اپنے بڑے بھائی مولانا ولایت علی کے حکم سے بالاکوٹ گئے۔ یہ جنگ ساڑھے چار برس جاری رہی۔ یوں تو اپنے جارحانہ حملوں سے آپ نے شروع ہی میں ضامن شاہ کے قلعے، کل علاقے اور مورچے واپس دلا دیے تھے، مگر گلاب سنگھ کے مکروفریب اور مقامی ہمدردوں کی غداری نے مجاہدین کو تتر بتر کر دیا۔ اور وہ سرکارِ انگریزی کی شرطوں کے موافق وطن لوٹنے پر مجبور ہو گئے۔

۳۔ مولانا عنایت علی مزاج کے تیز تھے، ہجرت کے بعد سرحد پہنچ کر ان کی خواہش تھی کہ کچھ ہونا چاہیے۔ جہاں داد خاں والیٔ امب (جو انگریزوں کا حلیف تھا) اس

کی شرارت کے باعث آپ نے پھیڑ چھاڑ کرنا چاہی مگر مولانا ولایت علی نے بعض مصالح کے باعث اس کو منظور نہیں کیا۔ یہ بات گرم مزاج نمازی کو ناگوار معلوم ہوئی اور وہ تین چار سو آدمیوں کے ساتھ بڑے بھائی سے علیحدہ ہو کر منگل تھانہ سید عباس کے پاس جا رہے۔ اور ان کی املاک و فوج کی نہایت خلوص اور ہوشیاری کے ساتھ نگہداشت کی۔

مولانا ولایت علی کے انتقال کے بعد آپ منگل تھانہ سے ستھانہ (مجاہدین کا بڑا مستقر) واپس آئے اور تمام لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت امارت کی۔ اس وقت جنگ کے دو محاذ تھے، ایک ستھانہ اور دوسرا نارنجی اور منگل تھانہ۔ مولانا عنایت علی پہلے نارنجی میں ٹھہرے، پھر منگل تھانہ میں، وہاں مجاہدین کو شکست ہوئی تو آپ نے ستھانہ کا قصد کیا، لیکن راستہ ہی میں پیام اجل آ پہنچا۔ (پہلی اسلامی تحریک)

مولانا مہر لکھتے ہیں:

"جب تک مجاہدین کا مرکز ستھانہ کی سرزمین میں تھا، ان کی یورشیں ضلع ہزارہ پر ہوتی تھیں، منگل تھانہ پہنچنے کے بعد مولانا عنایت علی نے مجاہدین کو جس علاقہ پر یورشوں کے لیے تیار کیا وہ سمہ کا علاقہ تھا، یعنی ضلع پشاور اور ضلع مردان کا میدانی علاقہ۔"

اوکنلے (ایک انگریز) نے لکھا ہے کہ مولانا عنایت علی نے:

"اپنے ہمراہیوں کے دل میں انگریز کافروں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ مجاہدین روزانہ قواعد کرتے، بلکہ بعض اوقات دن میں دو مرتبہ، قواعد میں فضائل جہاد کے متعلق نظمیں پڑھی جاتیں، جمعہ کی نماز کے بعد بہشت کی شادمانیوں کے بارے میں

وعظ کیے جاتے اور انہیں تلقین کی جاتی کہ صبر و استقامت سے اس وقت کا انتظار کرو جب برطانوی ہند کی تسخیر کی موعودہ ساعت آپہنچے گی۔"

(سرگزشت مجاہدین ص ۲۸۹)

۱۸۵۲ء تا ۱۸۵۷ء:

پچھلے صفحات میں اس کا ذکر آچکا ہے کہ مولانا عنایت علی کی جہادی سرگرمیوں کا چوتھا دور مولانا ولایت علی کے انتقال کے بعد شروع ہوتا ہے۔ یہ بھی پہلے گذر چکا ہے کہ وہ انگریزوں کے حلیف والیٔ امب پر حملہ کرنا چاہتے تھے، مگر مولانا ولایت علی نے اجازت نہیں دی۔ جب ان کی امارت کا زمانہ آیا تو ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ جہانداد خاں والیٔ امب سے ٹکر ناگزیر ہوگئی۔ چنانچہ ۱۸۵۲ء اور ۱۸۵۷ء کے درمیان مجاہدین اور سرکارِ برطانیہ کے درمیان جو کشمکش اور چھیڑ چھاڑ جاری رہی، اس کا نہایت مختصر بیان درج ذیل ہے۔

پٹنہ کے کلکٹر (۱۸۶۵ء) ریون شا نے لکھا ہے کہ:

"برطانوی حکومت اب زیادہ دیر تک حقائق سے آنکھ نہیں بند کر سکتی تھی۔ ۱۸۵۲ء کے موسم بہار ہی میں "ایک سرحدی جنگ" کی تجویز زیر غور آچکی تھی۔ اسی سال ان لوگوں نے ہمارے حلیف، ریاست امب کے سردار پر حملہ کیا، جس سے برطانوی حکومت ایک فوج بھیجنے پر مجبور ہوئی؟

" ۱۸۵۲ء میں ساری فوج کے متعدد افراد" باغیوں سے خط و کتابت کے الزام میں ماخوذ اور سزایاب ہوئے۔"

"۱۸۵۲ء میں ان کا منصوبہ مکمل ہو چکا تھا، ستھانہ کیمپ میں برطانوی علاقے سے آدمی اور روپے کی آمد برابر جاری تھی اور ہماری فوج سے ان کی باغیانہ خط و کتابت پکڑی گئی۔ ان مجاہدین نے بڑی چالاکی سے یہ چاہا تھا کہ ہماری چوتھی دیسی پیادہ متعینہ راولپنڈی کی وفاداری داغدار ہو جائے۔"

"میں یہاں ان زیادتیوں، توہین اور قتل کے واقعات کی تفصیل نہیں کرنا چاہتا جو ۱۸۵۰ء والی جنگ سرحد کا باعث ہوئیں۔ اس پوری مدت (۱۸۵۰ء - ۱۸۵۷ء) میں مجاہدین نے سرحدی قبائل کو برطانوی حکومت کے خلاف برسرپیکار رکھنے کی کوشش کی۔"

ہنٹر نے لکھا ہے:

"۱۸۵۰ء اور ۱۸۵۷ء کے درمیان ہمیں مختلف وقتوں میں سولہ مہم جاری کرنا پڑی، جن میں ۳۳ ہزار تربیت یافتہ فوج سے کام لیا گیا۔ ... اس دوران میں ستھانہ کی نوآبادی گو سرحد کے طول وعرض میں جہاد کی روح بھڑکاتی رہی، پھر بھی ہماری فوج سے راست ٹکر نہ لے کر انھوں نے عقلمندی کا ثبوت دیا۔"

(ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک، ص ۷۰، تا ۷۱)

مولانا عنایت علی کے غزوات کے متعلق یہ چند اشارات ہیں، تفصیلات "سرگزشت مجاہدین" میں ملاحظہ کیجیے۔

... ...

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ اور مالی مشکلات:

مولانا اور مجاہدین کے لیے زیادہ تر رقمیں ہندوستان سے بھیجی جاتی تھیں، ان کے ہم خیال وہم مشرب اصحاب بہار اور بنگال میں بکثرت موجود تھے۔ جو خفیہ طور پر چندے کر کے سرحد بھیجتے تھے۔ یہ سلسلہ برابر جاری رہا، اور سارا انتظام حسن و خوبی کے ساتھ چل رہا تھا کہ اسی دوران میں ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ سے اس ہنگامے کا آغاز ہوا جسے انگریزوں نے "غدر" قرار دیا، اور اہل ملک اسے "آزادی کی جنگ" قرار دیتے ہیں۔ اس ہنگامے نے جا بجا انگریزوں کے لیے سخت نازک حالات پیدا کر دیے تھے۔ مجاہدین کے لیے اقدامات کا یہ بڑا ہی اچھا موقع تھا، لیکن اتفاق کی بات ہے کہ حالات بظاہر جتنے سازگار تھے، بعض ناگہانی حوادث و وقائع کے باعث اتنے ہی ناسازگار ہو گئے۔

یہ ہنگامہ شروع ہوتے ہی انگریزوں نے دریائے سندھ کے تمام گھاٹوں اور کوہستانی علاقے کے راستوں کی نگرانی کا نہایت سخت انتظام کر لیا تھا، جس کے بعد کسی قاصد کے لیے ہندوستان سے کوئی رقم سرحد پہنچانا ممکن نہ رہا تھا۔ صادق پور پٹنہ کے مرکز پر پہرے بٹھا دیے گئے تھے۔ نیز مولانا احمد اللہ، شاہ محمد حسین اور مولوی واعظ الحق کو نظر بند کر دیا گیا تھا۔ یہی حضرات رقمیں جمع کرنے اور بھیجنے کے ممتاز ذمہ دار تھے۔

(سرگزشت مجاہدین)

مواصلات کے سلسلے کے منقطع ہو جانے کی وجہ سے مجاہدین سرحد کے لیے بڑی مشکلات پیدا ہو گئیں۔ فاقے پر فاقے ہونے لگے۔ مولانا عبدالرحیم صادق پوری بھی مجاہدین کے لیے روپیہ اور سامان فراہم کرنے والوں کے سرگرم شریک اور معاون تھے، ان کا

بیان ہے کہ:

"۱۸۵۷ء کے غدر کی وجہ سے راہ پرُ خطر تھی، شہر سے باہر نکلنا دشوار تھا، املاک ہلاکت میں تھے، جانوں کو امن نہ تھا، پھر کس کو ہوش تھا، اور کیونکر ممکن تھا کہ سرحد کے پار فاقہ کشوں کے لیے کوئی سامان کیا جاسکتا؟ مسلسل فاقہ کشی نے حالت تباہ کردی، درختوں کی کونپلوں اور پتوں پر اصحابِ صفہ کی سنت ادا ہونے لگی۔ چند ماہ مسلسل غلہ پر نظر تک نہ پڑی، اجابتیں خون آلود ہونے لگیں، آپ کے (یعنی مولانا عنایت علی کے) پاس جو کچھ نقود تھے آپ مہاجرین و انصار پر صرف کر چکے، اور وہ تھا ہی کیا؟ اونٹ کے منہ میں زیرہ۔ اب اُدھر ساتھیوں کی بدگمانیاں اور طعنے شروع ہوگئے۔ زندگی تلخ تھی۔ یہ وہ وقت تھا کہ اگلی امم مضطر ہوکر متیٰ نصر اللہ پکار اٹھی تھیں۔" (تذکرۂ صادقہ ص ۱۳۸)

مہر صاحب لکھتے ہیں:

جنگ نارنجی کے بعد (یہ جنگ جولائی اور اگست ۱۸۵۷ء میں ہوئی تھی۔) مولانا عنایت علی کی مالی حالت بے حد خراب ہوگئی۔ کچھ مدت تک وہ ساہوکاروں سے قرض لے کر گزارہ کرتے رہے، اس اثنا میں لشکریوں کو تنخواہ بھی نہ دی جاسکی۔ اب ایک طرف بعض افراد نے مجبور ہوکر تنخواہ کا مطالبہ کیا: دوسری طرف ساہوکاروں نے اپنی رقموں کے لیے تقاضا شروع کردیا۔ مولانا کے لیے یہ بڑا ہی نازک وقت تھا، انھوں نے اپنی تمام قابلِ فروخت چیزیں، بے تکلف بیچ ڈالیں، اور سب سے پہلے ساہوکاروں کا

قرضہ اتارا۔ جو رقم باقی رہ گئی اسے ادا کرنے کے لیے سید نجیب بنگال نے ضمانت دیدی۔ مجاہدین میں سے کچھ لوگ خورد و نوش کی مزدوریوں سے مجبور ہو کر ادھر اُدھر بکھر گئے ..... مولانا کے پاس ایک قیمتی مشکی گھوڑا تھا، انھوں نے مقرب خاں رئیس پنجتار کو پیغام بھیجا کہ گھوڑا خرید لے تاکہ اس کی قیمت سے واجبات ادا کیے جا سکیں۔ اس نے کچھ توجہ نہ کی، ملا صاحب کو ٹھاکو یہ کیفیت معلوم ہوئی تو انھیں بڑا افسوس ہوا اور خود گھوڑا خرید لینا چاہا۔ معلوم نہ ہو سکا کہ ملا صاحب کی اس خواہش کا نتیجہ کیا نکلا۔؟

علالت اور وفات :

مولانا مسعود عالم ندوی لکھتے ہیں :

"یہی لیل و نہار تھے کہ سرکار انگریزی نے ۱۸۵۸ء میں پشاور سے جنرل کاٹن کی سرکردگی میں چھ ہزار فوج کے ساتھ مجاہدین پر حملہ کر دیا۔ "مرے کو ملے شاہ مدار" شاید ایسے ہی موقع پر کہا گیا ہو۔ مجاہدین کی اچھی خاصی تعداد مردانہ وار دادِ شجاعت دے کر شہید ہوئی، کچھ پہاڑوں میں چھپ گئے، مولانا عنایت علی نے ستھانہ کا قصد کیا مگر راستہ ہی میں چنگی کے مقام پر داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔"

(ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک ص ۸۲)

مہر صاحب نے لکھا ہے کہ :

"مولانا پر بخار کا ایسا شدید حملہ ہوا جس سے بے ہوشی طاری رہنے لگی

اس وقت وہ غالباً پرگنہ منصور جدون کے مقام لونرو بانڈہ میں تھے۔ وہاں سے ان کی چارپائی اُٹھا کر چینئی کی جانب روانہ ہوئے۔ کوہِ چینئی کی چڑھائی پر بخار بہت تیز ہو گیا اور مولانا نے کاغذ اور قلم دوات طلب کی۔ شاید کچھ لکھنے کا ارادہ تھا، عین اسی حالت میں سکراتِ موت کا عالم طاری ہو گیا اور کمزوری اتنی بڑھ گئی کہ لکھنے کی سکت نہ رہی، ان کے لڑکے نے پوچھا، آپ کے بعد امیر کون ہو؟ کچھ نہ فرمایا اور جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی .... صحیح تاریخِ وفات کسی نے نہیں بتائی، لیکن اتنا معلوم ہے کہ ۶ شعبان ۱۲۷۴ھ (۲۲ مارچ ۱۸۵۸ء) تک وہ زندہ تھے۔ غالباً اس سے ایک دو روز بعد انتقال کیا۔

مولانا کے متعلق مہر صاحب کے تاثرات:

مولانا غلام رسول مہر نے مولانا عنایت علی کے حالات لکھنے کے بعد آخر میں ان کی شخصیت کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"مولانا کے جوشِ حمیت اور گرمیٔ طبیعت کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لیکن انھوں نے اللہ کی راہ میں عزیمت واستقامت کا جو عظیم القدر نمونہ پیش کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ جس وقت سے سید صاحب کے ساتھ ان کا تعلق پیدا ہوا، اپنی پوری زندگی دینی کاموں کے لیے وقف کر دی، بنگال میں جس اعلیٰ پیمانے پر انھوں نے دین کی تبلیغ فرمائی اس کی کیفیت تفصیلاً پہلے پیش کی جا چکی ہے۔ پھر وہ ساداتِ کاغان اور اہلِ ہزارہ کو لے کر

جس مردانگی سے سکھوں کے خلاف جہاد آرا ہوئے وہ بھی اعادہ کی محتاج نہیں۔ آخری دور میں مولانا نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ خدا کی راہ میں جہاد پھولوں کی سیج نہیں۔ وہ اپنا سب کچھ خدا کے لیے قربان کر چکے تھے، لیکن دیکھیے! آخری دور میں انھیں کس درجہ روح فرسا آلام و مصائب سے سابقہ پڑا۔ پیسہ پلے نہ تھا، جو سامان پاس تھا، بیچ ڈالا۔ اکلوتا فرزند صاحبِ فراش۔ اس کی بچی بیمار، اپنی حالت حد درجہ نازک، ہر سمت دشمنوں کا ہجوم، امتحانوں اور آزمائشوں کے اس سیل میں قدم استوار رکھنا صرف انھی اربابِ ہمت کا کام ہے، جن کے سامنے فرض بطور فرض موجود ہو۔ دنیوی راحتوں اور آسائشوں سے انھیں کسی نوع کا سروکار نہ ہو اور صرف رضائے باری تعالیٰ پر نظر ہو۔ یہ منزل بڑی کٹھن ہے۔ لیکن مولانا عنایت علی نے جس شانِ فداکاری سے اسے طے کیا اس کی مثالیں ہر جگہ نہیں مل سکتیں۔ ان کے سامنے صحابہ کرام کا اسوۂ حسنہ تھا جنھوں نے دینِ حق کی اشاعت میں اپنی جانیں بے دریغ قربان کر دیں، یہی اسوہ قوموں کے لیے دنیا و آخرت میں سرخروئی کا واحد ذریعہ ہے۔" (سرگزشتِ مجاہدین ص ۳۰۳)

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ اور میاں صاحب:

سید احمد اور مولانا اسمٰعیل (الشہیدین) کی تحریکِ جہاد کا اجمالی اور مختصر تاریخی سلسلۂ بیان پچھلے اوراق میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے تک پہنچا ہے، ابھی یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا ہے، اس سلسلے میں علمائے اہلحدیث کی بے نظیر جانی اور مالی قربانیوں

کے حیرت انگیز اور دردناک واقعات ان شاء اللہ آپ کے سامنے آئیں گے۔
لیکن یہاں پہ پہنچ کر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے اس سلسلۂ بیان کو ملتوی کر دیا جائے، اور اس کے بجائے اسی موقع پر ۱۸۵۷ء کے ان بعض حوادث اور واقعات کا جائزہ لے لیا جائے، جن کی بنا پر حضرت میاں صاحب سید نذیر حسین دہلوی علیہ الرحمہ کی شخصیت کو (دانستہ یا نادانستہ طور پر) مطعون اور بدنام کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اور ان کے بعد پوری جماعت اہلحدیث کو (ماضی کی ہو یا حال کی بلا کسی تخصیص اور استثنار کے) ہدفِ ملامت بنایا جاتا ہے۔

پہلا طعنہ اور اس کا جواب:

پہلی بات جس کا طعنہ اہلحدیثوں کو دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ:

"سرخیل جماعت سید الطائفہ مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی نے بھی سیاست سے کنارہ کشی کر لی۔ انگریزوں کے خلاف فتویٰ جہاد پر دستخط نہیں کیے، دوسرے اکابر علمار عصر کے دستخط تھے، لیکن مولانا مرحوم کے دستخط اس پر نہ تھے۔"

اولاً۔ تو تاریخ کی روشنی میں یہ دعویٰ ہی قطعاً غلط ہے کہ تمام اکابر علمار عصر نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دے دیا تھا، صرف میاں صاحب اس کے مخالف تھے، مندرجہ ذیل شواہد پر غور کیجیے۔

- امیر شاہ خاں صاحب ایک شخص گزرے ہیں جو دیوبندی حلقے میں بڑے معتبر راوی مانے گئے ہیں، ان کو علمار و مشائخ اور بزرگوں کی حکایات بکثرت یاد تھیں، ان کی

بیان کردہ حکایات کو دیوبندی حضرات نے کتابی صورت میں مرتب کر کے " ارواحِ ثلاثہ "
کے نام سے شائع کر دیا ہے انھیں امیر خاں کا بیان ہے کہ " غدر میں بہت علماء مخالف
تھے اور کہتے تھے کہ یہ جہاد نہیں ہے ۔ انھیں میں میر محبوب علی صاحب (دہلوی) بھی تھے
اور آپ وعظ و نصیحت کے ذریعہ سے لوگوں کو غدر سے روکتے تھے ..... "

(ارواحِ ثلاثہ ص ۲۴۴)

یہ میر محبوب علی دہلوی کون ہیں ؟ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کے شاگرد ، بلکہ
" شاندار ماضی " کے مصنف مولانا سید محمد میاں نے ان کو ان مخصوص علماء میں شمار کیا ہے
" جو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی تربیت گاہ سے تربیت پا کر ہندوستان کے آفتاب
و ماہتاب بنے ۔ "

(ملاحظہ ہو علماء ہند کا شاندار ماضی ج ۲ ص ۹۴ ، ۵۰)

ایک یہی نہیں ، بلکہ بقول امیر خاں صاحب " بہت " سے ایسے علماء تھے
جو اس ہنگامہ کو اسلامی جہاد ہونے کا فتویٰ نہیں دیتے تھے ۔

مولانا حسین احمد صاحب مدنی سے زیادہ معتبر راوی کون ہوگا ۔ دیوبندی ہی حلقے
کے ایک ممتاز عالم مولانا شیخ محمد صاحب تھانوی کے متعلق ان کا بیان ہے کہ :

" بد قسمتی سے مولانا کی رائے یہ ہی تھی کہ انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا ہم مسلمانوں
پر فرض تو درکنار موجودہ احوال میں جائز ہی نہیں ۔ "

(نقشِ حیات ج ۲ ص ۴۲)

" تذکرہ مشائخ دیوبند " کے مصنف نے مولانا شیخ محمد تھانوی کے حالات میں
لکھا ہے کہ :

"بڑے پایہ کے لوگوں میں سے ہیں، علوم ظاہر و باطن میں کامل تھے۔
اپنے زمانہ میں محدث تھانوی کے نام سے مشہور تھے، بڑے ذی علم لوگوں
میں شمار ہوتا ہے۔ علوم ظاہرہ میں خاندانِ ولی اللٰہی کے فیض یافتہ ہیں۔
تکمیل علم دہلی میں رہ کر کی اور حدیث اور تقریباً تمام فنون شاہ محمد اسحٰق صاحب
دہلوی رح سے حاصل کیے، حضرت حاجی (امداد اللہ صاحب) سے نسبی تعلقات بھی تھے۔
. . . علم حدیث میں کافی مہارت رکھتے تھے . . . . .

(تذکرہ مشائخ دیوبند ص ۴۸)

مولانا عبیداللہ سندھی فرماتے ہیں:

"تھانہ بھون کے یہ بزرگ مولانا شیخ محمد تھانوی محدث کے نام
سے مشہور ہیں، آپ کی رائے ۱۸۵۷ء کی تحریک حریت کے خلاف تھی۔
(آگے لکھتے ہیں:) شیخ محمد تھانوی وہ بزرگ ہیں جن کے مسلک پر مولانا
اشرف علی صاحب کاربند ہیں اور شیخ الہند کی جماعت کی سیاست کو غلط
مانتے ہیں۔ مولانا اشرف علی صاحب کے سوانحِ حیات جو شائع ہو چکے
ہیں، ان میں تصریح ہے کہ آپ مولانا شیخ محمد صاحب کے مسلک
کے پیرو ہیں، مولانا شیخ محمد اور امیر امداد اللہ ایک ہی مرشد کے خلیفہ ہیں،
اور اسی مسئلہ جہاد پر آپس میں مخالف ہو گئے اور جماعت دو حصوں میں
تقسیم ہو گئی . . . . . . "

(شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص ۲۶۴، ۲۶۵)

غور فرمائیے! یہ شاہ عبدالعزیز رح اور شاہ محمد اسحاق رح کے تربیت یافتہ اور فیض یافتہ

حضرات ہیں۔ جنھوں نے انگریز کے خلاف جہاد کے فتوے پر دستخط نہیں کیے۔ اگر دوسرے "بہت" سے علمائے عصر کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو کوئی ہمیں انصاف سے بتلائے کہ کیا حنفی مکتبِ فکر کے ان دونوں اکابر کا توافق میاں صاحب کے سر سے تفرد کا الزام دور کرنے کے لیے کافی نہیں ہے؟ پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ اس باب میں صرف میاں صاحب کا نام لیا جاتا ہے، اور دوسرے حضرات کے ناموں کا اظہار کرنے سے گریز کیا جاتا ہے؟[۱]

---

[۱] حقیقت یہ ہے کہ حضرت میاں صاحب سید نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ پر یہ الزام قطعی غلط ہے کہ آپ نے ۱۸۵۷ء کے فتوائے جہاد پر دستخط نہیں کیے بلکہ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ اس فتوی پر سب سے پہلا دستخط مع مہر آپ ہی کا ہے۔ (تفصیل آگے آرہی ہے) البتہ جو لوگ بڑے شد ومد سے میاں صاحب پر یہ الزام لگاتے ہیں ان کی جماعت اور اکابر کی حالت دیدنی ہے۔ یعنی دیوبندی مکتبِ فکر کے اساطین واکابر نے صرف یہی نہیں کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے دوران فتوئ جہاد پر دستخط نہیں کیا بلکہ انگریزوں سے کامل وفاداری برتی اور ان کے خلاف جنگ سے روکنے کی کوشش کی۔ بلکہ بعض مسلمہ اکابر نے انگریز کی حمایت میں تلوار بھی اٹھائی۔ ان حقائق کی توضیح کے لیے چند اشارات درکار ہیں۔

مولانا عبید اللہ سندھی کے حسب بیان، ۱۲۵۷ھ/۱۸۴۱ء میں جب شاہ اسحاق مکہ ہجرت کر گئے تو مولانا مملوک علی نانوتوی کی سرکردگی میں علمائے احناف کا ایک بورڈ قائم ہوا۔ یہی بورڈ تحریک دیوبند کا ہراول دستہ تھا۔ دس سال بعد، ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء میں اس تحریک کے امیر اول مولانا مملوک علی نے انتقال کیا، اور حاجی امداد اللہ امیر ہوئے

انھی کے زمانہ میں ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ پیش آیا۔

دیوبندی تحریک کے امیر اول مولانا مملوک علی کے متعلق سوانح نگاروں کا اتفاق ہے کہ وہ انگریزوں کے پکے وفادار تھے۔ موصوف دہلی کالج میں — جہاں سے انگریز نواز ہندوستانی تیار کیے جاتے تھے۔ تاحیات مدرس رہے۔ بلکہ آپ کے حسن کارکردگی سے متاثر ہوکر کالج کے وزیر مسٹر طامس کی سفارش سے ۸ نومبر ۱۸۴۱ء کو آپ صدر مدرس قرار پائے، کالج کے تمام انگریز پرنسپل مولانا پر بہت اعتماد کرتے تھے، چنانچہ ہر سالانہ رپورٹ میں آپ کی تعریف و توصیف کی گئی۔ ۱۷ دسمبر ۱۸۵۴ء کو گورنر جنرل نے مولانا کو انعام سے بھی نوازا اور خلعت سرپارچہ مرحمت کیا۔ دہلی کالج کے نصابوں کا کام آپ کے زیر نگرانی ہوتا۔ ۱۸۴۱ء میں آپ نے حج کے لیے ایک سال کی رخصت لی تو انگریز حکام نے چھ ماہ کی تنخواہ آپ کو پیشگی عنایت فرمادی۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے کتاب "مولانا احسن نانوتوی" مصنفہ پروفیسر محمد ایوب قادری۔)

یہ تھے دیوبندی تحریک کے امیر اول مولانا مملوک علی نانوتوی۔ آپ نے اپنی سرکاری ملازمت کے فوائد کو اپنی ذات تک محدود نہ رکھا، بلکہ اپنے اعزہ و اقارب کو بھی خوب خوب فائدہ پہنچایا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں۔

"نانوتہ کے لیے تعلیمی راہ کا دروازہ مولانا مملوک العلی رحمۃ اللہ علیہ کی وجہ سے کھل چکا تھا۔ وہ دہلی میں مقیم تھے اور دہلی کی سب سے بڑی درس گاہ دہلی کالج کے استاد تھے۔ نہ صرف نانوتہ بلکہ عثمانی شیوخ کی برادری اطراف و جوانب کے جن قصبات میں پھیلی ہوئی تھی وہاں تک کے بچے مولانا مملوک العلی کے ان خاص حالات سے کافی استفادہ کر رہے

تھے۔ (سوانح قاسمی جلد اول ص ۲۳)

پروفیسر ایوب قادری کا بیان ہے کہ مولانا محمد احسن نانوتوی اور ان کے دونوں بھائی مولانا محمد مظہر اور مولانا محمد منیر حضرت شیخ الہند کے والد مولانا ذوالفقار علی، مولانا شبیر احمد عثمانی کے والد مولانا فضل الرحمٰن، مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی نے دہلی کالج میں تعلیم حاصل کی۔ یہ تمام حضرات بقول مولانا مناظر احسن گیلانی مولانا مملوک علی کے تعلق کی وجہ سے دہلی پہنچے۔ اور تعلیمی سہولتوں (وظائف وغیرہ) سے مستفید ہوئے۔ پھر ان میں سے مولانا قاسم نانوتوی کو چھوڑ کر باقی تمام حضرات نے سرکاری ملازمت بھی اختیار کی۔ مولانا محمد احسن، مولوی مظہر اور مولوی منیر تو بنارس کالج، آگرہ کالج اور بریلی کالج میں ملازم ہوئے۔ اور مولوی ذوالفقار علی، مولوی فضل الرحمٰن اور مولوی محمد یعقوب نانوتوی محکمہ تعلیم میں ڈپٹی انسپکٹر بھی رہے۔ (دیکھیے مولانا احسن نانوتوی ص ۲۶)

مولانا مملوک علی اپنے شاگردوں کو کس ڈھنگ کی تربیت دیتے تھے، اور ان میں انگریزوں سے وفاداری کی کیسی خو بو پیدا کرتے تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب جمال الدین افغانی نے مفتی محمد عبدہ اور سید رشید رضا کے ساتھ مل کر عالم اسلام کو متحد اور آزاد کرنے کی تحریک کو مصر میں خاصی قوت بخشی تو انگریزوں نے ان ہی مولانا مملوک علی کے ایک شاگرد رشید مولوی سمیع اللہ کو سیاسی مشن پر مصر بھیجا۔ اور مولوی سمیع اللہ نے انگریزوں کے تفویض کیے ہوئے اس فرض کو اس چابکدستی سے انجام دیا کہ جمال الدین افغانی کو مصر سے نکال دیا گیا، اور اس کارنامے پر مولوی سمیع اللہ کو انگریز سے سی، ایم، جی کا خطاب ملا۔ (جناب ایوب قادری نے بھی اس واقعہ دبیان

. . . .

کیا ہے ملاحظہ ہو، ص ۱۸۳)

ظاہر ہے کہ اکابر دیو بند جو ایسے استاد کے تربیت یافتہ تھے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ان کا رد عمل کیا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ حالات و واقعات شہادت دیتے ہیں کہ ان بزرگانِ دیو بند نے اپنے استاد کے مسلک پر عمل کرتے ہوئے من حیث الجماعت انگریز کا ساتھ دیا۔ چند کردار ملاحظہ ہوں۔

(۱) مولانا محمد احسن نانوتوی: یہ مولانا مملوک علی کے بھتیجے، احیاء العلوم کے مترجم، مظاہر علوم سہارنپور کے پہلے صدر مدرس کے برادر، اور دیو بندی مکتب فکر کے مشہور بزرگ ہیں۔ موصوف ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے وقت انگریز کے ملازم تھے۔ ان کے متعلق ایوب قادری صاحب لکھتے ہیں: "۲۲ مئی ۱۸۵۷ء کو نماز جمعہ کے بعد مولانا محمد احسن نے بریلی کی مسجد نو محلہ میں مسلمانوں کے سامنے ایک تقریر کی اور اس میں بتایا کہ حکومت سے بغاوت کرنا خلاف قانون ہے۔ (کتاب مولانا احسن نانوتوی ص ۵۰)۔ اس تقریر سے لوگوں میں آپ کے خلاف شدید نفرت پیدا ہو گئی، جان خطرہ میں پڑ گئی۔ کچھ عرصہ کے لیے آپ نے بریلی چھوڑ دیا، امن و امان ہوا تو اپنی ڈیوٹی پر واپس آگئے۔

(۲، ۳) مولانا مظہر اور مولانا منیر: مولانا محمد احسن نانوتوی کے بھائی اور انہی کے مسلک پر کاربند تھے۔ انگریز کی وفاداری ہی کی برکت سے ۱۸۵۷ء کے بعد بھی اپنے سرکاری منصب پر برقرار رہے۔

(۴) مولانا محمد یعقوب نانوتوی: مولانا مملوک علی کے صاحبزادے اور دیو بند کے پہلے صدر مدرس۔ آپ ۱۸۵۷ء میں سہارنپور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدہ پر فائز تھے۔

. . . .

موصوف ۱۸۵۷ء کی جنگ کو غدر اور اس میں حصہ لینے والوں کو مفسدین سے تعبیر کرتے تھے۔ (سوانح قاسمی ص ۱۶) ہنگامہ کے وقت آپ گھر ہی تھے، ہنگامہ فرو ہوا تو کام پر تشریف لے گئے۔ برطانوی حکومت کے افسران بالا آپ سے بہت خوش تھے اور آپ کی بڑی قدر کرتے تھے۔ مفتی عزیز الرحمان لکھتے ہیں: "ایام غدر کی چھ ماہ کی تنخواہ آپ کو پیش کی گئی تو آپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ جب میں نے کام نہیں کیا تو کیوں تنخواہ لوں۔ (تذکرہ مشائخ دیوبند ص ۱۴۷)

(۵) مولانا فضل الرحمان جو مولانا شبیر احمد عثمانی کے والد اور دار العلوم کے بانیوں میں سے ہیں، ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے وقت بریلی میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے۔ مولانا محمد احسن نانوتوی نے بریلی چھوڑتے ہوئے اپنے بعض ضروری کام انہی کے سپرد کیے تھے۔ (کتاب مولانا احسن نانوتوی ص ۴۰) انگریزوں کی وفاداری کے صلے میں ہنگامہ کے بعد سرکاری منصب پر برقرار رہے

(۶) مولانا ذوالفقار علی: جو شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے والد تھے۔ اور مولانا فضل الرحمان مذکور سے مل کر دار العلوم دیوبند کی تحریک شروع کی تھی یہ بھی ۱۸۵۷ء میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدہ پر فائز تھے۔ انگریزوں کو آپ پر اس قدر اعتماد تھا کہ ہنگامے کے بعد نہ صرف یہ کہ آپ کو اپنے عہدے پر برقرار رکھا گیا بلکہ ریٹائر ہونے کے بعد دیوبند ہی میں آنریری مجسٹریٹ بنا دیا گیا۔ (کتاب مذکور ص ۴۵)

(۷، ۸) میر محبوب علی اور شیخ محمد تھانوی کا ذکر اصل کتاب میں آچکا ہے اب ذرا اس دائرے کو مزید وسعت دیجیے۔

(۹) مولانا کرامت علی جونپوری: ان کے متعلق پروفیسر ایوب قادری نے لکھا ہے کہ آپ نے انگریزی حکومت کی موافقت کرتے ہوئے ممانعت جہاد کا فتویٰ دیا تھا

(تذکرہ علماء ہند ص ۳۹۶)۔ مولانا مسعود عالم ندوی نے اس فتویٰ کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ وہ ان کی نظر سے خوبصورت اور نظر فریب پمفلٹ کی شکل میں گزر چکا ہے، اس میں مولانا کرامت علی کے صاحبزادے مشہور ادیب مولوی عبدالاول صاحب جونپوری اور حافظ احمد صاحب کی بھی تصدیق ہے اور اسے مولانا کے پوتوں نے تحریر سنہ ۱۹۱۴ء میں درج کرایا تھا۔ (دیکھیے پہلی اسلامی تحریک ص ۷۴ حاشیہ)

اس مقدس فتویٰ میں مولانا نے انگریزی ہندوستان کو دارالسلام قرار دے کر لکھا ہے کہ "۔۔۔۔ دارالسلام میں جہاد کی اجازت کسی حالت میں نہیں۔۔۔۔ اب اگر کوئی گم کردہ راہ مجنون اپنی الٹی قسمت کی وجہ سے ملک ہندوستان کے انگریز حاکموں کے خلاف جنگ شروع کر دے تو اس قسم کی جنگ کو بغاوت تصور کیا جائے گا۔ اور بغاوت اسلامی فقہ میں سخت منع ہے، اس لیے یہ جنگ بھی ناجائز ہوگی۔ اگر کوئی شخص کسی حالت میں بھی ایسی جنگ کرے گا تو مسلمان اپنے حاکموں کا ساتھ دینے پر مجبور ہوں گے۔ اور ان کے ساتھ مل کر باغیوں سے لڑیں گے۔" (ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۳۱۶)

اس کتاب میں (ص ۳۱۵ پر) جہاد کے خلاف مزید حنفی علماء کے فتاوے درج ہیں ان کے نام یہ ہیں (۱۰) مولانا عبدالحی لکھنوی (۱۱) مولانا محمد علی لکھنوی (۱۲) مولوی فیض اللہ لکھنوی (۱۳) مولانا رحمت اللہ لکھنوی (۱۴) مولانا قطب الدین لکھنوی، (۱۵) مفتی سعد اللہ لکھنوی (۱۶) مولانا لطیف اللہ رامپوری (۱۷) مولانا غلام علی رامپوری، اکابر دیوبند کے یہ چند نام مشتے نمونہ از خروارے ہیں۔ جن کی انگریز سے وفاداری مسلم ہے۔ ہاں بعض جوشیلے نوجوان اور بعض درویش صفت حضرات کے متعلق

علمائے دیوبند کا خیال ہے کہ انھوں نے براہ راست اس جنگ میں شمولیت کی اور جوانمردی اور بہادری کے بڑے بڑے جوہر دکھلائے۔ ان حضرات میں مولانا قاسم نانوتوی مولانا رشید احمد گنگوہی، جناب حاجی امداد اللہ صاحب اور حافظ ضامن صاحب کا خاص طور پر نام لیا جاتا ہے۔ مگر حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے اس واقعہ کی جو تفصیل بیان کی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے دوران تھانہ بھون کے رئیس قاضی عنایت علی خاں کا چھوٹا بھائی عبدالرحیم خاں ایک دشمن بنیا کی جھوٹی مخبری کے نتیجے میں انگریز کے ہاتھوں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ عنایت علی نے جوش انتقام میں ہنگامہ برپا کر دیا۔ اور اس علاقہ پر کچھ دنوں تک باغیوں کا دار دورہ رہا۔ حاجی امداد اللہ نے لوگوں کی درخواست پر انگریز کا خلا پُر کرنے کے لیے قصبہ کا نظم سنبھالا، اور انھی ایام میں ایک بار حاجی امداد اللہ مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی اور حافظ ضامن صاحب کا ٹکراؤ انگریز سرکار کے مخالف باغیوں سے ہو گیا، ان بزرگوں نے جم کر لڑائی کی، اسی لڑائی میں جو انگریز کی حمایت میں اس کے مخالف باغیوں سے یہ زبردست لڑ رہے تھے حافظ ضامن شہید ہوئے، اور مولانا قاسم نانوتوی کے ساتھ اس کرامت کا ظہور ہوا کہ گولی ان کے دماغ کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ تمام کپڑے خون سے تر ہو گئے، لیکن زخم کا نام و نشان تک نہ تھا۔ (دیکھیے تذکرۃ الرشید ج اول ص ۷۳-۷۵)۔

(تفصیل معرکۂ شاملی کے ذکر میں آ رہی ہے۔)

بس پوری تاریخ میں یہی ایک واقعہ ہے جس کے علمائے دیوبند نے اپنے زبردست پروپیگنڈے اور تاریخ سازی کے زور سے انگریزوں کے خلاف جہاد کا رنگ دے دیا ہے

حالانکہ یہ خلوص کی حد تک انگریز سے تعاون تھا۔ چنانچہ بعد میں ہنگامہ ختم ہونے کے بعد قاضی محبوب علی خاں کی جھوٹی مخبری پر جب مولانا رشید احمد گنگوہی کو گرفتار کیا گیا تو اپنے متعلق ان کے تاثرات یہ تھے کہ "جب میں حقیقت میں اپنی سرکار کا فرمانبردار رہا ہوں تو جھوٹے الزام سے میرا بال بیکا نہ ہوگا۔ اور اگر مارا بھی گیا تو سرکار مالک ہے۔ اسے اختیار ہے جو چاہے کرے" (تذکرۃ الرشید ج ۱ ص ۸۰) اور پھر حاکم سے جو گفتگو ہوئی وہ یہ تھی۔ "حاکم نے پوچھا: رشید احمد! تم نے مفسدوں کا ساتھ دیا اور فساد کیا؟ آپ نے فرمایا ہمارا کام فساد نہیں اور نہ ہم مفسدوں کے ساتھی ہیں۔" حاکم نے کہا: تم نے سرکار کے خلاف ہتھیار اٹھائے؟ آپ نے اپنی تسبیح کی طرف اشارہ کر کے کہا: ہمارا ہتھیار تو یہ ہے۔" (ایضاً)

غرض اس وقت جبکہ معمولی معمولی بات پر لوگوں کو پھانسی اور کالے پانی کی سزا دی جا رہی تھی۔ انگریز نے مولانا کی وفاداری سے جلد ہی مطمئن ہو کر انھیں رہا کر دیا۔ اور پھر ان سے کوئی تعرض نہ کیا۔

خیر میں اکابر دیوبند کے اس موقف کی ایک شہادت سن لیجیے۔ قیام مدرسۂ دیوبند کے چند سال بعد ۳۱ جنوری ۱۸۷۵ء کو لفٹننٹ گورنر نے اپنے خاص معتمد آدمی مسٹر پامر کو دارالعلوم دیوبند کے معائنہ کے لیے بھیجا تو اس نے ان الفاظ میں آ کر رپورٹ دی کہ "یہ مدرسہ خلاف سرکار نہیں، بلکہ موافق سرکار ممد و معاون سرکار ہے۔ یہاں کے تعلیم یافتہ لوگ ایسے آزاد اور نیک چلن ہیں کہ ایک کو دوسرے سے کچھ واسطہ نہیں۔" (محمد احسن نانوتوی ص ۲۱۷)

ظاہر ہے کہ انگریز کے نزدیک "نیک چلن" اور "موافق سرکار" وہی ہو سکتا ہے جو

ان سب کے علاوہ ایک بڑی بات جو اس موقع پر قابلِ غور ہے وہ یہ کہ حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہ جنھوں نے ابتدا میں ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے کا فتویٰ دیا تھا اور انگریزی حکومت کی ملازمت تک کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ خود ان کی روش بھی بعد میں تبدیل ہو گئی تھی۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم فرماتے ہیں:

"دہلی میں جب انگریزی حکومت قائم ہوئی تو علمائے ثقات کا عام مسلک

← اس کا کامل وفادار ہو اور اس میں کسی قسم کے بغاوت کے جرائم نہ ہوں۔ لیکن یہ لوگ اس وفاداری سے بھی دو قدم آگے تھے یعنی ممدومعاون سرکار تھے۔ سوال یہ ہے کہ یہ درویش صفت حضرات اتنی بڑی انگریزی حکومت کی کیا معاونت کر رہے تھے۔ کیا معلوم ہے کہ اس وقت وہابیوں کے خلاف حکومت پے در پے کیس قائم کر رہی تھی، انھیں سنگین سزائیں دی جا رہی تھیں، دوسری طرف علمائے لدھیانہ و دیوبند کے مشترکہ فتووں اور ملک گیر تگ و دو کے نتیجے میں اہلحدیثوں کے خلاف مساجد میں قتل و حرب اور اخراج کا ہنگامہ برپا تھا ممکن ہے ان دونوں میں کوئی گٹھ بھگت رہی ہو اور وہابی باغیوں کی اس سرکوبی میں اشتراک و تجسس کو امداد و معاونت سے تعبیر کیا گیا ہو۔

ان طویل گزارشات کا مقصد یہ ہے کہ میاں صاحب پر فتوائے جہاد پر دستخط نہ کرنے یا انگریز سے وفاداری کا الزام لگانے والوں کو چاہیے کہ ایک ناکردہ گناہ کو مجرم کے کٹہرے میں کھڑا کرنے کے بجائے حقائق و شواہد کے آئینے میں اپنا اور اپنے اکابر کا چہرہ دیکھیں۔ واللہ ولی التوفیق

(ج۔ ر)

یہ رہا کہ انگریزی ملازمت سے اجتناب کیا جائے، شاہ صاحب کا بھی ابتدا میں یہی مسلک تھا۔ جب کمپنی نے کلکتہ میں قاضی القضاۃ کا عہدہ قائم کیا اور اس کے لیے لکھنؤ لکھا تو لکھنؤ سے ایک استفتاء شاہ صاحب کے نام گیا تھا، شاہ صاحب اس کے جواب میں لکھتے ہیں کہ مسلمانوں پر اس سے احتراز واجب ہے ..... لیکن جب انگریزی حکومت پر کچھ عرصہ گزر چکا تو انگریزوں کی کوششیں جو وہ شمالی ہند میں مسلمانوں کی تالیف قلب کے لیے برابر کیے جا رہے تھے، بہت کچھ کامیاب ہونے لگیں، حتیٰ کہ وہ وقت آگیا، خود شاہ صاحب تیار ہو گئے کہ اپنے داماد مولوی عبدالحی کو میرٹھ کے مفتی عدالت ہونے کی اجازت دیدیں اور مدرسہ عزیزی کی طرف سے ان کا نام پیش کریں۔ اس وقت شاہ غلام علی خانقاہ والے زندہ تھے۔ انھوں نے جو نہی یہ بات سنی، نہایت درجہ کبیدہ خاطر ہوئے اور شاہ صاحب کے نام خط لکھ کر اظہار تعجب کیا۔ شاہ صاحب نے اس کے جواب میں ایک مفصل خط لکھا ہے۔ اس میں حضرت یوسف اور فرعون کے معاملہ سے استدلال کرتے ہیں اور انھی باتوں پر زور دیتے ہیں جن کا چند سال پہلے لکھنؤ والے مکتوب میں بشدومد رد کر چکے تھے۔

ڈاکٹر ہنٹر نے اپنے رسالہ "انڈین مسلمانز" میں شاہ صاحب کے اس خط کا ترجمہ نقل کیا ہے۔ ان کے مجموعۂ فتاویٰ میں جو مجتبائی پریس نے شائع کر دیا ہے، دونوں تحریریں موجود ہیں۔"

(نقش آزاد ص ۱۳۰، ۱۳۱)

ثانیاً: ۱۸۵۷ء کی عام شورش اور ہنگامے کو اگر میاں صاحب نے اسلامی جہاد (بشروط معتبرہ) اور دینی جنگ ہونے کا فتویٰ نہیں دیا تو ....

چند تفریعات: (الف) یہ تو کوئی طعنہ کی چیز نہیں ہے۔

(ب) اور نہ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ انھوں نے مطلقاً سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔

(ج) یا یہ کہ وہ انگریزی حکومت کے وفادار تھے، اور اپنی وفاداری کا مظاہرہ کرنے کی غرض سے انھوں نے یہ کام کیا تھا۔

(د) یا یہ کہ ان کی اس روش (یعنی جہاد کے فتوے پر دستخط نہ کرنے) کا یہ اثر ہوا کہ ان کے وقت سے لے کر آج تک اہلحدیث کے علماء اور مشائخ نے سیاست اور عملی جہاد میں کوئی حصہ نہیں لیا۔

بات کے ہر پہلو کو دلائل کی روشنی میں وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لیے ہم نے تفریعات پر نمبر لگا دیے ہیں۔ تفریعات کے انھیں نمبروں کی ترتیب سے اب ہماری مندرجہ ذیل معروضات کو ٹھنڈے دل سے پڑھیے، اور سوچیے کہ حق و انصاف کا تقاضا کیا ہے؟۔

تفریع الف کے متعلق:

مولانا مسعود عالم ندوی ؒ لکھتے ہیں:

"اسی دوران میں ۵۷ء کا پُرآشوب حادثہ پیش آیا اور گو مجاہدین اور ان کے معاونین ایک دینی نظام سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اس قومی لڑائی

میں غیر جانبدار رہے، پھر بھی پٹنہ کے کمشنر مسٹر ٹیلر نے مولانا احمد اللہ صادق پوری وغیرہ کو بہت دق کیا۔"

اسی موقع پر حاشیہ میں لکھا ہے:

"ہماری غرض یہ ہے کہ مجاہدین جماعتی حیثیت سے ۵۷ء کی قومی لڑائی سے الگ رہے۔ ۵۷ء کے ہنگامے کو ایک قومی جنگ سے زیادہ حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ اسی لیے سید صاحب کے ماننے والے ایک دینی نظام سے وابستہ ہونے کے بعد اس سے الگ رہے..."

(پہلی اسلامی تحریک ص ۸۰)

مولانا غلام رسول مہر نے اس ہنگامے کی بابت ۴۳۶ صفحوں کی ایک مستقل کتاب ہی لکھی ہے، جس کا نام ہی "۱۸۵۷ء" ہے۔ اس میں اس ہنگامے کے اسباب حالات اور نتائج بڑی تفصیل سے پیش کیے ہیں۔ چنانچہ اسباب کی بابت مختلف نظریات نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"ان میں سے بعض اسباب یقیناً درست ہیں، اور بعض بالکل بے سر و پا ہیں، مثلاً اُسے خالص اسلامی تحریک قرار دینا، اس لیے کہ اس کے کارفرماؤں اور کارکنوں میں ہندو اور مسلمان دونوں کی شرکت کسی ثبوت کی محتاج نہیں۔"

(ص ۲۱)

اس کے بعد پھر لکھتے ہیں:

"جنگ آزادی کا بنیادی اور اساسی سبب ایک اور صرف ایک تھا، اور وہ یہ کہ انگریزی حکومت اجنبیوں کی حکومت تھی۔ ابتدا میں

انھیں مختلف دیسی حکمرانوں کے کارندے، ایجنٹ اور مختار سمجھ کر قبول کیا گیا، جب معلوم ہوا کہ انھوں نے حرّافی اور عیاری سے سب کچھ سنبھال لیا تو ان کے خلاف ہمہ گیر نفرت کی لہر دوڑ گئی۔ کوئی بھی غیرتمند محب وطن اجنبی تسلط کو بہ طیب خاطر برداشت نہ کرسکتا تھا۔ میر جعفر یا اس جیسے دوسرے آدمیوں کو قابل توجہ نہیں سمجھا جاسکتا۔ آپ سرسید کے الفاظ میں کہہ سکتے ہیں کہ قوم نے غیروں کی حکومت اٹھادینے کے لیے اقدام کیا۔" یا تھیو فلس مٹکاف کی تعبیر کے مطابق سمجھ سکتے ہیں کہ "یہ ایک قومی تحریک تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ ملک کو غیروں کے تسلط سے نجات دلائی جائے۔"

"باقی رہے دوسرے اسباب جن کا ذکر سرسید نے کیا ہے یا جن کا ذکر ۱۸۵۷ء کے متعلق عام کتابوں میں ملتا ہے تو وہ سب اصل بنیادی سبب کے لیے تقویت و استحکام کے باعث بنے ..." (ص ۲۲)

مہر صاحب نے کتاب کے آخر میں ضمیمہ ۱ کے ذیل میں اپنی اسی بات کو پھر دہرایا ہے، اور اس کی تائید میں ایک انگریز کے مضمون کا اقتباس بھی پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"میں نے کتاب میں ایک سے زیادہ مرتبہ عرض کیا کہ ۱۸۵۷ء کی تحریک عام تھی، ملک کے تمام حصے اور اس میں بسنے والے تمام طبقے اس سے متاثر ہوئے۔ بعض لوگ وقتی حالات کی سازگاری سے فائدہ اٹھا کر میدان عمل میں آگئے۔ بعض قیادت سے محرومی کے باعث کچھ نہ کرسکے۔ بیشتر انگریزوں کا خیال تھا کہ "اسلامی بغاوت ہے"۔ اس لیے کہ مسلمان

اس تحریک میں بہت پیش پیش تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ فرقہ وارانہ تحریک نہ تھی، اور اس کی غرض سیاسی آزادی تھی۔ اگرچہ فوج میں اس کا آغاز چربی والے کارتوسوں سے ہوا۔

اس کے بعد مہر صاحب نے لاہور کے انگریزی اخبار "پنجابی" بابت ۱۱ جولائی ۱۸۵۷ء کے حوالے سے ایک مضمون کا کچھ حصہ نقل کیا ہے، جس کی بابت انھوں نے لکھا ہے کہ "غالباً کسی انگریز نے لکھا تھا۔"

مہر صاحب کا نقل کردہ حصہ یہ ہے:

"اس میں شک نہیں کہ موجودہ جنگ مذہبی نہیں جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ اور "دین، دین" کے جس نعرے سے ہندوستان کے طول و عرض میں گونج پیدا ہو گئی ہے، اس کی تہ میں تمام باشندگان ہند کی کوشش یہ ہے کہ اجنبی اور غیر ملکی حکومت سے آزادی حاصل کریں۔ یہ محکومی زیادہ سے زیادہ تلخ و ناخوش گوار محسوس کی جارہی ہے، اس لیے کہ یہ اہل ملک کے قدیم مرغوبات و میلانات کی بے حرمتی پر مبنی ہے، اور یہ محکومی ایک ایسی طاقت کی طرف سے عائد ہوئی ہے جسے محکومین سے رنگ، عقیدے، زبان، رائے، عادات، خیالات، احساسات یا تصور اقتصادیات میں کسی بھی نوع کی یکسانی نہیں۔"

(۱۸۵۷ء ص ۳۵۰)

ان اقتباسات کے پڑھنے کے بعد ہمیں میاں صاحب اور دوسرے اکابر علمار عصر کی فراست ایمانی، اور بالغ نظری کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ جس حقیقت کو تاریخ

کے محققین نے تحریک کے منظر اور پس منظر کا پوری طرح جائزہ لینے اور ہزاروں صفحات کا مطالعہ کرنے کے بعد پایا ہے۔ اس کو ان حضرات نے پہلی ہی نظر میں دیکھ لیا تھا۔ محققین کے فیصلے کے مطابق جب یہ جنگ مجموعی حیثیت سے محض "قومی جنگ" تھی۔ اور اس کو خالص اسلامی تحریک قرار دینا بالکل بے سر و پا ہے۔ اس کی تہ میں غیر ملکی حکومت سے سیاسی آزادی حاصل کرنے کے سوا اور کوئی دوسری بنیادی غرض نہ تھی۔ بالفاظ دیگر اس عام شورش اور ہنگامے کا مقصد یہ نہ تھا، لتکون کلمة الله هی العلیا۔ (تاکہ اللہ کا کلمہ اونچا ہو کر رہے۔) تو پھر ہمیں ان علماء کو جنھوں نے اس عام ہنگامے کو اسلامی جہاد (قتال فی سبیل اللہ) ہونے کا فتویٰ نہیں دیا تھا، مطعون کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے کہ کہیں ہمیں تو غلطی پر نہیں ہیں؟ نامناسب نہ ہو گا اگر اس موقع پر ایک حدیث نقل کر دوں۔

عن ابی موسیٰ قال سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن الرجل یقاتل شجاعة ویقاتل حمیة ویقاتل ریاء ای ذلک فی سبیل اللہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من قاتل لتکون کلمة اللہ	حضرت ابوموسیٰؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے شخص کے بارے میں سوال کیا گیا جو اپنی بہادری دکھانے کے لیے لڑتا ہے، یا کسی بات کو اپنے لیے عار سمجھ کر اس عار کو دور کرنے کے لیے لڑتا ہے، یا شہرت کے لیے لڑتا ہے تو ان میں سے کون سی جنگ فی سبیل (اللہ کی راہ میں) ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (ان میں سے کوئی بھی فی سبیل اللہ نہیں ہے)

هی العلیا فهو فی سبیل اللہ ۔

فی سبیل اللہ صرف وہ لڑائی ہے جو اس مقصد سے لڑی جائے کہ اللہ کی بات غالب اور اونچی ہو کر رہے ۔

(صحیح مسلم ص ۱۴۰ ج ۲ و بخاری ص ۲۳ ج ۱)

اس موقع پر لفظ "حمیۃ" خاص طور سے قابل غور ہے ۔ اس کی تفسیر امام نووی ؒ نے کی ہے ۔ هی الانفة والغیرة والمحاماة عن عشیرتہ ۔ یعنی کسی بات کو عار سمجھ کر اس سے بیزاری اور ناگواری ظاہر کرنا یا کسی بات پر غیرت آنا، یا اپنی قوم و قبیلہ، خاندان کی حمایت کرنا ۔ حدیث کی اس تشریح اور تاریخ کے مذکورہ بالا بیانات کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیجیے کہ شرعی نقطۂ نظر سے آپ کا یہ طعنہ کہاں تک درست ہے ؟ ۔

لیکن واضح رہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کو جن لوگوں نے مذہبی جنگ کے بجائے قومی جنگ کہا ہے ، ان کا مقصد یہ نہیں ہے کہ جتنے لوگوں نے اس جنگ میں حصہ لیا وہ سب کے سب ایسے ہی تھے ۔ کسی کا مقصد بھی دین کا تحفظ اور کلمۃ اللہ کا اعلاء نہ تھا، حاشا و کلا ۔ بلکہ یہ بات اس جنگ کی مجموعی حیثیت کے لحاظ سے کہی گئی ہے ، ورنہ افراد کے اعتبار سے بلاشبہ ایسے بہت سے حضرات نے بھی اس میں حصہ لیا ہے جن کا خلوص مسلم جن کے ارادوں کی پاکیزگی، عزائم کی سربلندی اور مقاصد کی نیکی شبہات سے بالاتر ہے ۔ اس وقت اس ہنگامے کی عام اور مجموعی حیثیت زیر بحث ہے ، افراد اور شخصیات پر گفتگو کرنا پیش نظر نہیں ہے ۔

تقریب کے متعلق :

کسی خاص ہنگامے اور لڑائی میں (عدم شرکت کی شرعی وجوہ بیان کر سکتے ہو سکے)

شرکت نہ کرنے سے یہ کیسے لازم آتا ہے کہ میاں صاحب نے سیاست سے بالکل ہی علیحدگی اختیار کرلی تھی۔ جبکہ مولانا سندھی (جن کو اہلحدیثوں سے خاص طور پر بغض اور عناد تھا) یہ اعتراف کرتے ہیں کہ:

"مولانا نذیر حسین دہلوی اور مولانا عبداللہ غزنوی بھی مولانا ولایت علی کی پارٹی سے خاص تعلق رکھتے تھے۔"

(سیاسی تحریک ص ۱۳۲)

ذیل کا اقتباس ایک جگہ پہلے بھی گزر چکا ہے، مگر ضرورت کا تقاضا ہے کہ ایک بار پھر اس کو نقل کیا جائے۔ مولانا سندھی فرماتے ہیں:

"مولانا ولایت علی کی تحریک کے متعلق ہمارا اپنا خیال یہ ہے کہ وہ مولانا اسماعیل شہید کی اس خاص جماعت کو جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے زندہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اسی لیے مولانا نذیر حسین اور نواب صدیق حسن جیسے عالم بھی ان کا ساتھ دیتے رہیں۔"

(سیاسی تحریک ص ۱۳۲)

مولانا ولایت علی اور ان کی پارٹی کے ساتھ "خاص تعلق" رکھنے والے اور ان کا "ساتھ دینے والے" کی نسبت یہ گمان کرنا کہ اس نے سیاست سے بالکل کنارہ کشی اختیار کرلی تھی، یقیناً افسوسناک بدگمانی ہے۔ اس پارٹی کا ساتھ دینے والے اتنے خفیہ اور رازدارانہ طریقے سے امداد کا کام انجام دیتے تھے کہ سب کی نگاہیں وہاں تک نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ حتیٰ کہ انگریز بھی میاں صاحب کے متعلق قانونی طور پر اس "جرم" کا ثبوت دینے سے قاصر رہا۔ ۶۵-۱۸۶۴ء کے مقدمۂ بغاوت میں (جس کا ذکر

آگے اپنے موقع پر آئے گا) میاں صاحب بھی ماخوذ ہوئے اور کم و بیش ایک سال تک راولپنڈی جیل میں نظر بند رہے۔ اس دوران میں تفتیش ہوتی رہی۔ مگر "جرم" ثابت نہ ہو سکا اس لیے رہا کر دیے گئے۔ لیکن اس سے یہ تو یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت میاں صاحب واقعی سرحد پار کے مجاہدین کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں رکھتے تھے اور نہ انکی کسی قسم کی امداد کرتے تھے۔ مولانا غلام رسول مہر نے سید نصیر الدین دہلوی کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا طویل تذکرہ لکھا ہے۔ اسی کے ذیل میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"مولوی صاحب نے (یعنی سید نصیر الدین دہلوی نے) جو اعلام نامے بھیجے وہ تمام مسلمانوں کے نام تھے۔ لیکن ایک مکتوب میں انھوں نے اپنے خاص مخاطبین کے نام بھی درج کر دیے ہیں جو اس غرض سے یہاں پیش کیے جاتے ہیں کہ اول مولوی صاحب کے دائرۂ دعوت کی وسعت کا اندازہ ہو جائے، دوسرے یہ معلوم ہو جائے کہ اس تاریک دور میں کون کون اصحاب دعوتِ حق کے خیر مقدم میں پیش پیش تھے۔"

(سرگزشتِ مجاہدین ص ۱۷۳)

اس کے بعد مہر صاحب نے ناموں کی جو تفصیل پیش کی ہے، ان میں شیخ الکل حضرت میاں صاحب سید نذیر حسین محدث دہلوی کا نام نامی بھی ہے، بقول مہر صاحب اس سے معلوم ہوا کہ اس تاریک دور میں حضرت میاں صاحب بھی دعوت حق کا خیر مقدم کرنے میں پیش پیش تھے۔[1]

[1] حاشیہ ←

تفریع ج کے متعلق:

انگریزوں کے خلاف جہاد کے فتوے پر دستخط نہ کرنے کا یہ مطلب نکال کر میاں صاحب گورنمنٹ انگلشیہ کے وفادار تھے، اور اپنی وفاداری کا اظہار کرنے کی غرض سے انھوں نے یہ کام کیا تھا، یا تو غلط قسم کی حسن ظنی ہے۔ یا افسوسناک بدگمانی۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہاں یہ دونوں ہی جذبات کام کر رہے ہیں۔ یعنی انگریزی اقتدار کے دور میں جو لوگ انگریز کی وفاداری ہی کو خوبی اور کمال سمجھتے تھے، انھوں نے اپنے جذبات کے ماتحت ازراہ حسن ظنی میاں صاحب کو بھی انگریز کا وفادار

لہ یاد رہے کہ، سید نصیر الدین صاحب دہلوی کا اعلام نامہ تقریباً ۱۸۳۵ء میں جاری ہوا تھا۔ اس وقت میاں صاحب طالب علم تھے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تحریک جہاد سے میاں صاحب کا ربط ابتدا ہی سے کتنا گہرا تھا۔ در حقیقت میاں صاحب نے سترہ سال کی عمر میں ۱۲۳۶ھ میں سید احمد شہید کے ایک خلیفہ مولانا محمد حسین سے پٹنہ میں تعلیم حاصل کرنی شروع کی، پھر سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید جب پٹنہ پہنچے اور اپنی تقریروں سے توحید اور جہاد کی روح پھونکی تو میاں صاحب بھی ان تقریروں میں موجود تھے۔ یہ بھی معلوم ہے کہ شہیدین سے بیعت و تعلق کے بعد خاندان صادقپور حرکت و عمل کی ایک داستان بن گیا تھا۔ اور جہاد و حریت کی قندیل جس عزم و ہمت کے ساتھ روشن رکھی یہ انھیں کا کام تھا۔ میاں صاحب نے انھیں بزرگوں کے زیر تربیت رہ کر مشکوٰۃ تک تعلیم حاصل کی۔ پھر دہلی تشریف لائے تو شاہ اسحاق کا حلقہ درس جما ہوا تھا۔ دہلی کے مرکز جہاد کے منتظم بھی شاہ صاحب ہی تھے۔ میاں صاحب ۱۳ سال تک

ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ ان کے زعم میں میاں صاحب کی نیک نامی اسی میں ہے۔ ہمارے نزدیک یہ غلط قسم کی حسن ظنی ہے۔ اسی کا شکار ہو گئے ہیں میاں صاحب کے سوانح نگار مولوی فضل حسین صاحب مظفر پوری اور بعض دوسرے حضرات۔

دوسری طرف کچھ ایسے لوگ ہیں جو ملک کی آزادی کے بعد جماعتِ اہلحدیث کو دانستہ یا نادانستہ طور پر بدنام کرنا چاہتے ہیں، اس لیے ایسے واقعات کے متعلق وہ بدگمانی سے کام لے رہے ہیں، اور اپنی بدگمانی کے ثبوت میں خود میاں صاحب کا کوئی قول پیش کرنے یا ان کی کسی عبارت کا حوالہ دینے کے بجائے انگریزوں کی چٹھیاں

؎ تک مسلسل ان کی صحبت سے فیضیاب ہوئے اور اس قدر معتمد علیہ ثابت ہوئے کہ فتوی نویسی اور فصل مقدمات جیسی ذمہ داریاں بھی شاہ صاحب نے بسا اوقات آپ کے سپرد کر دیں۔ پھر جب ۱۲۵۷ھ میں شاہ صاحب نے حجاز ہجرت فرمائی تو اپنی مسند پر میاں صاحب کو بٹھا گئے اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تحریک جہاد کے سلسلے کا وہ سارا کام جسے شاہ صاحب پس پردہ انجام دے رہے تھے اسے میاں صاحب نے سنبھالا۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ علمی جلالت اور مجاہدانہ سرگرمیوں میں شاہ صاحب کے نزدیک کوئی دوسرا عالم میاں صاحب کے ہم پلہ اور ان کے جتنا قابلِ اعتماد نہ تھا اور یہ بھی مسلم ہے کہ شاہ صاحب سے بڑھ کر اس حقیقت کا اور کوئی واقف کار نہیں ہو سکتا تھا۔ پس اس قدر پختہ کار اور سرگرم انسان کے بارے میں جس کی رگ رگ میں تحریک جہاد سے وابستگی رچی بسی ہو اور وہ اس کا مرکزی ذمہ دار ہو، یہ گمان کرنا کہ اس نے سیاست سے بالکل کنارہ کشی اختیار کرلی تھی یقیناً افسوسناک بدگمانی ہے۔" (ص ۱۰۵)

دکھاتے ہیں، یا مولوی فضل حسین صاحب جیسے لوگوں کے اقوال سامنے لاتے ہیں۔ حالانکہ اس شدید الزام کے ثبوت کے لیے یہ دلیلیں ہرگز کافی نہیں ہیں۔

اس معاملہ میں قولِ فیصل میاں صاحب ہی کا کلام ہو سکتا ہے۔ لیجیے ہم میاں صاحب کا وہی قول یہاں نقل کرتے ہیں جس کو الحیاۃ بعد المماۃ کے مصنف (مولوی فضل حسین صاحب مظفر پوری) نے "گورنمنٹ انگلشیہ کے ساتھ وفاداری" کے نمایاں عنوان کے ذیل میں ذکر کیا ہے۔ میاں صاحب فرماتے ہیں:

"میاں وہ بلوہ تھا، بہادر شاہی نہ تھی، وہ بیچارہ بوڑھا بہادر شاہ کیا کرتا، حشرات الارض خانہ برانداز وں نے تمام دلی کو خراب، ویران تباہ، برباد کیا، شرائط امارت وجہاد بالکل مفقود تھے، ہم نے تو اس فتوے پر دستخط نہیں کیا، مہر کیا کرتے اور کیا لکھتے.....۔"

(الحیاۃ بعد المماۃ ص ۷۶)

ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس عبارت سے کس طرح میاں صاحب کے "جذبۂ وفاداری" کا ثبوت ہوتا ہے۔ جبکہ انھوں نے برملا یہ فرمایا ہے کہ اس فتوے پر دستخط نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اس ہنگامے میں امارت اور جہاد کے شرائط بالکل مفقود تھے۔ یعنی کسی شرعی امیر کے ماتحت اور اس کے احکام وہدایات کے مطابق یہ جنگ نہیں ہو رہی تھی، بلکہ ایک بھیڑ تھی، جو کسی ضبط وتنظیم کے بغیر اور شریعت اسلامیہ کی جنگی تعلیمات کی پیروی کا لحاظ نہ کرتے ہوئے لوٹ مار اور قتل وغارت کا بازار گرم کیے ہوئے تھی۔ بالفاظ دیگر اس فتوے پر دستخط نہ کرنے کا محرک وفاداری کا جذبہ نہیں تھا بلکہ اس وقت صورتحال ایسی تھی کہ میاں صاحب کے نزدیک کتاب وسنت کی روشنی میں اس پر اسلامی جہاد کا اطلاق نہیں ہو سکتا تھا۔

اب رہا یہ کہ میاں صاحب نے اس وقت کی جو صورت حال بیان فرمائی ہے وہ صحیح ہے یا نہیں ؟ تو اس کے جاننے کے لیے ہمیں تاریخ کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ خواجہ حسن نظامی دہلوی نے "غدر دہلی کے افسانے" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جو کئی حصوں میں چھپی ہے، اس وقت اُس کا دوسرا حصہ ہمارے سامنے ہے، اس کے مختلف مقامات سے کچھ اقتباسات ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔ سب سے پہلے بہادر شاہی حکومت کی کس مپرسی کا حال پڑھیے، خواجہ صاحب لکھتے ہیں:

"بادشاہ کا حکم شاذ و نادر ہی مانا جاتا تھا، اور شہزادوں کو تو کوئی پوچھتا تک نہ تھا کہ تم ہو کس مرض کی دوا۔ سپاہ بالکل بے سری ہو گئی تھی۔ نہ بگل کو مانتے تھے نہ افسروں کی سنتے تھے اور نہ اپنا متعلق کام انجام دیتے تھے۔ فوج کی گنتی تو ایک طرف رہی کبھی وردی بھی نہیں پہنی۔"

(ص ۲۹)

"ہلڑ بازی" سے میاں صاحب کا مقصد یہی تھا کہ اس شورش میں نہ کوئی امیر تھا اور نہ کوئی مامور۔ نہ کوئی اصول تھا اور نہ کوئی قانون، جس کے جی میں جو آتا تھا کرتا تھا۔ خواجہ صاحب کے بیان کے مطابق جب تنخواہ دار سپاہ اور فوج کا یہ حال تھا کہ وہ بہادر شاہ کے قابو سے باہر ہو گئی تھی تو پھر دوسروں کا کیا کہنا۔!

اس ہنگامے کو جن لوگوں نے برپا کیا تھا، اور جس مقصد سے کیا تھا، اس کا اعلان انھوں نے پہلے ہی کر دیا تھا۔ جیسا کہ خواجہ صاحب نے لکھا ہے۔

"غدر ہونے سے تقریباً ایک مہینہ پہلے یکم اپریل ۱۸۵۷ء کو ایک اشتہار اس مضمون کا جامع مسجد دہلی میں چسپاں کیا گیا تھا کہ ۱۱ مئی کو دہلی لوٹی

جلائے گی، اور بڑا کشت و خون ہوگا۔ مگر اس وقت حکام نے اس طرف توجہ نہیں کی اور معمولی بات سمجھ کر ہنسی میں ٹال دیا گیا۔ شمالی و مغربی اضلاع کے اخبارات نے بھی اس کو کوئی اہمیت نہ دی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ عام لوگ بھی بے فکر اور مطمئن ہو کر بیٹھ رہے۔ یہاں تک کہ ۱۱ مئی کا وہ خوفناک دن آگیا، اور میرٹھ کے مفسدین کا ایک گروہ صبح کے وقت بھی کشتیوں سے دریا عبور کر کے شہر میں داخل ہوگیا۔"

اس کے بعد کیا کیا ہوا، اس کا ذکر کرتے ہوئے خواجہ صاحب لکھتے ہیں:

"...... اس کے بعد بلوائی دیوانِ عام کی طرف گئے، وہاں دو معصوم میمیں تھیں، ان کو بھی ان سنگدلوں نے نہ چھوڑا، اور بندوق کا نشانہ بنا دیا، وہاں سے نکل کر سیدھے دریا گنج کا رُخ کیا اور یہاں آ کر تمام مکانوں کو آگ لگا دی۔ یہ مکانات زیادہ تر انگریزوں کے تھے، اس عرصہ میں ایک اور رجمنٹ مفسدوں کی شہر میں گھس آئی اور آتے ہی شہر کے لُچوں اور شہدوں سے کہا کہ تم لوگ شہر کو خوب لوٹو، ہمیں اس سامان غنیمت میں ہاتھ لگانا حرام ہے۔ جو بلوائی دریا گنج کو جلا رہے تھے انھوں نے وہاں پانچ انگریزوں اور دو میموں کو اور مار ڈالا۔ جب دریا گنج جل کر خاک سیاہ ہوگیا تو وہاں سے مفسد بینک کی کوٹھی پر گئے، اس کو بھی آگ لگا کر جلا ڈالا، اور پانچ فرنگیوں کو جان سے ہلاک کر دیا، پھر وہاں سے کوتوالی گئے اور ان سے کہا کہ شہر کو لوٹو۔ کوتوال خوفزدہ ہو کر کوتوالی چھوڑ کر بھاگ گیا اور کوئی تدبیر غریب مرزا کی چل نہ سکی۔ کوتوالی

ے سکتر صاحب مرحوم کی کوٹھی پر پہنچے، مگر اس کو آگ نہیں لگائی، لیکن وہاں گرجا اور گرجا کے قرب وجوار میں جس قدر مکانات تھے، سب میں آگ لگادی اور جلاکر خاک کا ڈھیر کردیا، اور جس قدر میمیں اور فرنگی تھے سب کو مع ننھے ننھے بچوں کے قتل کر ڈالا۔" (ص ۳)

"..... دہلی کے گرد و نواح کے جس قدر دیہاتی تھے، سب اٹھ کھڑے ہوئے اور لوٹ مار شروع کردی۔ (ص ۵)

"..... فسادیوں نے جب دہلی کو اچھی طرح لوٹ لیا تو دو سو سوار گوڑگانوہ کی طرف گئے اور وہاں بھی فتنہ وفساد لوٹ کھسوٹ اور آتش زنی کا بازار گرم کردیا۔" (ص ٦)

"..... دریا گنج میں جس قدر عیسائی رہتے تھے وہ سب فساد کے روز ایک کوٹھے پر جمع ہوئے اور تین چار دن تک وہاں قائم رہے ... جب تک یہ لوگ کوٹھے پر رہے کھانے پینے کی کوئی چیز ان کے پاس نہیں پہنچی۔ غریب معصوم ننھے ننھے بچے بھوک پیاس سے بلک رہے تھے۔ ان کم بخت تنگ دلوں نے لڑکوں سے کہا کہ اگر تم نیچے اترآؤ تو ہم تمھیں کھانا پانی سب کچھ دیدیں گے۔ مگر جب وہ معصوم نیچے اترے تو فوراً قتل کا اشارہ کیا اور سب معصوموں کو ذبح کر ڈالا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد قتل عام شروع ہوگیا۔" (ص ۱۱)

"..... غرضیکہ اس فساد میں نہایت سخت وحشیانہ ظلم وستم کیے گئے بچے رحم مادر سے نکالے گئے۔ ننھے ننھے بچے تلوار اور نیزوں کی نوک پر

اُٹھاکر بازاروں میں فخریہ پھرلیئے گئے، عورتوں کو برہنہ کر کے نہایت ذلت وخواری سے قتل کیا گیا۔ ... (ص ۶۲)

ان اقتباسات سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس ہنگامے میں حصہ لینے والوں کے ظلم وستم کا نشانہ صرف انگریزوں کی جان و مال اور انہیں کی عورتیں اور بچے نہیں تھے بلکہ شہر کے دوسرے باشندوں کو بھی خوب لوٹا کھسوٹا گیا اور جان ومال تباہ کیا گیا۔ چنانچہ خواجہ صاحب نے ایک جگہ اس کے متعلق صاف صاف بھی لکھا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"مفسدین نے صرف انگریزوں ہی کے ساتھ ظلم و زیادتی نہیں کی بلکہ شہر والوں کے ساتھ بھی وہ وہ ظلم کیے کہ الامان والحفیظ۔ دہلی شہر ہمیشہ سے دولتمند مشہور ہے، مفسدین خوب جانتے تھے اسی لیے خوب جی کھول کر اسے لوٹا۔ ایک ہندوستانی جو اس درمیان یعنی ۱۱ر مئی سے ۲۳ر جون تک دہلی میں تھا شہر کی کیفیت اس طرح بیان کرتا ہے کہ مفسدوں نے شہر کے باشندوں کا ایک گھوڑا بھی نہیں چھوڑا۔ سب چھین لے گئے۔ اکثر دوکانداروں کو محض اس قصور پر جان سے مار ڈالا کہ وہ واجبی قیمت مانگتے تھے ... شہر کے باشندے اور دوکاندار سب ہی افسوس کرتے تھے۔ اہلِ حرفہ کی حالت فاقہ کشی تک پہنچ گئی تھی بیوہ عورتیں مکانوں میں بیٹھی رویا کرتی تھیں اور صبح سے شام تک مفسدین کو بددعا دیا کرتی تھیں۔ ......

مفسدوں کو شہر میں جہاں نقد روپیہ نظر آتا فوراً لوٹ لیتے پھر بھی سب روپیہ ابھی تک بیاہیو لس کے قبضے میں تھا اور خزانہ شاہی میں ایک حبہ داخل نہیں ہوا تھا۔ بعض رجمنٹوں کے پاس اس قدر روپیہ جمع ہوگیا تھا کہ

وہ بمشکل حرکت کر سکتے تھے ....." (ص ۲۷)

تاریخ کی اس شہادت کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیجیے کہ صورتحال کی نسبت میاں صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے وہ لفظ بلفظ صحیح ہے یا نہیں؟ اگر صحیح ہے تو اس صورتحال کا حوالہ دیتے ہوئے جب میاں صاحب نے خود ہی اپنے دستخط نہ کرنے کی وجہ بتادی ہے تو اب اس کے سوا اور کیا کہا جائے کہ مولوی فضل حسین صاحب یا ان کے جیسے کسی دوسرے عقیدتمند کا اس سے "جذبۂ وفاداری" پر استدلال کرنا درحقیقت اپنے جذبات کی ترجمانی ہے، میاں صاحب کی نہیں۔ اسی لیے بعض حنفی مورخین نے بھی مولوی فضل حسین صاحب کی اس روش کو ناپسند کیا ہے، اور اس کو "سعی لاحاصل" کہا ہے۔ چنانچہ مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی اکبرآبادی نے "علمائے حق اور ان کی مظلومیت کی داستانیں" کے نام سے جو کتاب لکھی ہے اس کے ص ۱۰۹ تا ص ۱۱۱ پر میاں صاحب کے کچھ حالات بھی لکھے ہیں۔ آخر میں لکھتے ہیں:

"فضل حسین مظفرپوری نے الحیاۃ بعد المماۃ میں میاں صاحب کو وقت کا لحاظ رکھ کر وفادار ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کی ہے۔" (ص ۱۱۰)

مفتی صاحب کا مطلب ظاہر ہے کہ جن چیزوں سے میاں صاحب کی وفاداری، ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے ان میں سے کسی سے بھی یہ مدعا حاصل نہیں ہوتا۔ اس لیے وقت کی مصلحت کے لحاظ سے اگرچہ یہ کوشش کی گئی مگر یہ کوشش لاحاصل اور بےنتیجہ ہے۔

اب دوسرے نقطۂ نظر کو لیجیے۔ یعنی یہ جو ہم نے کہا ہے کہ آزادی حاصل ہوجانے کے بعد اس دستخط نہ کرنے والی بات کو طنز و تعریض اور تنقیص و توہین کی شکل میں پیش

کرنے والے بدگمانی سے کام لے رہے ہیں تو مذکورہ بالا تفصیلات سے ہماری اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ جب معلوم ہو گیا کہ میاں صاحب کے نزدیک دلائلِ شرعیہ کی رو سے مسئلہ کی نوعیت یہی تھی کہ اس پر اسلامی جہاد کا اطلاق نہیں ہو سکتا تھا۔ تو اب خواہ مخواہ ان کی نیت پر حملہ کرنا اور بلا وجہ اس کو "وفاداری" کے جذبے پر محمول کرنا، بدگمانی نہیں تو اور کیا ہے؟۔ مولانا غلام رسول مہر نے اس معاملہ میں بہت مناسب اور معتدل راہ اختیار کی ہے۔ انھوں نے اس ہنگامے میں شریک ہونے اور نہ ہونے کو ایک "اجتہادی مسئلہ" قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اس بارے میں علماء کا اختلاف نقطۂ نظر کا اختلاف تھا۔ اس لیے اجتہاد کی رو سے ان کی رایوں کی بابت خطا یا صواب کا حکم تو لگایا جا سکتا ہے، لیکن ان میں سے کسی کو ملزم گردانے اور مطعون کرنے کا ہم کو حق نہیں ہے۔ مہر صاحب لکھتے ہیں:

"۱۸۵۷ء میں ملک کے اندر جگہ جگہ آزادی کی جدوجہد کی گئی۔ اگرچہ دہلی یا دوسرے مقامات کے بعض بزرگوں نے ۱۸۵۷ء کی تحریک کو درست ماننے سے انکار کر دیا تھا تاہم ان میں سے بعض نہایت بلند پایہ افراد اس میں شریک رہے۔ مثلاً بزرگانِ دیوبند، مولانا لیاقت علی الہ آبادی، مولانا سرفراز علی جونپوری، مولانا رحمت اللہ کیرانوی ...

بہر حال یہ اجتہادی مسئلہ تھا۔ ایک گروہ نے اس پر ایک نقطۂ نگاہ سے غور کیا۔ دوسرے نے دوسرا نقطۂ نگاہ پیش نظر رکھا۔ ایک کی رائے یہ تھی کہ آزادی حاصل کرنے کے جو ممکنات پیدا ہو گئے ہیں ان سے فائدہ اُٹھانا چاہیے اور جس حد تک ملکی قوتوں کو منظم کیا جا سکتا ہے کر دینا چاہیے۔

دوسرے گروہ کی نظر اس پہلو پر گئی کہ ملکی قوتوں میں تنظیم نہیں، اور تحریک نے فی الجملہ ہنگامۂ عام کی حیثیت اختیار کرلی ہے جسے عرفاً بلوا کہتے ہیں۔ اور شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی، جس حد تک میں اندازہ کرسکا ہوں، پہلے گروہ کی رائے صائب تھی اور دوسرے گروہ کو اگرچہ ملزم نہیں گردانا جاسکتا تاہم اس کی رائے صائب نہ تھی۔ اس لئے ذرائع کے باب میں حد درجہ مبالغہ آمیز تصور مناسب سمجھا، جس میں مقصد نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ بلاشبہ تحریک کی بے تنظیمی کی متعدد مثالیں ملتی ہیں، یہاں تک کہ اگر کہا جائے ناکامی کا سب سے بڑا سبب بے تنظیمی ہی تھی تو یہ غلط نہ ہوگا۔ بے تنظیمی ہی کے باعث بعض ایسے واقعات رونما ہوئے، جن کے لیے اخلاقاً یا قانوناً یا شرعاً کوئی وجہِ جواز پیش نہیں کی جاسکتی۔ مثلاً دہلی یا جھانسی یا کانپور یا بعض ایسے ہی دوسرے مقامات پر انگریزوں کا قتل یا بعد ہلاکی دستار کر ان پر قاتلانہ حملے، ذمہ دار آدمی نہ خود ایسے افعال کے مرتکب ہوسکتے تھے اور نہ کسی دوسرے کو ارتکاب کا موقع دینے کے لیے تیار ہوسکتے تھے ... ... " (۱۸۵۷ء ص ۳۵۵)

اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ مہر صاحب کے اس بیان میں بھی میاں صاحب کی بہت سی باتوں کی تصدیق و تائید موجود ہے۔ ؎

؎ فتوائے جہاد پر دستخط نہ کرنے کے متعلق مولانا نذیر احمد رحمانی رحمہ اللہ کا پورا بیان آپ نے پڑھ لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ حلقۂ دیوبند کے بڑے بڑے تھے بزرگوں کو دوسرے ←

تفریع د کے متعلق:

بہ سچ پوچھیے تو یہی وہ توہین آمیز الزام ہے جو کم از کم میرے لیے تو بڑا دردانگیز اور

← حلقے کے ناکردہ گناہ افراد پر تہمت لگانے اور اپنے سر بڑے بڑے ناکردہ کارناموں کا سہرا باندھنے کا جو ملکہ تھا اور اس مقصد کے لیے واقعات تصنیف کرنے کی جو مہارت تھی میاں صاحب کا یہ معاملہ اسی کا شکار ہوگیا۔ یعنی فتوائے جہاد پر میاں صاحب کے دستخط نہ کرنے کا ڈھول اس قوت سے پیٹا گیا کہ اپنے اور بیگانے سبھی نے اس کو ایک مسلمہ حقیقت سمجھا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ میاں صاحب نے فتوائے جہاد پر دستخط کیا تھا، اور صرف دستخط ہی نہیں کیا تھا بلکہ سب سے پہلا تائیدی دستخط میاں صاحب ہی کا تھا۔ یہ فتویٰ سب سے پہلے الظفر دہلی میں مشتہر کیا گیا۔ پھر اس کی نقل صادق الاخبار لاہور میں شائع ہوئی۔ اصل فتویٰ کا فوٹو ڈاکٹر اظہر نے اپنی کتاب "دستنتر دہلی" کے اخیر میں شامل کر دیا ہے۔ اسے کتاب "۱۸۵۷ء اخبار اور دستاویزیں" ص ۱۹۹ میں بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ نیز یہ "لوائے آزادی" مرتبہ انجمن اسلام بمبئی کے مقدمہ ص ۸ میں بھی موجود ہے اور اس کی نقل مولانا محمد میاں صاحب نے اپنی کتاب "علمائے حق کا شاندار ماضی" میں شامل کی ہے، اس فتویٰ میں اصل مجیب کی حیثیت سے شیخ نور جمال کا دستخط ہے اور اس کے بعد پہلا تائیدی دستخط میاں نذیر حسین صاحب کا ہے۔ (دیکھیے علماء حق کا شاندار ماضی ص ۱۹۸، ۱۹۹)

فتوائے جہاد پر میاں صاحب کا دستخط ایک ایسی ٹھوس حقیقت ہے۔ جو پروفیسر ایوب قادری مرحوم جیسے متعصب اور غلو پسند دیوبندی کو بھی تسلیم کرنی پڑی ←

تکلیف دہ ثابت ہوا ہے۔ میں نے جس وقت ان فقروں کو پڑھا کہ "سرخیلِ علماء
مولانا سید نذیر حسین کے وقت سے لے کر اب تک آپ کے علماء و مشائخ نے سیاست

← کیونکہ اصل مآخذ پر بہر حال ان کی نظر تھی۔ مصنف "الحیاۃ بعد المماۃ" نے جو کچھ لکھا ہے یا تو مذکورہ پروپیگنڈے کا شکار ہو کر اسی سنائی کے طور پر لکھا ہے۔ یا ۱۸۵۷ء کے بعد کے سنگین حالات کے پیش نظر قصداً لیپا پوتی کی ہے۔

البتہ یہاں یہ خلجان ضرور پیدا ہو سکتا ہے کہ جب بغاوت کی کیفیت وہی تھی جس کی تفصیل پچھلے صفحات میں گزر چکی ہے اور جس کو اسلامی جہاد کے بجائے ہنگامہ اور بلوہ کہنا زیادہ صحیح ہے تو پھر میاں صاحبؒ نے فتوائے جہاد پر دستخط کیسے کر دیا۔؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اصل کتاب میں ۱۸۵۷ء کے حالات کے متعلق ایک خصوصی نکتہ بیان سے رہ گیا۔ در اصل ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء کو جب میرٹھ سے بغاوت شروع ہوئی اور باغیوں نے دہلی پر قبضہ کیا تو حالات کا نقشہ ٹھیک وہی تھا جسے مولانا رحمانیؒ نے متعدد حوالوں سے نقل کیا ہے اور جسے اسلامی جہاد کے احکام سے واقف کوئی بھی شخص اسلامی جہاد تسلیم نہیں کر سکتا۔ لیکن جب ۲ر جولائی ۱۸۵۷ء کو جنرل بخت خاں نے بریلی سے آکر دہلی کا انتظام سنبھالا تو حالات بدل گئے۔ اس نے ایک طرف بادشاہ کا اقتدار بحال کیا۔ دوسری طرف شہر دہلی کو ابتری اور افراتفری سے نجات دلا کر وہاں کا نظم و نسق درست کیا اور تیسری طرف فوج کو اس کے صحیح پیشہ ورانہ دائرے میں رکھنے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے جب ایک شخص اس طرح کے عزائم اور پروگراموں کے ساتھ کام کرنے اور غیر مسلم قبضہ گیروں سے ملک یا اس کے کسی حصہ کو آزاد کر کے وہاں مسلم اقتدار قائم کرنے اٹھے تو اسے یقیناً فتوائے جہاد ←

اور عملی جہاد میں کوئی حصہ نہیں لیا"، تو درد و کرب سے تلملا اٹھا اور کئی دنوں تک اس کی چبھن محسوس کرتا رہا۔ بالآخر اسی اضطراب اور بے چینی کے عالم میں فیصلہ کیا کہ اس ظلم اور بے انصافی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنی ہے، خواہ انجام کچھ بھی ہو۔ تکلیف کا احساس اس وقت اور بڑھ جاتا ہے جب یہ دیکھتا ہوں کہ علماء کے جمود و خمود کی ذمہ داری "سرخیلِ علماء مولانا سید نذیر حسین" کے سر ڈالی جارہی ہے حالانکہ تاریخ اس الزام کا قطعاً ساتھ نہیں دیتی۔

یہ سمجھنا یقیناً غلط ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں میاں صاحب شامل نہیں ہوئے، اس کا یہ اثر ہوا کہ اسی وقت سے علماء اہلحدیث سیاسیات سے الگ ہو گئے، اور ایسا الگ ہوئے کہ کبھی کسی نے کوئی حصہ نہیں لیا"۔

میں آگے چل کر ان شاء اللہ اس کو ثابت کروں گا کہ تاریخِ آزادی کا کوئی دور ایسا نہیں ہے، جس میں اہلحدیث علماء اور عوام نے حصہ نہ لیا ہو۔ ؎

؎ دیا جا سکتا ہے۔ اور زیرِ بحث فتوائے جہاد ایسے ہی موقع پر یعنی جنرل بخت کے دہلی آنے کے بعد صادر ہوا تھا، پس میاں صاحب کا دستخط برمحل اور صحیح تھا۔ (مں مد)

؎ یہ عجیب بات ہے کہ برصغیر ہند و پاک کی گزشتہ دو صدیوں کی تاریخ پر جب کبھی انگریز یا ہندو مورخین نے قلم اٹھایا تو وہ اہلحدیث کو شرحِ صدر کے ساتھ خراجِ تحسین پیش کیے بغیر نہ رہ سکے۔ تفصیلات کے لیے آپ مشہور ہندو دانشور ڈاکٹر تارا چند کے رشحاتِ قلم "وہابی موومنٹ" کا مطالعہ کر سکتے ہیں کہ ان غیر مسلموں نے کس کشادہ دلی کے ساتھ اہلحدیث اور ان کے ملی کارناموں کا تذکرہ کیا ہے۔ بلکہ ڈاکٹر تارا چند نے ←

١٨٥٧ء کی تحریک آزادی میں بھی اہلحدیث علماء نے حصہ لیا ہے۔

سب سے پہلے اسی ١٨٥٧ء ہی کی تحریک کو لے لیجیے۔ مولانا مہر صاحب اس کی نسبت لکھتے ہیں۔

"سید صاحب کے خلیفہ اور ان کی جماعت مجاہدین کے امیر مولانا عنایت علی صادقپوری بھی اس تحریک کے ساتھ تھے۔ بلکہ انگریزوں کا خیال ہے کہ مردان میں رجمنٹ ٥٥ کی بغاوت مولانا عنایت علی ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ اور خود انھوں نے نارنجی (علاقہ سرحد) میں محاذ قائم کرکے جنگ شروع کر دی تھی۔" (١٨٥٧ء ص ٣٥٥)

مولانا عنایت علی رح کا اہلحدیث ہونا ہم پہلے ثابت کر چکے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہے کہ بنگال اور بہار کے اہلحدیث بڑی تعداد میں ان کے ساتھ تھے، اور ہر طرح ان کے معاون و مددگار رہے۔

- تو یہاں تک لکھا ہے کہ برصغیر میں تاریخ صرف اور صرف اہلحدیثوں کی ہے۔ یہی وہ جماعت ہے جس نے کبھی انگریز سے مصالحت یا مفاہمت نہیں کی۔ ملک کی اس جماعت نے آزادی پر پانچ لاکھ انسانوں کی قربانی دی۔ مگر اس کے برعکس ہمارے مسلم (دیوبندی وغیرہ) اکابر کے سینے ہیں جو اس قدر تنگ ہیں کہ کھلے اور روشن حقائق کو بھی مسخ کرنے پر تلے بیٹھے ہیں اللہ رحم کرے۔ (ص ٨٠)

مہر صاحب نے مقدمۂ انبالہ (جس کی تفصیلات اپنے موقع پر آئندہ پیش کی جائیں گی) کے ملزمین کے ذیل میں مولوی جعفر صاحب تھانیسری (اہلحدیث) کا نام بھی ذکر کیا ہے۔ اور ان کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے:

"بعض بیانات کے مطابق یہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں بھی چند ساتھیوں کو لے کر انگریزوں کے خلاف لڑنے کی غرض سے دہلی گئے تھے۔"

(سرگزشت مجاہدین ص ۳۸۵)

مولانا سید جلال الدین احمد جعفری بناری ابن مولوی سید عبد الاعلیٰ ایک ممتاز اہلحدیث عالم گزرے ہیں۔ ان کے حالات میں مولوی ابو یحییٰ امام خاں صاحب نوشہروی لکھتے ہیں:

اکثر علوم متعارفہ اپنے والد ماجد اور مولوی احمد اللہ صاحب محدث (بناری) سے پڑھ کر کانپور اور دہلی تشریف لے گئے۔ دہلی میں مولوی محمد اسماعیل صاحب سے تکمیل فرمائی اور حدیث کی تکمیل مولانا عبد الحق محدث (بناری) سے۔ عمل بالحدیث و اتباعِ سنت کا ولولہ بھی انہی بزرگ کے فیض صحبت سے پیدا ہوا۔ چنانچہ مولوی خرم علی صاحب سے مسئلہ فاتحہ خلف الامام میں آپ کا مناظرہ مشہور ہے۔ اسی مبحث پر آپ نے بزبانِ فارسی رسالہ "فاتحۃ الصواب فی قراءۃ فاتحۃ الکتاب" محرم ۱۲۵۶ھ میں تصنیف فرمایا۔ پھر اس کا خلاصہ بزبانِ اردو بنام "زبدۃ الالباب" فرمایا، جو مطبع سید المطابع میں طبع ہو کر شائع ہو چکا ہے، آپ بے حد ذہین تھے، حفظ قرآن کا شوق ہوا تو رمضان کی پہلی کو التزام کیا، دن میں ایک پارہ حفظ کر لیتے اور شب کو تراویح میں سنا دیتے۔

خاندان میں مہر فاطمی کا رواج آپ ہی کی سعی سے ہوا۔۔۔ آپ کی
تصنیفات میں علاوہ فاتحۃ الصواب و زبدۃ الالباب، حسب ذیل کتابوں کا
بھی پتہ لگتا ہے:

زبدۃ القوانین، انبساط عبارۃ الکافیہ، فرہنگ اخوان الصفا
قواعد اردو وغیرہ۔" (تراجم علماء حدیث ہند ج ۱ ص ۳۴۵)

اس اقتباس سے جب یہ معلوم ہو گیا کہ سید صاحب موصوف اہل حدیث تھے تو اب
اس کے ساتھ ایک دوسرا اقتباس پڑھیے۔

جناب مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی اکبرآبادی موصوف کی شان میں لکھتے ہیں:

"اپنے والد اور مولوی احمد اللہ بنارسی کے شاگرد تھے۔ سند حدیث
مولوی عبد الحق بنارسی سے لی۔ عامل بالحدیث و متبع سنت نبوی و
قانع و متقی تھے۔

"جید الحافظ آنچناں بود کہ در یک روز یک پارہ کلام مجید حفظ نمود، و
وقت شب بماہ رمضان تراویح می خواند"

آپ نے بھی ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں حصہ لیا مگر حکومت کے شکنجہ سے
بچ گئے۔ زبدۃ القوانین (صرف و نحو) و شرح کافیہ یادگار ہے،
بنارس کالج میں پہلے مدرس تھے۔ ۱۲۷۹ھ میں بعمر ۵۸ سال وفات پائی"

(ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص ۱۳۷، ۱۳۸)

یہ بات ہم شروع ہی میں عرض کر چکے ہیں کہ حادثہ بالاکوٹ کے بعد تحریک جہاد
کی قیادت اہلحدیث علماء کے ہاتھوں میں آئی۔ اس لیے اہلحدیث تو بڑی تعداد میں سرحد پار

له پیچھے گزر چکا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے مجاہد آزادی مولوی لیاقت علی الہ آبادی بھی اہلحدیث تھے۔

کے مجاہدین اور ان کے معاونین میں شامل تھے۔ اور ان کے متعلق مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کا یہ بیان آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ "مجاہدین اور ان کے معاونین ایک دینی نظام سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اس قومی لڑائی میں غیر جانبدار رہے۔" تاہم ایسا بھی نہیں ہے کہ آزادی کی یہ جدوجہد اہلحدیث افراد کی شرکت سے یکسر خالی ہو اور انھوں نے اس میں بالکل ہی حصہ نہ لیا ہو۔ [1]

بعد کی سیاسی تحریکات اور عملی جہاد میں علماء اہلحدیث کا حصہ

۱۸۵۷ء کے بعد سے ۱۹۴۷ء تک ملک کی کوئی بھی سیاسی تحریک ایسی نہیں ہے جس میں اہلحدیث افراد نے حصہ نہ لیا ہو۔ کانگریس، تحریکِ خلافت، تحریکِ احرار، مسلم لیگ (جب اس نے انگریزی مخالفت کا نعرہ بلند کیا۔) جمعیۃ علماء ہند، جمعیۃ علماء اسلام۔ ان تمام تحریکوں اور جمعیتوں میں اہلحدیث شریک رہے ہیں۔

---

[1] پیچھے ص ۲۹۴ کے حاشیہ پر ہم یہ بات بتا چکے ہیں میاں صاحب نے ۱۸۵۷ء کے فتوائے جہاد پر دستخط کیا تھا میاں صاحب کے علاوہ تائیدی دستخطوں میں ایک دستخط ایک اور سرکردہ اہلحدیث عالم مولانا عبدالرب دہلوی کا بھی ہے لیکن موصوف کو چونکہ میاں صاحب جیسی شہرت واہمیت حاصل نہ تھی اس لیے غالباً ہمارے مہربانوں نے میاں صاحب کی طرح ان کی کردارکشی کرنے کے بجائے ان کے ذکر ہی کو گول کر دینا مفید خیال کیا۔ غالب امکان ہے کہ اس طرح مزید بہت سے اہلحدیث افراد کے کارناموں کو پردۂ گمنامی میں ڈال دیا گیا ہے۔ (ص۔ ر)

مشائخ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالقادر قصوری، مولانا محمد علی قصوری، مولانا محی الدین قصوری، مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا اسمٰعیل غزنوی، مولانا محمد علی لکھوی، مولانا عبیداللہ احرار، مولانا ابوالوفا ثناءاللہ، مولانا ابراہیم سیالکوٹی، مولانا محمد اسمٰعیل گوجرانوالہ، مولانا ابوالقاسم بنارسی، مولانا ابوالقاسم محمد علی مئو، مولانا محمد نعمان مئو، مولانا محمد احمد مدرس مئو، مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری، مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی، مولانا محمد ادریس خاں بدایونی، مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی، مولانا عبدالرحیم عرف مولانا محمد بشیر، صوفی ولی محمد فتوحی والا۔ دہلی کے پنجابی اہلحدیث، کلکتہ میں کپڑے اور لوہے کے تاجر، مدراس میں کاکا عمر، بنگال میں مولانا عبداللہ الکافی، مولانا عبداللہ الباقی، مولانا اکرم خاں، قاضی کیس کے ملزمین، سازش کے متعدد مقدمات کے ملزمین۔ بنگال کے مولانا احمداللہ خاں بانی مدرسہ شمس الہدیٰ دلال پور، علم الدین تعلقدار، غازی شہاب الدین، دین محمد منڈل۔ وغیرہ وغیرہ ایک طویل فہرست ہے ایسے علماء اور افراد اہلحدیث کی جن کا سیاست اور عملی جہاد میں حصہ لینا ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے اور یہ ضمنی بحث (جو میاں صاحب کی ذات سے متعلق چل پڑی ہے۔) ختم ہو جانے کے بعد ہم انشاءاللہ ان تمام حضرات کی سیاسی اور جہادی خدمات کی تفصیلات، آپ کے سامنے پیش کریں گے۔

ایک معذرت اور اس کا جواب:

ہم سمجھتے ہیں کہ اس دعوے کو نباہنے کے لیے کہ سیاست اور عملی جہاد میں اہلحدیث علماء و مشائخ نے کوئی حصہ نہیں لیا۔ زیادہ سے زیادہ جو معذرت پیش کی جا سکتی ہے وہ یہی کہ افراد کی خدمات کا انکار نہیں ہے۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ جماعتی حیثیت

سے اہلحدیث جماعت نے سیاست میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ افراد کی خدمات جماعت کی خدمات شمار نہیں کی جاسکتیں۔

تو گزارش یہ ہے کہ یہ منطق صرف اہلحدیثوں ہی کے حق میں کیوں استعمال کی جاتی ہے؟ اس منطق کی رو سے تو ہندوستان کی مذہبی جماعتوں اور فرقوں میں کوئی فرقہ ایسا نہیں ہے، جس کی بابت یہ دعویٰ کیا جاسکے کہ اس نے فرقے یا جماعت کی حیثیت سے، سیاست میں حصہ لیا ہے؟۔ اس لحاظ سے تو ہر مسلمان کو جو کسی فرقے سے تعلق رکھتا ہو یہ طعنہ دیا جاسکتا ہے کہ آپ کے علماء و مشائخ نے سیاست اور عملی جہاد میں کوئی حصہ نہیں لیا۔" کیا جمعیۃ علماء ہند پر دیوبندی فرقے کے حضرات کا غلبہ ہے تو اس کی بنا پر یہ کہا جائے گا کہ یہ جمعیۃ دیوبندی فرقے کی فرقہ وارانہ جمعیت ہے؟ جمعیۃ علماء ہند کا دستورِ اساسی شائع شدہ موجود ہے ملاحظہ کیجیے، کیا اس کی رکنیت کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ دیوبندی عقائد کو ماننا ہوگا؟۔ حقیقت یہ ہے کہ جمعیۃ کی آبرو اور اس کی ساکھ اس کی عمومی حیثیت ہی کی بنا پر قائم ہے، جس دن یہ پردہ ہٹ جائے گا وہ اس کی موت کا دن ہوگا۔ اگر جماعتی حیثیت سے کام کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس جماعت کے تمام افراد یا اکثر افراد اس کام میں شریک ہوں تو اس معیار کے لحاظ سے بھی سیاست میں حصہ لینے والے دیوبندی حضرات کی بابت یہ نہیں کہا جاسکتا کہ انھوں نے "جماعتی حیثیت" سے حصہ لیا ہے۔ اس لیے کہ دیوبندیوں میں بھی ہمیشہ سے ایک بڑا طبقہ ایسا رہا ہے جس نے انگریزوں کے خلاف کسی سیاسی تحریک میں کوئی حصہ نہیں لیا، بلکہ یہ کہیے کہ تحریکِ حریت کی انھوں نے ہمیشہ مخالفت کی ہے، یہ طبقہ بھی وہ ہے جس کا سلسلۂ تلمذ انھیں شیوخ و اکابر کے ساتھ وابستہ ہے جن کے سلسلۂ تلمذ میں وہ حضرات ہیں جنھوں نے سیاست میں حصہ لیا۔ مولانا سید محمد میاں تک

کو اس کا اعتراف ہے، لکھتے ہیں :

"علمار دیوبند کے بھی وہ چند افراد جو ہمیشہ سے تحریک حریت کے مخالف رہے تھے اور اس وقت سرکاری مدارس کے ملازم یا پنشنر تھے اور ایک وہ بزرگ جو پاکستانی تحریک کو اسلامی تحریک سمجھ بیٹھے تھے۔ اور بدقسمتی سے نظام حیدر آباد کے ساتھ خصوصی تعلق نے بیاسی دریوزہ گروں اور ریاست کے وظیفہ خواروں کو ان کے معتمد حواریین میں داخل کر دیا تھا، جمعیۃ علمار اسلام کلکتہ میں داخل ہو گئے . . . ."

(علمار حق حصہ دوم ص ۲۳۶)

اس اقتباس میں "وہ بزرگ . . . . . ." سے مراد مولانا شبیر احمد عثمانی ہیں، یہ صرف چند افراد تھے یا ایک بڑی تعداد ان کے ساتھ تھی، اس کا فیصلہ ۴۶ء سے پہلے کے الکشن میں ہو چکا۔

"جمعیۃ علمار اسلام"، جمعیۃ علمار ہند کے مقابلے میں قائم کی گئی تھی۔ اس کا اجلاس ۲۶ تا ۲۹ ر اکتوبر ۱۹۴۵ء محمد علی پارک کلکتہ میں منعقد ہوا تھا۔ اسی اجلاس میں عثمانی صاحب موصوف کو اس جمعیۃ کا صدر منتخب کیا گیا تھا۔

عجیب انصاف :

یہ کیسا عجیب انصاف ہے کہ جب مطعون کرنا ہوتا ہے، تب تو میاں صاحب کے بعض واقعات اور مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم کے خیالات اور رجحانات کو جماعتی فیصلے کی حیثیت دے دی جاتی ہے، اور اس بہانے سے ۱۸۵۷ء سے لے کر آج تک کی

پوری جماعت اہلحدیث" اور اس کے تمام علماء و مشائخ کو دکسی تخصیص و استثنا کے بغیر) بدنام کیا جاتا ہے، لیکن اس کے برخلاف جب اہلحدیث کے ان علماء اور عوام کی ایک طویل فہرست پیش کی جاتی ہے جنھوں نے انگریز کی مخالفت میں اپنی جانیں قربان کیں، پھانسیوں پر لٹکائے گئے، کالا پانی بھیجے گئے، جیل کی سزائیں کاٹیں، جن کی جائدادیں ضبط ہوئیں، بارہ بارہ گھنٹے تک بھوکا پیاسا رکھ کران کو مسلسل بیٹا گیا۔ بیتوں سے مار مار کران کی کھال اُدھیڑی گئی ——— ان تمام واقعات کو سن کر بڑی بے نیازی کے ساتھ کہدیا جاتا ہے کہ یہ تو افراد کے کارنامے ہیں۔ ان کو جماعت کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔

ہم جاننا چاہتے ہیں کہ "جماعت" کی وہ کونسی ایسی جامع مانع تعریف ہے؟ اور وہ کیا معیار ہے جس کی رو سے مولانا بٹالوی وغیرہ کی باتیں تو "جماعت" کی طرف منسوب کی جاسکتی ہیں، مگر دوسرے سیکڑوں اہلحدیث جاں نثاروں کی سیاسی خدمات اور مجاہدانہ قربانیوں کو "جماعت" کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا؟ پھر اسی معیار کی رو سے ہمیں یہ بھی بتایا جائے کہ مسلمانوں کے دوسرے فرقوں کے علماء نے سیاست میں جو حصہ لیا ان کی نسبت تو یہ کہنا صحیح ہے کہ "جماعتی حیثیت" سے حصہ لیا ہے، اس لیے وہ قابلِ طعن نہیں۔ لیکن اہلحدیث کی نسبت یہ کہنا صحیح نہیں ہے اس لیے وہ قابل طعن اور مستحقِ ملامت ہیں۔

دوسرا طعنہ اور اس کا جواب:

دوسری بات جس کا طعنہ اہلحدیثوں کو دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ:

"۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مولانا نے ایک میم کی جان بچائی تھی اور اس کے معاوضہ میں ان کو کئی گاؤں انعام ملا۔"

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے ہم ناظرین کو یہ بتائیں کہ اصل واقعہ کیا ہے، تاکہ اندازہ ہو سکے کہ میاں صاحبؒ نے کس جذبے کے ماتحت اس میم کی جان بچائی تھی۔ یہ واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ خود میاں صاحب کی زبانی "الحیاۃ بعد المماۃ" میں منقول ہے۔ میاں صاحب کا بیان یہ ہے کہ:

"اس زمانے میں ایک دن نماز عصر کے بعد شہر سے باہر چلا گیا، ملا محمد صدیق پشاوری جو اس وقت مجھ سے اصول فقہ پڑھتا تھا ساتھ تھا۔ مجھ کو کسی آدمی کے کراہنے کی آواز معلوم ہوئی۔ میں اس آواز کی جانب بڑھا۔ جب قریب پہنچا تو دیکھا کہ ایک میم مجروح رو رہی ہے۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر کہنے لگی کہ خدا کے واسطے میری جان مت مارو۔ میں نے اس کو دلاسا دیا اور کہا کہ ہم مسلمان ہیں، ہمارے مذہب میں لڑائی کے وقت بھی کسی غنیم کی عورت اور بچوں کی جان مارنا تکلیف دینی حرام ہے، تم اپنی جان سے پوری طرح اطمینان رکھو۔ اور اگر تمھاری مرضی ہو تو ہم تم کو اپنے گھر لے چلیں، اور تمھارے زخم کا علاج اور تیمارداری کریں۔ مگر چونکہ وہ بہت ہی ڈری ہوئی تھی۔ کہنے لگی کہ اول تو ہم اپنے پاؤں سے چل نہیں سکتے۔ اور تم لوگ اگر اٹھا کر لے بھی چلو تو باغیوں کی گولی سے بچ نہیں سکتے۔ میں نے کہا کہ اچھا ہم لوگ تم سے کچھ دور پر ٹھہرتے ہیں رات کو اندھیرے میں تم کو اٹھا کر لے چلیں گے۔ آخر یہی ہوا کہ اندھیرے

میں ہم اور ملا صدیق اٹھا کر اس کو ایسے رستہ سے لائے کہ کسی فرد بشر کو اس کی خبر بھی نہ ہوئی اور گھر میں لے جا کر شریف حسین کی ماں سے کہا کہ یہ نہایت مظلوم ہے، اس کی بہت دلجوئی اور خدمت کرنی چاہیئے کہ موجب خوشنودیٔ خدا و رسول ہے۔ اس میم کو میں نے باغیوں کے باہر رہنے کی خبر بھی نہ دی کیونکہ خبر ہو جانے پر اس کے وہ ساڑھے تین مہینے نہایت ہی تشویش اور خوف کی حالت میں بسر ہوتے۔ فرماتے کہ موسم سخت گرمی کا تھا اور وہ دن رات ایک کوٹھری میں بند رہتی۔ ہر چند میری اہلیہ اس کو کہتیں کہ رات کو انگنائی میں آ کر بیٹھو مگر وہ ڈر سے کوٹھری کے باہر نہ آتی، اور اسی گرمی اور مچھروں کی تکلیف میں رات بھر اٹھ اٹھ کے دعا کرتی کہ اے اللہ میرا قصور معاف کر۔" (ص ۷۷، ۷۸)

اس واقعہ سے بھی میاں صاحبؒ کو بقول مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی انگریز کا وفادار ثابت کرنے کی "سعیٔ لاحاصل" کی گئی ہے۔ واقعہ کی تفصیل خود میاں صاحب کی زبانی آپ کے سامنے موجود ہے، پڑھیے اور بار بار پڑھیے۔ اور انصاف سے بتایئے کہ اس بیان میں انسانی ہمدردی اور اسلامی شریعت کی پابندی کے جذبے کے سوا کہیں کسی نوع سے بھی اس کی گنجائش نکلتی ہے کہ ہم اس کو میاں صاحب کی کسی اخلاقی کمزوری پر محمول کریں؟ ایک مظلوم عورت جو زخموں سے چور ہو کر کراہ رہی ہو، درد و کرب سے بے چین ہو کر رو رہی ہو۔ اس قدر سہمی ہوئی ہو کہ ایک مسلمان کو اپنی طرف آتا دیکھ کر چلا اٹھے کہ "خدا کے واسطے میری جان مت مارو"۔ ایسی حالت میں اس کے ساتھ ایک رحم دل دیندار مسلمان کا برتاؤ اس کے سوا اور کیا ہونا چاہیے تھا جو میاں صاحبؒ نے

اس وقت کیا ؟ اپنے گھر کی مستورات کی سپردگی میں دیتے ہوئے میاں صاحب نے فرمایا تو یہ فرمایا کہ "یہ نہایت مظلوم ہے اس کی بہت دلجوئی اور خدمت کرنی چاہیے کہ موجب خوشنودی خدا و رسول ہے ،، یہ نہیں فرمایا کہ موجب خوشنودی انگریز ہے ۔ اس کے صلے میں ہم کو وفاداری کے تمغے اور انعامات ملیں گے ۔ الحاصل میاں صاحب نے اس وقت اس میم کے ساتھ جو کچھ ہمدردی فرمائی اس کا محرک صرف یہ تھا کہ وہ مظلوم تھی ۔ یہ نہیں کہ وہ انگریز تھی ۔ میاں صاحب امیروں سے ملنا ناپسند کرتے تھے ۔ دیکھو مکاتیب نذیریہ ص ۷، تو کسی رقم کی لالچ وہ کیا کرتے ۔

انعام کی توقع سے زیادہ اپنی جان کا خطرہ تھا :

اس وقت انگریزوں کے خلاف جو عام ہیجانی کیفیت برپا تھی اس کے لحاظ سے انگریز یا ان کی عورتوں اور بچوں کے ساتھ کسی ہمدردانہ سلوک کے صلے میں انعام پانے کی توقع قائم کرنے سے کہیں زیادہ خطرہ خود اپنی جان اور مال کی ہلاکت کا تھا ۔ اس قسم کا شبہ بھی اگر کسی شخص کے متعلق ہو جاتا تھا تو انقلابی اس کو قتل کر دیتے تھے اور اس کا گھر بار لوٹ لیتے تھے ۔[1] مولانا مہر لکھتے ہیں ۔

"البتہ انگریزوں سے تعلق کا الزام بہت خطرناک تھا جس پر یہ الزام لگ جاتا اسے پناہ نہ ملتی ۔ حکیم احسن اللہ خاں پر شروع ہی سے یہ الزام تھا اور اس کا گھر لٹ گیا ، ایک مرتبہ جان مشکل سے بچی ۔ بعض بدمعاشوں نے

---

[1] ۱۸۵۷ء کا روزنامچہ ملاحظہ کیجیے ۔

بے گناہوں پر یہ الزام لگا کر ان کے گھر یا دوکانیں لٹوا دیں۔ کشمیری اور موری دروازے کے نان بائیوں کو اس الزام میں قتل کر دیا گیا کہ وہ ڈبل روٹیاں تیار کر کے انگریزوں کو بھیجتے ہیں۔" (۱۸۵۷ء ص ۱۲۰)

مہر صاحب ہی نے نواب حامد علی خاں (جو اعتماد الدولہ میر فضل علی خاں نائب السلطنت اودھ کے بھانجے اور داماد تھے) کی نسبت لکھا ہے کہ:

"انھوں نے چھاؤنی کے جرنیل کی بیٹی اور ایک صاحب کی بیوی کو گھر میں چھپایا تھا۔ یہ راز فاش ہو گیا۔ لوگ ہجوم کر کے آئے، اور ان کا گھر لوٹ لیا۔ وہ شہزادہ ابوبکر کی پناہ لے کر بچے۔"

(۱۸۵۷ء ص ۱۷۰)

ان حالات کے باوجود میاں صاحب اور ان کے ساتھیوں نے اس خطرے کو اپنے لیے مول لیا۔ یہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ ان حضرات کو شریعت کی پابندی کے مقابلے میں خطرات کی پرواہ نہیں تھی۔

واقعہ کی بابت ایک دوسری روایت:

اس واقعہ کی تفصیلات کے بارے میں واقعہ نگاروں کے بیان میں کچھ اختلاف ہے، مثلاً بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ مولانا غلام رسول صاحب (قلعہ والے) اور مولانا عبداللہ صاحب غزنویؒ نے اس عورت کی جان بچائی تھی۔ بعض نے لکھا ہے کہ مولوی عبدالقادر صاحب (جو حضرت میاں صاحب کے سالے اور ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے خسر تھے) اس میم کو اٹھا کر اپنے گھر لے گئے تھے۔ اور علاج معالجہ کیا تھا۔ بعض نے لکھا ہے کہ ڈپٹی

نذیر احمد صاحب اس کو اُٹھوا کر لائے تھے، اور میاں صاحب کے گھر پہنچوا دیا تھا۔

بات یہ ہے کہ اُس زمانے میں میاں صاحب اور مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم دونوں پنجابی کٹرہ میں آباد تھے، ان کے گھر محلہ کی مسجد (اورنگ آبادی) سے بالکل ملے ہوئے تھے۔ اسی مسجد میں مولانا غلام رسول صاحب اور مولانا عبداللہ صاحب غزنوی مقیم تھے اور میاں صاحب سے حدیث پڑھتے تھے۔ قرین قیاس یہی ہے کہ یہ سب حضرات عصر کی نماز پڑھ کر ساتھ ہی نکلے اور راستے میں اتفاقاً وہ صورت پیش آئی، اس عورت کو اٹھا کر لانے میں سب شریک تھے۔ مولوی عبدالقادر صاحب میاں صاحب کے ایک خاص عزیز تھے اس لیے بہت ممکن ہے کہ دونوں صاحبان ایک ہی مکان میں رہتے بھی رہے ہوں۔ واقعہ ایک ہی ہے کیوں کہ اس میم کا جو نام الحیاۃ بعد المماۃ میں مذکور ہے وہی نام مولانا راشد الخیری نے مولوی عبدالقادر صاحب کے واقعہ میں بھی لکھا ہے۔ اور وہی نام ڈپٹی صاحب کے واقعہ میں بھی بتایا گیا ہے۔

" الحیاۃ بعد المماۃ " کے مطالعہ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ میم جب تک میاں صاحب کے گھر میں رہی، انقلابیوں کو اس کی کچھ بھی خبر نہیں ہوئی، لیکن مولانا راشد الخیری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی عبدالقادر صاحب جب اس عورت کو لے کر گھر میں آئے تو چند ہی گھنٹوں کے بعد انقلابیوں نے ان کے گھر پر دھاوا بول دیا۔ چنانچہ مصور غم مولانا راشد الخیری لکھتے ہیں۔

" رات کے ابتدائی حصہ میں جب دنیائے اسلام کا سر خدائے عزوجل کے حضور میں جھکا ہوا تھا تو مولوی عبدالقادر صاحب ایک انگریز عورت کو کندھے پر لیے گھر میں داخل ہوئے زخمی خاتون سسک رہی تھی، آنکھیں

بند تھیں، اور جسم کے اکثر حصوں سے خون نکل رہا تھا۔ گھر کی عورتیں اپنے بدنصیب مہمان کی تیمارداری میں مصروف ہو گئیں۔ زخموں کو دھویا، بدن صاف کیا، پانی اور شربت حلق میں ٹپکا رہے تھے۔ دو بجے دروازے پر "دین دین" کی آوازیں بلند ہوئیں.... غریب عورتوں کی جان نکل گئی۔ بھولے بھالے بچوں کے ہوش جاتے رہے۔ لیکن مولوی صاحب مرحوم نے استقلال کو ہاتھ سے نہ دیا۔ باغیوں نے دروازے پر آفت مچا دی اور "دین دین" کے نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ سوچتے سوچتے مولوی صاحب کی سمجھ میں ایک تدبیر آ گئی، اور وہ یہ کہ مہمان کو اوپلوں کی کوٹھری میں لٹا کر اوپر سے اوپلے چن کر دروازہ کھول دیا۔ رات کے تین بج رہے ہیں، اور چودھویں کا چاند آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا ہے کہ پندرہ بیس آدمی مولوی صاحب کے گھر کی تلاشی لے رہے ہیں، تلواریں اور بلم صاحب خانہ کے سر پر چمک رہے ہیں، اور دشمن عورتوں کے سامنے ناشائستہ الفاظ استعمال کر رہے ہیں، مولانا خاموش ہیں۔ عورتیں اللہ اللہ کر رہی ہیں، بچے رو رہے ہیں، اور لڑکے حسرت سے باغیوں کا منہ تک رہے ہیں۔ آخر وہ وقت بھی آ گیا کہ اوپلوں کی کوٹھری کھلی اور وہ جفاکار اس میں داخل ہوئے۔ آج کے مسلمان اس کو اتفاق محض سے تعبیر کریں یا وقت سے، میں تو یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ بلم حقیقی ہر نیک کام میں اپنے بندوں پر رحمت کے پھول برسا کر دنیا کو دکھا دیتا ہے کہ کس طرح اس کا کرم شامل حال ہوتا ہے۔ خدا کا فضل ایک نہیں پندرہ بیس آنکھوں پر

بے پردہ بن کر پڑا اور چاروں طرف دیکھ بھال کر باغی چھپتے چھپتے .... واپس ہوئے ۔ " (دلی کی آخری بہار ص ۴۶، ۴۷)

اس میم کا تعارف :

شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے سوانح نگار سید افتخار علی بلگرامی لکھتے ہیں

" میم نوجوان لڑکی تھی کوئی ۲۰، ۲۲ برس کی عمر ہو گی، مولانا نذیر احمد صاحب (ڈپٹی صاحب) یا ان کے ہم سن لڑکوں کو اس کے پاس جانے کی اجازت نہ تھی صرف رازداری کا حکم تھا۔ مولوی عبدالقادر صاحب جو حکیم بھی تھے چھپکے چھپکے اس کے زخموں کا علاج کرتے رہے۔ بڑا سخت زخم پیٹ کا تھا۔ نہیں معلوم سنگین گھسیڑ دی تھی یا اچٹتی ہوئی گولی لگی تھی، اوپر کی جلد پھٹ گئی تھی۔ خون کی وجہ سے خوب تمیز نہیں ہوتی تھی۔ یہ عورت مسٹر لی سنس کی بی بی تھی اور وہ پرمٹ کے پرسول تھے۔ یہ میم اپنے باپ سے ملنے دلی آئی تھی اور وہ مہتمم خزانہ تھے۔ مسٹر لی سن آگرے کے قلعے میں تھے، اس کے دو بچے بھی باپ کے پاس تھے۔ اگرچہ میم پوری آسائش سے رہتی تھی با ایں ہمہ وہ اپنے مستقبل کی طرف سے بہت پریشان رہتی تھی۔ اس نے دہلی کا غدر دیکھا اور اس کو بالکل یقین .... تھا کہ اس کا شوہر بچوں سمیت آگرے میں ضرور مارا گیا ہو گا۔ اس نے اپنے باپ کو گولی سے ہلاک ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ جب وہ اپنی داستانِ غم والم بیان کرتی تھی، خود روتی تھی اور دوسروں کو رلاتی تھی۔

اس ہنگامے میں باہر سے خبروں کا آنا جانا بالکل بند تھا، ایسی حالت میں اس کو اس کے سوا اور کیا خیال آسکتا تھا کہ مولوی لوگ ماما یا لونڈی بنا کر رکھیں گے۔ وہ نہایت مایوسی کی حالت میں تھی۔

(حیات النذیر ص ۴۱)

حفاظت سے انگریزوں کے کیمپ میں پہنچادی گئی:

ساڑھے تین مہینے تک یہ میاں صاحب کے ہاں رہی، جب اس کے زخم اچھی طرح بھر گئے اور تندرست ہو گئی تو اس کو انگریزی کیمپ میں پہنچا دیا گیا۔ مگر یہ کام بھی اپنی جگہ بڑا مشکل اور خطرناک تھا۔ کیونکہ انقلابیوں نے شہر کے دروازوں پر بڑی سختی کر رکھی تھی لوگوں کو بڑی مشکل سے باہر جانے اور اندر آنے دیتے تھے۔ ایک بگھی منگوائی گئی، اس میں میاں صاحب کے گھرانے کی چند عورتیں اور کچھ بچے بٹھا دیئے گئے، ان سب کے بیچ میں یہ میم دبی جھکی بیٹھ گئی۔ اور دونوں طرف سے پردہ کھینچ دیا گیا۔ لاہوری دروازہ پر پہنچے تو پہرہ والوں نے پردہ اٹھا کر تلاشی لینی چاہی، ایک پنجابی طالب علم (شعیب) جو بگھی کے ساتھ تھا، اس نے کہا میاں مولویوں کی بہو بیٹیاں ہیں تلاشی کیا لیتے ہو۔ منت پوری کرنے جارہی ہیں ابھی چھ گھڑی رات کی توپ سے پہلے لوٹ آتی ہیں، مولویوں کا نام سن کر پہرہ والوں نے کاوش نہیں کی، اور بگھی کو گزر جانے دیا۔"

(حیات النذیر ص ۴۲)

اس سلوک کا جائزہ قرآن کی روشنی میں :

میاں صاحب اور ان کے اعزہ (مولوی عبدالقادر صاحب اور ڈپٹی نذیر احمد صاحب) ان کے شاگرد، ان کے گھر کی مستورات تک نے منزلِ لن کے ساتھ جو سلوک اور برتاؤ کیا وہ تو آپ نے بلاحظہ کرلیا۔ اب آیئے ذرا اس کی بابت شرعی نقطۂ نظر سے بھی غور کریں۔ جنگی احکام کے متعلق قرآن پاک کی سب سے جامع سورہ "سورۃ التوبہ" ہے۔ اس کے پہلے ہی رکوع میں ارشاد ہوا ہے: وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝ (یعنی اور اگر کوئی مشرک (یا کافر حالتِ جنگ میں بھی) تم سے امن مانگے تو اس کو پناہ دیا کرو کہ وہ (مسلمانوں کے میل ملاپ سے) قرآن سنے پھر جب وہ جانا چاہے تو امن کی جگہ اس کو پہنچا دیا کرو یہ حکم اس لیے ہے کہ وہ لوگ بے علم ہیں (ترجمہ ثنائی) میں یہ نہیں کہتا کہ یہ آیت پوری طرح واقعہ زیرِ بحث پر منطبق ہے۔ تاہم اتنا تو ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ جنگ کی حالت میں بھی کافر کو پناہ دی جاسکتی ہے اور پناہ دینے کے بعد ہمارا یہ حق نہیں ہے کہ ہم اس کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کریں، اور اگر وہ اسلام قبول نہ کرے تو ہم اس کو ستائیں، اس کے ساتھ سختی کریں۔ نہ مانے تو اپنی پناہ سے نکال کر بے مروتی کے ساتھ گھر سے باہر کردیں خواہ اس پر کچھ بھی گزرے۔ بلکہ اس کے برخلاف یہ حکم دیا گیا کہ کسی قسم کی تکلیف دیئے بغیر امن وامان اور حفاظت و عافیت کے ساتھ اس کافر کو اس کے امن کی جگہ پہنچا دو۔ چنانچہ مفسرین نے ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ کے ذیل میں لکھا ہے: فيه دليل على ان المستامن

لایؤذی (مدارک ص ۸۹ ج۲) یعنی اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ پناہ لینے والے کافر کو تکلیف نہ دی جائے۔ احکام القرآن للجصاص میں ہے یدل علیٰ ان علی الامام حفظ ھذا الحربی المستجیر وحیاطتہ ومنع الناس من تناولہ بشر (ص ۱۰۳ ج۳) یعنی اللہ تعالیٰ کا یہ قول اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مسلمانوں کے امام پر واجب ہے کہ پناہ لینے والے کافر کی حفاظت کرے۔ اور ہر طرح اس کی رکھوالی کرے اور لوگوں کو اس کے ساتھ کسی قسم کا بُرا برتاؤ کرنے سے روکے۔

الحاصل اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی دہشت زدہ کافر کسی مسلمان سے امن وپناہ کا طالب ہو تو دینی مصالح کے پیش نظر اس کو پناہ دینی چاہیے، اس کے بعد جب تک وہ پناہ میں رہے اس کے ساتھ احسان اور اچھا سلوک کرے، جب وہ واپس جانا چاہے تو اپنی ذمہ داری میں حفاظت کے ساتھ اس کے ٹھکانے پر اس کو پہنچا دے۔

بتائیے! میاں صاحب اور ان کے اقرباء نے مسز لی سن کے ساتھ اس کے سوا اور کیا کیا ہے؟ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ قرآنی تعلیم کے اس عملی نمونے کو خواہ مخواہ انگریزی خوشامد پر محمول کرنے کی کیوں کوشش کی جا رہی ہے؟

انسانی فطرت اور شرافت کا تقاضا:

اب واقعے کے اس رخ کو بھی ذرا سوچیے کہ ایک عورت جو اپنے باپ اور اپنی قوم کے دوسرے بہت سے افراد کا حسرتناک حشر دیکھ کر انتہائی خوف وہراس

میں مبتلا ہو۔ اور بالآخر یہ نوبت آگئی ہو کہ وہ خود بھی خون آلود زخموں کے ساتھ
نیم جان حالت میں پڑی ہوئی اپنی موت کا انتظار کر رہی ہو۔ نظر بہ ظاہر حالات
اس کو اپنی زندگی کے متعلق کوئی آس باقی نہ رہ گئی ہو کہ یکایک کچھ اللہ کے ایسے بندے
اس کے پاس پہنچ جاتے ہیں جو اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر اس کی جان بچانے
کی فکر کرتے ہیں۔ اس کو اپنے گھر لاکر اس کی جان اور عزت و آبرو کی ہر طرح حفاظت
کرتے ہیں۔ ساڑھے تین مہینے تک اس کے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، دوا
علاج کی پوری کفالت کرتے ہیں۔ اس کی دلجوئی کا اس درجہ خیال رکھتے ہیں کہ اس
کو یہ بھی نہیں بتاتے کہ تم جس مکان میں ٹھہری ہو اس کی دیوار کے پیچھے ہی انقلابیوں
کا پڑاؤ ہے۔ یا دوسری روایت کے مطابق اس کی آنکھوں نے یہ منظر دیکھا کہ انقلابیوں
کو کسی طرح اس کی بھنک مل گئی کہ اس مکان میں انگریز عورت کو چھپایا گیا ہے تو وہ رات
کو دو بجے ہلہ بول کر چڑھ آئے۔ یہ ایک ایسی آفت تھی جس سے سارا کنبہ کانپ اٹھا
تھا۔ مگر اللہ کا فضل ہوا اور وقت پہ ایک ایسی تدبیر سوجھ گئی جس سے یہ خوفناک بلا ٹل
گئی۔ ان مراحل سے گزرنے کے بعد آخر میں اس نے یہ بھی دیکھا کہ اس کی جان بچانے
کے لیے اپنی مستورات اور بچوں تک کو خطرے میں ڈال دیا گیا۔ ان سب کے گھیرے
میں اس کو بٹھا کر اس مقام تک پہنچا دیا گیا جو اس کے لیے امن و امان کا ٹھکانا ہو سکتا تھا۔
اسی سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ وہ جوان تھی، خوبصورت تھی اور بڑی حد تک
مجبور تھی، مگر اس کی عصمت کے تحفظ کا اس حد تک اہتمام کیا گیا تھا کہ گھر کے نوجوان لڑکوں
کو اس کے قریب بھی جانے نہیں دیا جاتا تھا۔ اس کے برخلاف ہمیں تاریخ میں بعض
ایسے واقعات ملتے ہیں کہ اس ہنگامے میں بعض میموں کو پناہ تو دی گئی لیکن ساتھ ہی اس کی

عصمت بھی لوٹ لی گئی۔ مہر صاحب لکھتے ہیں:

"نواب محمد حسن خان نے ایک میم کی جان بچائی تھی، لیکن اس سے تعلق بھی پیدا کر لیا اور وہ حاملہ ہو گئی۔ فتح دہلی کے بعد میم نے نواب کو پھانسی دلوادی۔" (۱۸۵۷ء ص ۱۸۳)

انصاف سے بتلایئے! کیا انسانی فطرت اور شرافت کا تقاضا یہی تھا کہ مسز لی سن کے دل پر ان واقعات کا کوئی نقش قائم نہ ہوتا؟ اور وہ اس ساری آپ بیتی کو یکسر فراموش کر دیتی؟ اگر نہیں، اور یقیناً نہیں، تو پھر کیا تعجب ہے اگر اس کی شرافت نے یہ محسوس کیا ہو کہ اس حسنِ سلوک کا بدلہ اس کو دینا چاہیے۔ اسی طرح کیا بعید ہے اگر اس کی زبان سے اس کی "آپ بیتی" سننے کے بعد اس کے شوہر اور اس کی قوم کے دلوں میں بھی میاں صاحب اور ان کے اہلبیت اور اقربار کے ساتھ ہمدردی پیدا ہو گئی ہو اور ان کا یہ انسانی احساس بیدار ہوا ہو کہ احسان کا بدلہ احسان ہے؟ اگر معاملے کی نوعیت یہی تھی اور بلاشبہ یہی تھی تو اس صورت میں "وفاداری" کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

انعامات اور چٹھیوں کی حیثیت:

اس کے بعد تو انعامات اور انگریز افسروں کی ان چٹھیوں کی (جن میں میاں صاحب اور ان کے گھر والوں کے حسنِ سلوک کو "وفاداری" سے تعبیر کیا گیا ہے) اس سے زیادہ کچھ حیثیت باقی نہیں رہ جاتی کہ انسانی سلوک کا جواب انسانی سلوک سے دیا گیا ہے۔ مگر بدقسمتی سے مسز لی سن انگریز تھی، اور انگریز اس وقت اپنے کو فاتح اور حاکم سمجھ رہے تھے اس لیے اپنی برتری اور شانِ حاکمیت کا مظاہرہ کرنے کے لیے انھوں نے

اپنی چٹھیوں میں اس حسنِ سلوک کو "وفاداری" سے تعبیر کیا اور جو رقم دی اس کا نام "انعام" رکھ دیا۔ اگر یہاں حاکمیت اور محکومیت کی نسبت نہ ہوتی تو یقیناً اس حسنِ سلوک کو "احسان" کہا جاتا۔ اور معاوضے کی رقم کو "حقیر خدمت" کہہ کر پیش کیا جاتا، اس کے بعد احسانمندانہ اور نیاز مندانہ جذبات کے ساتھ "شکریہ" ادا کیا جاتا۔ چنانچہ مسز لیسن نے اس کو "احسانات" ہی کہا تھا۔ "وفاداری" کا لفظ تو انگریز افسروں نے استعمال کیا ہے۔ مولانا راشد الخیری دہلوی کا بیان ہے کہ جدائی کے وقت میم نے اپنے میزبان سے یہ الفاظ کہے:

> "۔۔۔۔ میں آپ کے احسانات اور آپ کی معزز مستورات کا شکریہ الفاظ میں ادا نہیں کر سکتی۔ مجھ کو ہمیشہ یاد رکھے گا۔ میں اطمینان ہوتے ہی آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گی۔"
>
> (دلی کی آخری بہار ص ۸۴)

بہرحال تعبیرات سے حقیقت نہیں بدلا کرتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ بالکل نفسیاتی معاملہ تھا اور اس کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ ایک شریف گھرانے نے ایک مظلوم کی حمایت کی اور مصیبت کے وقت اس کے ساتھ ہمدردی کا برتاؤ کیا، اس کے جواب میں اس مظلوم نے بھی اپنی شرافت کا ثبوت دیا، اور اس کے بھائی بندوں نے بھی اس ہمدردی کی قدر کی۔ اور اپنی حسب حیثیت اس کا شکریہ ادا کیا۔

انعامات کی مقدار:

کہا گیا ہے کہ "میم کی جان بچانے کے معاوضے میں میاں صاحب کو کئی کئی بار انعام ملا۔

دو سو، چار سو اور سات سو روپے عطیات میں ملے تھے۔" حالانکہ انعامات کی ان رقموں کا ذکر صرف ایک چٹھی میں ہے، جو ڈبلوجی واٹرفیلڈ آفیشیٹنگ کمشنر دہلی کی لکھی ہوئی ہے۔ الحیاۃ بعد المماۃ کے ص ۷۸، ۷۹ پر اصل چٹھی کی نقل (جو انگریزی میں ہے) اور اس کا ترجمہ دونوں موجود ہے اور اشاعۃ السنۃ جلد ۸ نمبر۱۰ ص ۲۹۳ میں صرف ترجمہ شائع کیا گیا ہے۔ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس پوری چٹھی کو اور اس کا ترجمہ جو الحیاۃ بعد المماۃ میں ہے یہاں نقل کردیں۔

Delhi Dated 27th September 1877.
From W. G. Weterfield, offg. Commissioner.

Moulvi Nazeer Husain and his son Moulvi Sharif Husain were with other members of their family instrumental in saving the life of Mrs. Leesons during the mutiny they tended her when wounded kept her in their house for $3\frac{1}{2}$ months finally sent her in to the British camp at Delhi.

He says that he has lost in a fire which took place in his house in Delhi all his English certificates. I think this is extremely probable, he probably had certificates from General Noville Chamberlain and General Burnard, Colonel Sytter and others.

I remember the fact well and Mrs. Leesons, coming in to camp.

The family received a handsome reward of Rs. 400 Rs. 700 compensation for the demolition of houses bestowed upon them.

The family all deserve consideration, and kindness at our hands.

(ترجمہ)

دہلی مورخہ ۲۷ ستمبر ۱۸۷۷ء

از ڈبلو جی واٹر فیلڈ

مولوی نذیر حسین اور ان کے بیٹے مولوی شریف حسین اور ان کے دوسرے گھر والے غدر کے زمانے میں مسز لی سن کی جان بچانے میں ذریعہ ہوئے۔ حالتِ مجروحی میں انھوں نے ان کا علاج کیا، ساڑھے تین مہینے اپنے گھر میں رکھا، اور بالآخر دہلی کے برٹش کیمپ میں ان کو پہنچا دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کی انگریزی سرٹیفکیٹس ایک آتش زدگی میں جو ان کے مکان واقع دہلی میں ہوئی تھی جل گئیں۔ میں خیال کرتا ہوں کہ یہ ان کا کہنا بہت ہی قرین امکان ہے، غالباً ان کو جنرل نیوائل جیمبرلین، جنرل برنارڈ اور کرنل سانڈرز وغیرہم سے سرٹیفکیٹس ملی تھیں، مجھ کو وہ واقعات اور مسز لی سن کا کیمپ میں آنا اچھی طرح یاد ہے۔ ان لوگوں کو اس خدمت کے صلہ میں مبلغ دو سو اور چار سو روپیہ ملے تھے۔ مبلغ سات سو روپیہ بابت تاوان منہدم کیے جانے مکانات کے ان لوگوں کو عطا کیے گئے تھے۔

یہ لوگ ہماری قوم سے حسنِ سلوک اور الطاف کے مستحق ہیں۔

... ...

غور کیجیے! اس چھٹی سے مندرجہ ذیل تین باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

ایک یہ کہ اصل سرٹیفکیٹیں جو میاں صاحب کو ملی تھیں وہ آتش زدگی کے کسی حادثے میں جل گئیں، اور ڈبلو واٹر فیلڈ کی یہ چھٹی ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بیس برس کے بعد (۱۸۷۷ء) کی لکھی ہوئی ہے۔

دوسری یہ کہ اصل چھٹی جو انگریزی میں ہے، اس میں صرف دو رقموں کا ذکر ہے،

چار سو روپے اور سات سو روپے۔ دو سو روپے والی رقم کا اس میں کوئی ذکر نہیں ہے، معلوم نہیں ترجمے میں دو سو روپے کا ذکر کیسے آگیا ہے۔ یہی غلطی اشاعۃ السنۃ کے محولہ بالا ترجمے میں بھی ہے۔

تیسری یہ کہ مسز لی سنس کی خدمت کے معاوضے میں براہ راست جو رقم ملی ہے وہ بار بار نہیں بلکہ صرف ایک مرتبہ چار سو روپے ملے ہیں۔ سات سو روپے کی بابت تو وضاحت کر دی ہے کہ یہ مکانات منہدم کیے جانے کا تاوان تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس تاوان دینے کا محرک وہی نفسیاتی تاثر اور انسانی جذبہ رہا ہو جو مسز لی سنس کے ساتھ احسان کرنے کی وجہ سے انگریز افسروں کے دلوں میں پیدا ہو گیا تھا۔ مگر اس کو براہ راست اس خدمت کا صلہ کہنا صحیح نہیں ہے۔

یہ مکانات[1] انگریزوں نے منہدم کرائے تھے۔ حضرت میاں صاحبؒ اس وقت "پنجابی کٹرہ" میں آباد تھے۔ جب ہنگامہ فرو ہوا اور دہلی پر انگریزوں کا پوری طرح قبضہ ہو گیا تو انھوں نے انتقامی جذبے سے مشتعل ہو کر دہلی والوں پر قیامت برپا کر دی تھی، بہت سی عمارتیں منہدم کرا دیں۔ محلے کے محلے ویران کر دیے۔ کئی مسجدوں کا نام و نشان مٹا دیا مگر بظاہر اس کا مقصد یہ بتایا گیا کہ (۱) قلعے کے سامنے میدان نکالنا ضروری تھا۔ (۲) جامع مسجد کے اردگرد پچیس پچیس فٹ میدان نکالنا منظور تھا (۳) ریلوے اسٹیشن اور ریلوے لائن کے لیے جگہ نکالنا تھا۔

ان مقاصد کے لیے جو عمارتیں ڈھائی گئیں، ان کی سرسری کیفیت مہر صاحب نے

---

[1] دیکھو مکاتیب نذیریہ ص ۱۷۸

لکھی ہے، اسی سلسلے میں لکھتے ہیں۔

"کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک سب محلے صاف ہوگئے۔ مثلاً پنجابی کٹرہ، دھوبی کٹرہ، رام گنج، سعادت خاں کا کٹرہ، جرنیل کی بیوی کی حویلی، رام جی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ، اور حویلی۔" (۱۸۵۷ء ص ۱۹۰)

پنجابی کٹرا میں "اورنگ آبادی مسجد" کے نام سے ایک شاندار مسجد تھی جو شاہ اورنگ زیب کی بیگم اورنگ آبادی نے بنوائی تھی، سرسید خاں مرحوم نے اس مسجد کا ذکر ایک خاص انداز میں کیا ہے، لکھتے ہیں۔

"پنجابی کٹرہ ایک مکان تھا مسکن سوداگروں کا، اس میں اکثر پنجابی سوداگر اترا کرتے تھے، اس سبب سے پنجابی کٹرہ مشہور ہوگیا ہے، اس کٹرہ میں یہ مسجد ہے مصفا اور دلربا تری سنگ سرخ کی کہ اس کی خوبی و خوش نمائی بیان سے باہر ہے اور ایسی نیک نیت بیگم نے بنائی ہے کہ اب تک آباد ہے مولوی عبدالخالق صاحب اور مولوی محمد نذیر حسین صاحب اسی مسجد میں درس و تدریس فرماتے ہیں اور دن رات قال اللہ وقال الرسول کا ذکر رہتا ہے۔"

(آثار الصنادید)

لیکن اسٹیشن بنوانے اور ریلوے لائن نکالنے کے لیے یہ مسجد بھی ڈھادی گئی چنانچہ مہر صاحب لکھتے ہیں:

"یہ مسجد پنجابی کٹرے میں تھی جو اسٹیشن اور ریلوے لائن میں آگیا۔ مسجد اس جگہ تھی جہاں آجکل بڑا اسٹیشن ہے، پوری عمارت سنگِ سرخ کی نہایت خوش وضع

اور خوبصورت تھی، اس میں مولوی عبدالخالق امام تھے جو شمس العلماء مولانا نذیر احمد کے خسر تھے۔ شیخ الکل میاں نذیر حسین صاحب محدث دہلوی نے ابتدا میں یہیں درس شروع کیا تھا۔ پھر یہ مسجد انگریزوں نے منہدم کرادی۔ تو وہ پھاٹک حبش خاں میں چلے گئے۔" (۱۸۵۷ء ص ۱۹۲)

مہر صاحب کی کتاب سے جو دو اقتباس ہم نے ابھی نقل کیے ہیں ان سے قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ پنجابی کٹڑے کی تمام عمارتیں منہدم کی گئیں اور اس محلے کو صاف کر کے اسٹیشن اور ریلوے لائن میں لے لیا گیا تو اب ظاہر ہے کہ جب میاں صاحب بھی اس وقت تک اسی محلے میں آباد تھے تو ان کا مکان بھی اس انہدام کی زد میں آیا۔ البتہ آپ کے ساتھ یہ رعایت کی گئی کہ آپ کو اس کا تاوان دیا گیا۔

ایک غلط روایت:

اس تحقیق سے اس روایت کا غلط ہونا بھی ثابت ہو جاتا ہے، جس میں میاں صاحب کے متعلق انگریزوں کی اس مراعات کا ذکر ہے کہ "انگریزوں کے تسلط کے بعد جب سارا شہر غارت کیا جانے لگا تو آپ کا محلہ (یعنی میاں صاحب کا محلہ) صرف آپ کی بدولت محفوظ رہا۔" (الحیاۃ بعد المماۃ ص ۱۵۱، ۱۵۲)

سمجھ میں نہیں آتا کہ اس روایت کو کسی تنقید کے بغیر مصنف نے اپنی کتاب میں کس طرح نقل کر دیا جبکہ وہ خود ہی اس سے پہلے یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ "مسجد اورنگ آبادی ریلوے سٹیشن کے احاطہ میں آجانے کے سبب سے مسمار کر دی گئی۔" (ص۳۲)۔ اگر میاں صاحب کی بدولت سارا محلہ محفوظ رہ گیا تھا تو پھر یہ مسجد کیسے مسمار کر دی گئی؟ اور جب اسٹیشن کے

احاطہ میں آجانے کے سبب سے مسجد مسمار کردی گئی تو میاں صاحب کا مکان کیسے محفوظ رہ سکتا تھا۔ اس لیے کہ وہ تو اسی مسجد سے ملا ہوا تھا۔ (دیکھو الحیاۃ بعد المماۃ ص ۷۷)

میاں صاحب نے یہ رقمیں اور سرٹیفکیٹس کیوں قبول کیں؟

رہا یہ شبہ کہ مسز لی سنس اگر مصیبت زدہ اور مظلومہ تھی تو اس کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کرنا کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے، لیکن اس کے صلے میں جو رقمیں ملیں ان کو میاں صاحب نے کیوں قبول کیا؟ اور ایسی سرٹیفکیٹس اپنے حق میں کیوں منظور کیں جن میں ان کی اس خدمت کو انگریزی حکومت کی وفاداری سے تعبیر کیا گیا تھا؟ اگر درحقیقت ان کے دل میں وفاداری کے جذبات نہ ہوتے تو وہ اس قسم کی ہر پیشکش کو واپس کر دیتے، اور صاف صاف قرار دیتے کہ میں نے اپنے مذہب کی تعلیم پر عمل کیا ہے، تمھاری وفاداری مقصود نہ تھی۔ اس لیے اس کے صلے میں نہ کوئی انعام قبول کروں گا اور نہ کوئی سرٹیفکیٹ لوں گا۔

تو گزارش یہ ہے کہ:

اولاً۔ تو معاملہ کی جو نوعیت ہم نے پچھلے صفحات میں بتائی ہے۔ اس کے لحاظ سے یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ جب یہ معاملہ محض اخلاقی نوعیت کا تھا اور انسانی فطرت اور انسانی شرافت کے تقاضے کی رو سے ان رقموں اور چھٹیوں کی حیثیت اس کے سوا اور کچھ نہ تھی کہ وہ احسان کا بدلہ احسان ہے، تو پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ میاں صاحب ان رقموں اور چھٹیوں کو قبول نہ کرتے، اور اس قسم کی ہر پیشکش کو واپس کر دیتے۔

ثانیاً اس معاملہ کو آج کے حالات پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔ آج سو برس کی مسلسل ذہنی تربیت کے بعد ہمارے فکر و نظر کی پرواز بہت بلند ہو گئی ہے۔ اس بلندی سے

اس واقعہ پر اگر ہم نظر ڈالیں تو یہ ہماری بنیادی غلطی ہے۔ اس کے لیے تو ہمیں اسی زمانے کی تاریخ پڑھنی چاہیے۔ اور اسی کی روشنی میں ان حالات و واقعات کا گہری نظر سے مطالعہ کرنا چاہیے جن سے میاں صاحب اور ان کے متعلقین و اعزہ واقربا کو نمٹنا پڑا تھا۔ اگر وہ پس منظر ہمارے سامنے نہیں ہوگا تو ہم کسی صحیح فیصلے پر نہیں پہنچ سکیں گے۔

قصہ یہ ہے کہ جب جنگِ آزادی کا پانسہ پلٹا، ہندوستانی شکست کھا گئے اور انگریزوں نے دہلی فتح کرلی تو شہر پر عموماً اور مسلمانوں پر خصوصاً قیامت گزر گئی۔ تفصیلات میں جانے کا یہاں موقع نہیں ہے۔ ہاں ہمارے موضوع سے جس حصے کا تعلق ہے اس کا کچھ تھوڑا سا حال سناتے ہیں۔ سید افتخار علی بلگرامی ایک دن کا حال لکھتے ہیں:

"کوئی ڈیڑھ پہر رات گئی ہوگی کہ ایک گھوڑے کی ٹاپ کی آواز سڑک پر سنائی دی اور ایک سوار کو چلاتے سنا کہ مولویوں کا مکان کون سا ہے"۔ مولویوں میں سے کسی نے کواڑ کے پاس جاکر سوار سے پوچھا کہ "تمھارا کیا مطلب ہے؟"، اس نے کہا کہ "جنرل صاحب نے حکم دیا ہے کہ مولوی لوگ اپنے بال بچوں کو لے کر کچھ رات رہے سے کابلی دروازے کی سڑک سے پرے نکل جائیں، صبح سے پہلے پہلے اس محلے پر دھاوا ہوگا"، غرض بڑی بدحواسی سے مولوی مع بال بچوں اور عورتوں کے کوٹھوں کوٹھوں دکن کی طرف بھاگے۔ ان میں ہمارے مولانا (یعنی ڈپٹی نذیر احمد صاحب[1]) بھی شریک تھے۔ اس وقت کی پریشانی بیان نہیں کی جاسکتی، جتنے منہ اتنی باتیں۔ بعض

---

[1] ڈپٹی صاحب میاں صاحب کے سالے (مولوی عبدالقادر صاحب) کے داماد تھے۔ (رحمانی)

کی تو یہ رائے تھی کہ کہیں مت جاؤ، یہیں گھروں میں بیٹھے رہو اور بعض کی یہ صلاح تھی کہ جنرلی حکم آیا ہے تو نکل جانا چاہیے۔ غرض یہی رائے غالب رہی اور عورتوں نے اپنا زیور اپنے ہاتھوں سے نکال نکال کر صحن میں پھینک دیا اور ململ تن زیب کے دوپٹوں کی جگہ فرش کی چاندنیاں پھاڑ پھاڑ کر اوڑھیں۔ صبح ہوتے ہوتے مولوی لوگ باغ میں پہنچے اب انگریزی زد میں اور ان لوگوں میں صرف ایک سڑک حائل تھی، چاہتے تو باغ میں ٹھہرتے مگر ڈر کے مارے سوئی والوں کے محلے میں پہنچے ..... عورتیں ساتھ تھیں، پردے اور سواری کا کچھ انتظام نہیں، عورتوں بیچاریوں کو پیدل چلنے کی عادت نہیں۔ ایک ایک پاؤں پہ چھلنی ہو گیا..... بہرکیف یہ لوگ عرب سرائے[1] پہنچے، وہاں بادشاہ بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک دن دو دن تو امن سے گزرے پھر سنا کہ بادشاہ اور ان کے ملازموں کی داروگیر شروع ہے تو یہ مولویوں کا خاندان سلطان نظام الدین[2] بھاگ گیا۔

شہر کی خلقت وہاں بھی بھری پڑی تھی۔ وہاں سے پاؤں اکھڑے تو مولویوں نے وزیرآباد[3] کا ارادہ کیا۔ رستے میں گوروں کا ایک گارد ملتے ہی ملاء اس نے مولویوں کے گروہ میں سے مردوں کو گرفتار کر لیا اور عورتوں کو چھوڑ دیا۔

---

[1] عرب سرائے بیرون دہلی ہمایوں کے مقبرہ کے متصل واقع ہے ۱۲ منہ [2] دہلی سے پانچ میل ہے ۱۲ منہ۔ [3] وزیرآباد دہلی سے چھ سات میل پر واقع ہے ۱۲ منہ

اس وقت کی پریشانی اور واویلا کا کیا پوچھنا ہے، صرف ایک کمسن لڑکا حافظ عبدالواحد جو مولوی عبدالقادر صاحب کے بڑے صاحبزادے تھے عورتوں کے ساتھ تھے۔ باقی کل مرد مع دیکھنے کے دیکھتے رہ گئے۔ اس گرفتاری میں مولوی نذیر حسین صاحب، مولوی عبدالقادر صاحب اور ہمارے مولانا اور دو ایک اور آدمی تھے۔ گوروں نے ان لوگوں کو شہر کی کوتوالی میں لاکر حوالات کر دیا۔ اس طرح بہت سے لوگ پکڑے ہوئے تھے اور سب قطار در قطار بٹھائے گئے تھے اور سب کو سلسلہ وار پھانسی دی جاتی تھی۔ وہاں ایک مخبر صاحب ساتھ تھے وہ نشاندہی کرتے جاتے تھے کہ یہ فلاں ہیں یہ فلاں ہیں۔ جب ان مولویوں کی باری آئی نہیں معلوم اس کے دل میں کیا رحم آیا اس نے کہا کہ یہ بیچارے باطنی لوگ ہیں اگر کہیں اس کے منہ سے نکل جاتا کہ مولوی ہیں تو پھر یہ سب پھانسی پاتے۔ لیکن زندگی باقی تھی بچ گئے۔"

(حیات النذیر ص ۴۴، ۴۵)

اس بیان سے معلوم ہوا کہ اس افراتفری، بھاگ دوڑ اور پریشانی میں ایک موقع پر میاں صاحب بھی گرفتار ہوئے، حوالات میں بند کیے گئے اور اس مقام پر لاکر بٹھائے گئے جہاں سلسلہ وار لوگوں کو پھانسیاں دی جا رہی تھیں، مگر اللہ نے فضل کیا اور وہ بچ گئے۔ پھانسیوں کے متعلق بھی عجیب اندھیر نگری تھی۔ بہت سے بیگناہ جھوٹی مخبری پر پکڑے گئے اور پھانسی پا گئے۔

مولانا راشد الخیری لکھتے ہیں:

"باغیوں کا قلع قمع ہو چکا۔ قلعۂ معلّے پر انگریزی جھنڈا لہرا رہا ہے۔ روزانہ آٹھ بجے کے قریب کنار جمن پر کوتوالی اور دہلی دروازے کے باہر پھانسیاں ہوتی ہیں، اور مٹکاف صاحب کے ایک اشارے پر بیسوں بندگانِ خدا دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں..... مخبروں کا راج اور پھانسیوں کا بازار گرم تھا ہر وقت لست ہی لست پر جان تھی کہ نہ معلوم کب گرفتار ہوں اور پھانسی لگ جائے۔ پھانسی کے پھندے مٹکاف صاحب کی جیب میں رہتے تھے اور وہ اپنے سامنے درخت میں بندھوا دیتے تھے۔ دو دو مجرم ایک ایک درخت کے نیچے پشت کی طرف مشکیں باندھ کر بٹھا دیے جاتے تھے، اور صاحب کے حکم سے پھانسی ہو جاتی تھی۔"

(دلی کی آخری بہار ص ۴۸، ۴۹)

میاں صاحب کے خاص عزیز مولوی عبدالقادر صاحب دہلوی کے خلاف بھی جھوٹی مخبری کی گئی اور یہ مخبری کرنے والے ان کے ہم زلف ہی تھے۔

مولانا راشد الخیری لکھتے ہیں:

"مولانا عبدالقادر صاحب کے حقیقی ہم زلف مٹکاف صاحب کی ناک کے بال اور مخبروں کے سردار ہیں۔ ان کی اطلاع پر مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم گرفتار کیے گئے، اور چار آدمیوں کی زبانی شہادت پر پھانسی کا حکم ہو گیا۔..."

(آخری بہار ص ۴۸)

مصنف "حیات النذیر" اس واقعہ کی نسبت لکھتے ہیں:

"مخبر نے جھٹ جڑ دیا کہ مولوی عبدالقادر نے فلاں انگریز کو مار ڈالا ہے"

مولوی صاحب فوراً گرفتار ہو گئے۔ حوالات میں بند رہے۔ سنتے ہیں کہ چونسٹھ گواہ چشم دید واقعۂ قتل کے پیش ہوئے حتیٰ کہ دو میمیں آئیں۔ ان سے بھی کہلوا دیا کہ ہمارے خاوند کا قاتل یہی مولوی ہے۔ اب کیا باقی تھا۔ مولوی صاحب کی طرف سے پاس ہو گئی۔ اس کی خبر لیسن کی میم نے اپنے شوہر کو دی، وہ بے چارہ کہیں باہر تھا دوڑا ہوا آیا۔ اور اس نے کہا یہ کیا غضب ہے۔ ان ہی مولوی نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر میری میم کی جان بچائی یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ انگریز کے قاتل ہوں۔" (ص ۶۴ فٹ نوٹ میں)

مولوی عبد القادر صاحب موصوف کے پوتے راشد الخیری صاحب کا بیان یہ ہے کہ:

"آج مولوی عبد القادر کی پھانسی کا دن ہے، صبح کے آٹھ بج چکے ہیں۔ گورہ فوج کا معمولی دستہ مسلح کھڑا ہے، مدرسہ اور مسجد کے متعلقین خاموش بیٹھے ہیں کہ دو آدمی گھوڑوں پر سوار دلی دروازے کی طرف سے نکلے۔ اب یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ تقدیر تھی یا اتفاق کہ دونوں مجمع دیکھ کر ادھر چلے آئے۔ ان میں ایک میم تھی اور ایک انگریز یعنی مسز لیسن اور مسٹر لیسن۔ پھر مسز لیسن گھوڑا بڑھا کر قریب آئی تو مولوی عبد القادر کو مشکیں بندھے ہوئے دیکھا۔ جیب سے پنسل نکال کر اپنی ٹوپی پر لکھا، "انتظار کرو"، ٹوپی درخت پر لٹکا دی، پہرہ دار کو حکم دیا صاحب کو دکھا دینا اور گھوڑے پر روانہ ہو گئی .... مٹکاف صاحب آ گئے

کئی آدمیوں کی پھانسی ہوئی۔ مولوی صاحب کے درخت پر ٹوپی دیکھ کر مسٹکاف صاحب اِدھر اُدھر ٹہلنے لگے۔ ایک رتھ اور اس کے ساتھ گھوڑے پر میم صاحب آتی ہوئی دکھائی دیں، رتھ میں میری دادی صاحبہ یعنی مولوی صاحب کی بیوی تشریف رکھتی تھیں، ان کے ساتھ ان کی لڑکیاں اور بچے بھی تھے، جنھوں نے صبح سے رو رو کر خون کر رکھا تھا، مسٹکاف صاحب نے میم صاحب کی صورت دیکھ کر ٹوپی اتاری ہاتھ ہلایا اور پوری داستان سننے کے بعد اپنے ہاتھ سے مولوی صاحب کی مشکیں کھول کر حکم دیا۔ قاری... مجرم کو حاضر کرو۔ تعمیل میں کیا دیر تھی۔ قاری صاحب حاضر ہوئے۔ صاحب نے اپنے ہاتھ سے مشکیں باندھ کر حکم دیا۔ اس کو فوراً لٹکا دو۔ جب قاری صاحب پھانسی پر چڑھنے لگے تو مولوی صاحب کی خواہش پر میم صاحب نے سفارش کی اور قاری صاحب اس شرط پر چھوڑے گئے کہ دو سال کے واسطے شہر سے باہر چلے جائیں ؛

(آخری بہار ص ۴۹، ۵۰)

ان اقتباسات کو سامنے رکھ کر ذرا سوچیے کہ جس زمانے کا یہ حال ہو کہ لوگ پیسوں کے لالچ میں یا کسی عداوت کی وجہ سے انگریز افسروں کے پاس جھوٹی جھوٹی خبریں پہنچا کر پھانسیاں دلوا رہے ہوں۔ حد یہ ہے کہ اپنے ہم نعت اور قرابتدار تک اس گندگی میں ملوث ہوں۔ خود میاں صاحب کو بھی لاکر اس قطار میں بٹھا دیا گیا ہو، جس میں سے پکڑ پکڑ کر سلسلہ وار لوگوں کو پھانسیاں دی جا رہی تھیں۔ میاں صاحب کے ایک خاص اور بہت ہی قریبی عزیز کی مشکیں کس دی گئی ہوں اور حکم ہو چکا ہو کہ

ان کو پھانسی دیدی جائے۔ مخبری ایسی پُرفریب اور سازش اتنی گہری ہوتی ہو کہ قتل کا الزام ثابت کرنے کے لیے بھی بہت سے جھوٹے "چشم دید گواہ" آسانی سے مہیا ہو جاتے ہوں۔ انتہا یہ ہے کہ میموں تک کو دھوکا دیکر یہ کہلوا دیا جاتا ہو کہ ہمارے شوہروں کے قاتل یہی ہیں۔ الغرض بقول مولانا راشد المیرٹھی جب مخبروں کا راج ہوا اور پھانسیوں کا بازار گرم ہو۔ ہر وقت سخت ہی سخت پریشان ہو کہ نہ معلوم کب گرفتاری ہو اور پھانسی لگ جائے

ایسے حالات میں اگر میاں صاحب ان رقموں اور سرٹیفیکٹوں کو جو محض اخلاقاً اور انسانی شرافت کے تقاضے کی بنا پر ہمدردانہ طور پر دی گئی تھیں، منظور نہ کرتے اور لینے سے انکار کر دیتے تو یقیناً جھوٹے مخبر اس بات کو بتنگڑ اور اس رائی کو پربت بنا کر پیش کرتے اور ایسی رنگ آمیزی کرتے کہ انگریز افسران کی باتوں سے متاثر ہو کر میاں صاحب سے بدگمان ہو جاتے اور خیال کرتے کہ واقعی یہ مولوی در پردہ ہمارے مخالف ہیں، بغاوت میں انھوں نے بھی ضرور حصہ لیا ہے۔ اس کے بعد میاں صاحب ان کے برادر عزیز مولوی عبدالقادر صاحب، اور ان کے گھرانے کے دوسرے افراد ایک ایک کرکے پھانسیوں پر لٹکا دیے جاتے، یعنی وہی پھانسیاں جن کے قریب تک یہ حضرات پہونچکر واپس آئے تھے، پھر ان کے گلوں کی زینت بن جاتیں؛ اور عرب و عجم کی سرزمین اس ذاتِ اقدس کے فیوض و برکات سے محروم ہو جاتی جو کم و بیش ساٹھ برس تک کتاب و سنت کے انوار سے دنیا کو جگمگاتی رہی۔

یہ محض ظن و تخمین کی بات نہیں ہے۔ بعض واقعات اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ چنانچہ کتنے ہی اہلحدیث ہیں جو صرف کسی کے وہابی کہہ دینے پر مواخذہ میں آئے اور طرح طرح سے انگریزی مظالم کا نشانہ بنے، نواب صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں:

"جو لوگ فسادی تھے انھوں نے حکام کے ذہن میں یہ بات ڈالدی کہ جو لوگ وہابی کہلاتے ہیں وہ سرکار انگریزی کے دشمن ہیں۔ سرکار نے جو غور فرمایا تو یہ دریافت کیا کہ مطلق وہابی کے کہنے سے کوئی ہمارا دشمن نہیں سمجھا جاتا جب تک کوئی جرم بغاوت اس سے صادر نہ ہو، مگر یہ بات مدتِ دراز کے بعد سرکار نے سمجھی، ورنہ ایک زمانے میں صرف کسی کے وہابی کہہ دینے پر مواخذہ ہو جاتا تھا۔۔"

(ترجمانِ وہابیہ ص ۶۵)

اور یہ مواخذہ اتنا شدید ہوتا تھا کہ عدالت میں بھی کوئی شنوائی نہیں ہوتی تھی اور نہ کسی حاکم سے وہابی کے حق میں انصاف کی توقع تھی۔ نواب صاحب ہی دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"کسی وہابی کے لیے عدالتہائے قانونی میں انصاف پانا ناممکن ہے، کیونکہ اس علت وہابی کے معلوم ہوتے ہی حاکم عدالت اس کے خلاف پر آمادہ ہو جاتا ہے۔۔"

(ترجمانِ وہابیہ ص ۶۷)

خلاصہ یہ ہے کہ اس زمانے کے حالات کا صحیح جائزہ لینے کے بعد اس میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ اس وقت کے مصالح کا تقاضا یہی تھا کہ میاں صاحب بڑے انگریزوں کی کسی ہمدردانہ اخلاقی پیش کش کو قبول کرنے سے انکار نہ فرماتے۔ اگر انکار کر دیتے تو فائدہ سے کہیں زیادہ نقصان پہنچنے کا امکان تھا

خود اپنے کردار و عمل کو بھی دیکھیے:

اگر کسی کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی ہو تو دور جانے کی ضرورت نہیں ہے، وہ خود اپنے

قلب دجگر پر ہاتھ رکھ کر دیکھ لے کہ آزادی کے بعد ہندوستان کے مسلمان جن حالات سے گزر رہے ہیں، ان حالات میں امت کے اپنے کردار و عمل کا کیا حال ہے؟ کہاں تک وہ مسلمانوں کے حقوق شہریت اور ان کی عزت و ناموس ہی نہیں بلکہ ان کے دین و ایمان کے تحفظ و بقا کے لیے اپنی جرأت کا ثبوت دے رہا ہے؟ اور جو لوگ ان حالات کے ذمہ دار ہیں ان سے کہاں تک اپنی بیزاری اور نفرت کا اظہار کر رہا ہے؟ ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ دو چار مخصوص شخصیتوں کے علاوہ، آج بڑے بڑے کانگریسی مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ وہ انگریز کے مقابلے میں تو اپنی حریت پسندی کا خوب راگ الاپتے ہیں، لیکن موجودہ نظام کے خلاف ایک حرف شکایت بھی زبان پر لانے کی ان میں ہمت نہیں ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ستم تو یہ ہے کہ الٹے خوشامد اور تملق کی باتیں کرتے ہیں، حیرت ہوتی ہے اسمبلی اور پارلیمنٹ کے ان معزز ممبروں پر جن کی پانچ سالہ کارگزاریوں کے خانے میں صفر کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔

بتائیے! آج جبکہ مسلسل ذہنی تربیت کے بعد فکر و نظر کی پرواز بہت بلند ہو چکی ہے اور آزادی کی بابت تخیلات کی دنیا بہت آگے جا چکی ہے۔ حکومت بھی اجنبی نہیں بلکہ اپنی ہے اور جنتا کی نمائندہ ہے۔ آزادیٔ رائے کا حق تسلیم کرتی ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود حالات کے دباؤ کا جب ہم پر اتنا شدید اثر پڑتا ہے کہ زبانیں گنگ ہو کر رہ گئی ہیں۔ تو پھر سو سوا سو سال پہلے کے حالات کے ماتحت اور غیر ملکی پنجۂ استبداد کے زیر اثر چند معمولی واقعات پر ہم کو تعجب کیوں ہے؟ اور کیا حق ہے کہ اس بہانے سے ہم بزرگوں کو مطعون کریں، اور ان پر آوازے کسیں؟

ایک معزز غیر مسلم کی شہادت اور ہمارے لیے تازیانۂ غیرت:

ہم اپنی تائید اور تصدیق کے لیے ملک کے نامور قانون داں اور مشہور سیاسی مبصر شیو پرشاد سنہا سینیر ایڈوکیٹ سپریم کورٹ کے ایک مضمون کا (جو سیاست کانپور میں شائع ہوا ہے) مختصر سا حصہ یہاں نقل کرنا مناسب سمجھتے ہیں، یہ حصہ ہم نے "صدق جدید" لکھنؤ بابت ۸ جون ۱۹۶۲ء سے لیا ہے۔ سنہا صاحب لکھتے ہیں:

"اس ملک کے مسلمان لیڈروں میں نہ احساس ہے نہ جذبہ نہ ہمت، انھوں نے اپنی گرد ایک حصار کھینچ لیا ہے..... لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ اس حصار کے خط کو کانگریس نے نہیں کھینچا ہے، بلکہ خود ان کی احساس کمتری (خوشامد، کانگریس کی خوشنودی کے جذبے) نے کھینچا ہے۔ یہ بات خاص کر، بھوپال، جبل پور، ساگر وغیرہ کے واقعات کے بعد ظاہر ہوئی۔ ہندوستانی سفارت خانے کے سامنے پاکستان کے طلبہ نے احتجاج کیا۔ مظاہرہ کے وقت جادۂ اعتدال سے قدم آگے بڑھا دیا۔ غلط کیا، بہت برا کیا، ان بزرگان دین و قوم نے اس مظاہرہ کے خلاف تو غم و احتجاج مزید بلند کیا، لیکن پارلیمنٹ میں کسی نے بھی جبل پور وغیرہ کے واقعات کی مذمت نہیں کی، جس کی وجہ سے مظاہرہ ہوا۔ یہ شرف صرف جواہر لال نہرو اور کمیونسٹ لیڈروں کو حاصل رہا کہ انھوں نے ان جگہوں کے لرزہ خیز اور محشر انگیز واقعات کی پوری پوری مذمت کی، ان لیڈروں سے کیا امید ہے۔

اگر کچھ امید ہے تو جنوبی ہند کے مسلم لیڈروں سے ہے۔"

اس عبارت کے قابلِ توجہ فقروں پر ہم نے خط کھینچ دیا ہے۔

ایک تازہ انکشاف:

حالات کے دباؤ سے تاثر کی مثال میں وہ تازہ انکشاف بھی اس موقع پر قابلِ ذکر ہے، جس کا چرچا مئی اور جون کے اخبارات میں رہا ہے۔ رسالہ "برہان" دہلی بابت اپریل ۶۲ء میں جناب وحید احمد مسعود صاحب بدایونی سابق پارلیمنٹری سکریٹری یو پی کا ایک مضمون شائع ہوا ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ آزادی کے بعد یارانِ وطن کی بے مہری سے مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا سید سلیمان ندوی جیسے حضرات بھی دل برداشتہ ہو گئے تھے۔ مولانا مدنی کے متعلق لکھا ہے کہ:

"مولانا نے ترکی یا شام کو ہجرت کر نے کا ارادہ کر لیا تھا تو ایک منسٹر صاحب نے انہیں ان کی، مسلمانوں کی اور ملک کی بہتری کی خاطر اس سے باز رکھا پھر اس کے بعد بجائے سیاسی تقریروں کے وہ وعظ و مولود خوانی پر اتر آئے تھے۔"

دیو بند کے ماہنامہ "تذکرہ" نے اپنی مئی کی اشاعت میں وحید احمد صاحب کے اس بیان کی تردید کی ہے۔ یہ ماہنامہ مولانا مدنی کے صاحب زادے مولوی اسعد صاحب کی ملکیت اور نگرانی میں شائع ہوتا ہے۔ "تذکرہ" کے مرتب نے لکھا ہے کہ

"نہ معلوم وحید صاحب نے یہ بات کہاں سے اڑائی ہے کہ ترکی یا شام کو ہجرت کا ارادہ کر چکے تھے اور وہ بھی حالات سے گھبرا کر۔۔۔

یہ کہنا (بھی) سراسر غلط ہے کہ مولانا مدنی وعظ و مولود خوانی پر اُتر آئے تھے ....."

اس کے جواب میں وحید احمد صاحب نے اپنی غلطی کا صرف اس حد تک اعتراف کیا ہے کہ میں نے شنیدہ کو دیدہ کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اس کی معافی چاہتا ہوں۔ بہر حال ہمیں فی الحال اس سے بحث نہیں ہے کہ وحید احمد صاحب کا بیان صحیح ہے یا نہیں۔ ہم نے اس وقت اس معاملہ کو یہاں جس مقصد سے چھیڑا ہے وہ یہ ہے کہ اس بحث کے سلسلے میں تذکرہ نے ایک دوسری بڑی اہم بات کا انکشاف کیا ہے۔ جو ہم پر تنقید کرنے والے دوستوں کے لیے قابل غور ہے۔ مولانا مدنی کی حق گوئی کا ثبوت دیتے ہوئے تذکرہ نے لکھا ہے۔

"حکومت ہند نے جس سال آپ کو "پدم بھوشن" کا خطاب دینا چاہا تھا آپ نے اس کی واپسی کے جواب میں حکومت کو جو خط لکھا تھا کاش اس کا اصلی متن کہیں مل جاتا تو آپ اندازہ لگاتے کہ حضرت مدنیؒ کی حق گوئی آزاد بھارت میں بھی برقرار تھی۔ جمعیۃ کے علماء نے اس خط کو روک لیا اور اس کی جگہ دوسری تحریر حضرت مولانا کی طرف سے اشاعت کے لیے اخبارات کو دیدی۔"

(ندائے ملت لکھنؤ ۱۱ر مئی ۱۹۶۲ء)

خطاب کی واپسی کا حال تو ہمیں معلوم ہے۔ نیز ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ جس سال مولانا مدنیؒ نے اپنا خطاب واپس کیا تھا اسی سال بعض دوسرے خطاب یافتگان نے بھی اپنے خطابات واپس کیے تھے۔ لیکن یہ راز بالکل پہلی بار منظر عام پر آیا ہے۔

اور ماہنامہ "تذکرہ" جیسے معتبر ذریعے سے فاش ہوا ہے کہ خطاب کی واپسی کے ساتھ مولانا نے کوئی خط بھی حکومت کو لکھا تھا، اس کو جمعیۃ علماء ہند کے خدام نے روک لیا، اور اس کی جگہ دوسری تحریر مولانا کی طرف سے اخبارات کو اشاعت کے لیے دیدی۔ ماہنامہ "تذکرہ" کو اس خبر کی بابت معتبر ذریعہ ہم نے اس لیے قرار دیا ہے کہ مولوی اسعد صاحب اس وقت یوپی کی جمعیۃ علماء کے صدر ہیں۔ ان کی ملکیت اور نگرانی میں شائع ہونے والا پرچہ کم از کم جمعیۃ کے متعلق کوئی غیر تحقیقی بات اس طرح علی الاعلان لکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ مرکزی جمعیۃ اس معاملہ میں اب تک بالکل خاموش ہے۔

اب ہم اپنے نکتہ چیں دوستوں سے عرض کرتے ہیں کہ وہ اس معاملہ کے ان دو پہلوؤں پر غور کریں۔ ایک یہ کہ مولانا مدنی نے اپنی جرأتِ حق گوئی کے باوصف جمعیۃ کے ان خدام کے خلاف صدائے احتجاج کیوں نہیں بلند فرمائی، جنھوں نے ان کی تحریر کو روک لیا تھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ مزید گستاخی یہ کر ڈالی کہ اس کی جگہ دوسری تحریر کو مولانا کی تحریر قرار دیکر اخبارات میں شائع کرا دیا؟

دوسرا یہ کہ جمعیۃ کے وہ خدام جو انگریزی حکومت کے مقابلے میں اپنی بے باک حریت پسندی کا بار بار مظاہرہ کر چکے ہیں، انھوں نے موجودہ حکومت کے سامنے کلمۂ حق کے اظہار میں ایسی کمزوری کیوں دکھائی۔؟

جواب میں اس کے سوا اور کیا کہیے گا کہ حالات اور مصالح کا تقاضا یہی تھا۔ تو پھر یہی توجیہ میاں صاحب کے حق میں قابلِ پذیرائی کیوں نہیں؟ جبکہ حالات کی ناسازگاری میاں صاحب کے زمانے میں آج کے لحاظ سے کہیں زیادہ شدید تھی۔

میاں صاحب کا سفرِ حج

اس خبر سے مقلدین میں ہلچل:

جب شوال ۱۲۵۸ھ میں حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب دہلوی قدس سرہ نے ہندوستان سے مکہ معظمہ کی طرف ہجرت فرمائی تو درسِ حدیث کی بابت حضرت شاہ صاحب کی جانشینی کا شرف اللہ تعالیٰ نے ان کے شاگردِ رشید جناب میاں صاحب سید نذیر حسین دہلوی علیہ الرحمہ کو عطا فرمایا۔ محرم ۱۲۵۹ھ (مطابق فروری ۱۸۴۳ء) سے حضرت میاں صاحبؒ نے درسِ حدیث کا سلسلہ مستقل طور سے شروع فرمایا، اور تقریباً چالیس برس تک مسلسل یہ خدمت انجام دینے کے بعد ۱۳۰۰ھ (مطابق ۱۸۸۳ء) میں آپ کو زیارتِ حرمین شریفین کی سعادت حاصل کرنے کا شوق دامنگیر ہوا۔ اس چالیس سال کی مدت میں آپ کے مسلک کا ملک میں کافی چرچا ہو چکا تھا۔ کتاب و سنت کے ساتھ براہِ راست تمسک کی دعوت رفتہ رفتہ پھیل رہی تھی۔ تقلیدی جمود کے بندھن ٹوٹ رہے تھے، توحید کی حقیقت نکھر رہی تھی۔ بہت سی مردہ سنتیں زندہ ہو رہی تھیں۔ بدعات کے چراغ بجھ رہے تھے۔ ان حالات میں جب میاں صاحب کے سفرِ حج کے عزم و ارادہ کی خبر مشہور ہوئی تو بدعات کی خانقاہوں اور تقلید کے ایوانوں میں ہلچل مچ

گئی ۔ مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ کا بیان ہے :

" ہندوستان میں چونکہ اس وقت تقلید و عدم تقلید کا فتنہ زوروں پر تھا ۔ اور مولانا نذیر حسین غیر مقلدین کے سب سے بڑے شیخ سمجھے جاتے تھے ، اس لیے فوراً مکے میں اطلاع دیدی گئی کہ وہابیہ کا سب سے بڑا سرغنہ آرہا ہے ۔ اگر یہاں کوئی کارروائی نہ کی گئی تو اِس بات کو وہابی حجاز میں اپنی فتح سے تعبیر کریں گے ، اور عوام کو اس سے بہت فتنہ ہوگا . . . . "

(آزاد کی کہانی ص ۱۰۳)

اللہ اللہ ! تعصب اور تنگ نظری کی حد ہوگئی ۔ حجاز پر حنفی حکومت کے دورِ اقتدار کا نشہ ؟ کہ ایک متبع سنت شیخ کا امن و امان کے ساتھ فریضۂ حج ادا کرنا بھی گوارا نہ ہوا ۔ اس کو وہابیت کی فتح " سمجھا گیا اور عوام کے لیے " فتنہ " قرار دیا گیا ۔ چنانچہ اس اطلاع کے بعد ہندوستان میں بھی اور مکہ معظمہ میں بھی میاں صاحب کے خلاف " کارروائی " کرنے کے لیے سازشیں شروع ہوگئیں ، اور اِس سازش میں بریلوی اور دیوبندی دونوں مکتبِ خیال کے علماءِ احناف نے خوب خوب حصہ لیا ۔ یہ داستان عبرت خیز بھی ہے اور حیرت انگیز بھی ۔ اِس کی تفصیلات ہم پیش کریں گے لیکن اس سے پہلے ایک دوسرے واقعے کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے ، جس کی طرف مولانا آزاد مرحوم نے اپنے مندرجہ ذیل بیان میں اشارہ کیا ہے ۔ مولانا آزاد فرماتے ہیں :

" مولانا سید نذیر حسین مرحوم ، ہندوستان میں درس حدیث کے آخری مرکز تھے ، انھوں نے جب سفرِ حج کا ارادہ کیا تو ان کو خیال پیدا ہوا کہ مخالفین مکہ میں ایذا رسانی کی کوشش کریں گے ۔ اس لیے کر علماءِ وہابیہ کے ساتھ

وہاں پہلے جو سلوک ہو چکا تھا اس سے باخبر تھے ....."

(آزاد کی کہانی ص ۱۰۲)

وہ کون سلوک ہے جو مکہ معظمہ میں "علمائے وہابیہ" کے ساتھ میاں صاحب کے سفر حج سے پہلے ہو چکا تھا اور میاں صاحب اس سے باخبر تھے، اسی لیے ان کو اپنے متعلق کچھ احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کی فکر ہوئی تھی۔ اس کا بھی مفصل تذکرہ مولانا آزاد ہی کی زبانی اس کتاب (آزاد کی کہانی) میں موجود ہے۔ یہ پوری تفصیل تو یہاں نقل کرنے کا موقع نہیں ہے، ہاں کچھ ضروری حصہ پیش کیا جاتا ہے۔ "آزاد کی کہانی" میں اس واقعے کے بیان کے لیے جو عنوان مقرر کیا گیا ہے وہی ہم بھی اختیار کرتے ہیں اور وہ یہ ہے۔

مکے میں علمائے اہلحدیث پر قیامت:

مولانا آزاد کے والد اپنے نانا کے ساتھ دہلی سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے تھے۔ قیام حجاز کے تقریباً دس برس بعد مکہ ہی میں انھوں نے شادی کی' اس دوران میں ان کو ممالک اسلامیہ کی سیاحت کا شوق ہوا، پہلے قسطنطنیہ کا سفر کیا، اس سفر کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا آزاد فرماتے ہیں:

"سفر قسطنطنیہ سے پہلے مکہ معظمہ میں ایک نہایت اہم واقعہ پیش آیا جسے افسوس ہے، کسی نے قلمبند نہیں کیا ہے۔ حالانکہ وہ نہایت عبرت انگیز اور تاریخی ہے ..... تفصیل یہ ہے کہ اس زمانے میں وہابیوں کی جانب سے گورنمنٹ ہند نہایت برافروختہ تھی' اور ان کی جماعت کو سخت خطرناک پولیٹکل جماعت سمجھتی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہ جماعت مولانا اسمٰعیل کی

جماعت سمجھی جاتی تھی، جنھوں نے اپنی تحریک کی بنیاد مسئلہ جہاد پر رکھی تھی اور سکھوں سے عملاً جہاد کیا تھا۔ مولانا اسمٰعیل کے بعد سید صاحب کی جو جماعت سرحد پر رہ گئی تھی وہ مولانا صادق پوری کی امارت میں از سرِ نو قائم ہوئی۔ اور اُس سے اور انگریزوں سے دو تین مرتبہ مڈبھیڑ ہوئی تھی اور گورنمنٹ کو خیال ہوگیا تھا کہ اب یہ جماعت انگریزوں سے جنگ کرنا چاہتی ہے۔ (اس کے بعد انگریزوں کی طرف سے اس جماعت پر طرح طرح کی جو مصیبتیں اور بربریتیاں نازل کی گئیں اجمالی طور پر مولانا آزاد نے ان کی نشاندہی کی ہے۔ اس سے آگے فرمایا ہے۔) ان اسباب کی وجہ سے اس جماعت کے علماء نے بجز اسکے اور کوئی چارہ نہ دیکھا کہ ہجرت کر جائیں۔ بہت سے لوگ تو غدر کے موقع ہی پر چلے گئے تھے اور جو اس دار وگیر سے کسی طرح بچے، انھوں نے بھی حجاز کو دار الامن سمجھ کر ہجرت کی۔ چنانچہ غدر کے بعد علماءِ وہابیہ کی ایک بڑی جماعت مکہ معظمہ میں فراہم ہوگئی تھی۔ لیکن یہاں بھی اُس برخلاف متعدد اسباب موجود تھے۔ سب سے پہلے یہ کہ محمد بن عبد الوہاب نجدی اور ان کی جماعت سے علمائے حجاز و عوام کو سخت تعصب و عناد تھا۔ پھر سلطنتِ عثمانیہ نے پولیٹکل اغراض و مصالح سے وہابیوں کو بہت بدنام کیا تھا اور وہابی ہونے کو عملاً ایک بڑا جرم قرار دے رکھا تھا۔ ان اسباب سے البلدُ الامین (مکہ) میں بھی وہابیوں کی جماعت کے لیے امن نہ تھا اور وہ ایک باغیانہ جماعت سمجھی جاتی تھی۔

ابتدا میں علماءِ حجاز اور گورنمنٹ کو اس تحریک کی خبر نہ تھی جو

ہندوستان میں شروع ہوئی تھی، بلکہ جب مولانا محمد اسماعیل نے مولانا سید احمد صاحب کے ساتھ حج کا سفر کیا تو یہ وہاں بہت اچھا اثر چھوڑ آئے تھے۔ اس لیے وہابیہ ہند کی جماعت سے کسی کو کوئی سوء ظن نہ تھا۔ لیکن ہندوستانی مقیمین مکہ نے یہ فتنہ اٹھایا اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس میں سب سے بڑا حصہ والد مرحوم کا تھا۔ ان کے تعلقات شریف اور قسطنطنیہ دونوں سے گہرے تھے۔ انھی نے علمائے حجاز اور شریف کو مطلع کیا کہ یہ جماعت باعتبار عقائد محمد بن عبدالوہاب کی جماعت ہے اور ہندوستان سے خاص اس لیے آئی ہے کہ یہاں اپنی تحریک پھیلائے۔ ثبوت میں تقویۃ الایمان اور بعض دوسری کتابوں کے حسب حال مطالب عربی میں ترجمہ کر کے شائع کر دیے۔ .... والد مرحوم نے شریف کو ان لوگوں کے برخلاف سخت برانگیختہ کر دیا۔ اتفاق سے اسی زمانے میں یہ واقعہ پیش آیا کہ قاضی محمد مراد بنگالی طائف گئے۔ جب واپس آئے تو شیخ عبداللہ مرداد امام حنفی ان سے ملنے گئے اور دستور کے مطابق سلام کے بعد "زیارت مقبول"[1] کہا جس سے مراد حضرت ابن عباسؓ کی قبر کی زیارت تھی۔ قاضی صاحب نے جواب دیا کہ میں کسی قبر کی زیارت کے لیے نہیں گیا تھا، بلکہ محض تفریح کے لیے گیا تھا۔ اس بات کا بہت چرچا ہوا، اور شریف تک پہنچائی گئی اور اس کے معنی یہ ٹھہرائے گئے کہ یہ لوگ بھی محمد بن عبدالوہاب کی طرح قبور صالحین کی

---

[1] یعنی زیارت قبور مبارک ہو۔

زیارت کے مخالف ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ چند دنوں کے بعد اچانک اس جماعت کے اکیس آدمی گرفتار کر لیے گئے جن میں مولانا رحمت اللہ صاحب "اظہار الحق" بھی تھے، لیکن یہ بعد کو رہا کر دیے گئے، کیونکہ انھوں نے اپنی حنفیت کے بہت واضح دلائل پیش کر دیے تھے۔ شریف نے ایک مجلس مقرر کی، اور والدِ مرحوم سے کہا کہ ان لوگوں کے عقائد کی تحقیقات کریں۔

"ان پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ وہ بھی محمد بن عبدالوہاب کی جماعت سے ہیں، انھوں نے اس سے انکار کیا، اس پر والد مرحوم نے سترہ سوال مرتب کر کے پیش کیے، جن میں وجوبِ تقلیدِ شخصی، استحبابِ تیمم، زیارتِ قبور کے لیے سفر اور استمداد و توسل بالصالحین وغیرہ سوالات تھے۔ افسوس ہے اس موقع پر بجز تین شخصوں کے اور سب نے تقیہ کیا اور کسی نے بھی استقامت نہ دکھائی۔"

• مولوی محمد انصاری، مولوی محمد لطیف اور قاضی محمد مراد نے بڑی جرأت و دلیری کے ساتھ اپنے صحیح عقائد پیش کر دیے اور کہا اگر قرآن و سنت پر عمل کرنا اور بدعت سے اجتناب کرنا جرم ہے تو ہم مجرم ہیں، اور ہر طرح کی سزا برداشت کرنے کو تیار۔

کوڑوں کی سزا کا حکم:

پھر ان سے کہا گیا کہ اپنے عقائد سے توبہ کریں ورنہ سخت تعزیر کی جائے گی، لیکن یہ اس پر رضامند نہ ہوئے۔ اس پر شریف نے ان تینوں میں سے

ہر ایک کو انتالیس انتالیس کوڑے لگانے کا حکم دیا۔ انتالیس اس لیے کہ، حنفیہ کے نزدیک حد کی تعداد چالیس کوڑے ہیں اور تعزیر کو اس تعداد سے کم ہونا چاہیے۔"

سلسلۂ بیان جاری رکھتے ہوئے مولانا آزاد نے فرمایا ہے:۔

برٹش قونصل میں پناہ:

اس موقع پر نہایت عبرت انگیز بات یہ ہے کہ جب اسلامی حکومت اور بجوار بیت اللہ میں ایک مسلمان جماعت علماء پر ظلم و ستم ہو رہا تھا تو اس وقت اگر ان کو کوئی پناہ مل سکی تو انھی کفار کے دامن میں جن سے بھاگ کر یہ یہاں آئے تھے۔ ان میں سے بعض کے احباب ان کی گرفتاری کے بعد ہی جدہ آ گئے تھے اور برٹش قونصل کو یہ خبر دی تھی کہ برٹش رعایا پر یہ عذاب نازل ہو رہا ہے، برٹش قونصل نے اس معاملے کو قابل مداخلت خیال کیا اور گورنر مکہ کو مراسلت بھیجی کہ برٹش رعایا کی گرفتاری بجز فوجداری جرائم کے اور کسی وجہ سے نہیں ہو سکتی، اور اگر انھیں چوبیس گھنٹے کے اندر نہ چھوڑ دیا گیا تو برٹش گورنمنٹ اس معاملے کو باب عالی کے رو برو پیش کرے گی۔

تب گورنر نے شریف پر زور ڈالا اور تعزیر کی کارروائی وقوع میں آنے سے پہلے ہی یہ لوگ مجبوراً چھوڑ دیے گئے۔ لیکن انھیں یہ سزا دی گئی کہ سب کے سب اکتیس آدمی خارج البلد کر دیے گئے اور حجاز کی پولیس نے انھیں جدے میں لاکر برٹش قونصل کے حوالے کر دیا۔ . . "

ان اقتباسات پر غور کرنے سے مندرجہ ذیل چند باتیں واضح طور پر مستنبط ہوتی ہیں:

(الف) البلد الامین (مکہ معظمہ) میں یہ افسوسناک سلوک جن علماء کے ساتھ کیا گیا ان کا اس کے سوا اور کوئی قصور نہ تھا کہ وہ عقیدہ اور مسلک کے اعتبار سے اہلحدیث تھے۔ یعنی مقلد اور بدعتی نہ تھے۔

(ب) مولوی رحمت اللہ صاحب کیرانوی بھی گرفتار ہو گئے تھے مگر انھوں نے اپنے حنفی ہونے کا ثبوت دے کر رہائی حاصل کر لی تھی۔

(ج) یہ فتنہ ان ہندوستانی علماء نے اٹھایا تھا جو اس زمانے میں مکہ معظمہ میں مقیم تھے۔ اور اس میں بڑا حصہ مولانا آزاد مرحوم کے والد مولوی خیرالدین کا تھا۔

(د) ان علماء اہلحدیث کو کوڑوں کی سزا دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا لیکن اس کا نفاذ برٹش گورنمنٹ کے قونصل مقیم جدہ کی مداخلت کی وجہ سے نہ ہو سکا۔

(ہ) تمسک بالکتاب والسنۃ کی پاداش میں اللہ کے ان نیک بندوں کو جوار بیت اللہ سے نکال کر برٹش قونصل کے حوالے کر دیا گیا۔ یعنی بقول مولانا آزاد مرحوم "اس وقت اگر ان کو کوئی پناہ مل سکی تو انھی کفار کے دامن میں، جن سے بھاگ کر یہ یہاں آئے تھے۔"

یہ ہے وہ واقعہ جو میاں صاحب کے سفر حج سے پہلے مکہ معظمہ میں پیش آ چکا تھا۔ اور جس کی طرف مولانا آزاد نے اپنے بیان میں اشارہ کیا ہے۔ میاں صاحب نے السعید من وعظ بغیرہ رواہ مسلم (ج۲ ص۳۳۲) (خوش نصیب ہے وہ شخص جو دوسروں کے حالات سے نصیحت حاصل کرے) کے مطابق اس واقعہ کو اپنے لیے سبق آموز قرار دیا، اور احتیاطی تدابیر کے طور پر دہلی کے بعض انگریز افسروں کو اپنے اس ارادہ کی اطلاع دے کر برطانوی قونصل مقیم جدہ کے نام چٹھیاں حاصل کیں، تاکہ اہلحدیث کے ان معاندین کی

... نتنہ انگریزوں سے محفوظ رہ سکیں جو اس وقت بھی مکہ معظمہ میں موجود تھے۔ حالات کی روشنی میں میاں صاحب کا یہ فعل نہ شرعاً قابلِ اعتراض ہو سکتا ہے اور نہ اخلاقاً لیکن اگر کوئی شخص نکتہ چینی ہی کے لیے بیٹھا ہو تو پھر اس کی نگاہِ تنقید سے کون بچ سکتا ہے؟ چنانچہ تیسرا طعنہ جو اہلحدیثوں کو دیا گیا ہے، اس کا تعلق انھی چٹھیوں سے ہے۔

تیسرا طعنہ اور اس کا جواب :

کہا گیا ہے کہ :

"اور اسی صلہ میں (یعنی مسٹر لیسنس کی جان بچانے کے صلے میں) سفرِ حج کے موقع پر بھی انگریز افسروں کی چٹھیاں مولانا کو ملی تھیں کہ اپنے حدود میں سرکاری عملہ ہر جگہ مولانا کے ساتھ تعاون کرے۔"

سفرِ حج کے موقع کی ان چٹھیوں کی نسبت یہ کہنا کہ "مسٹر لیسنس کی جان بچانے کے صلہ میں ملی تھیں۔" یقیناً ایک غلط اور معاندانہ تعبیر ہے۔ اردو زبان کی کسی لغت میں اٹھا کر دیکھیے کہ "صلہ" کے کیا معنی ہیں۔ جامع اللغات اردو کی ایک مشہور اور متداول لغت کی کتاب ہے، اس میں صلہ کے معنی لکھے ہیں: "انعام، بخشش، بدلہ، اجر" ۔
مسٹر لیسنس کی جان بچانے کا واقعہ ۱۸۵۷ء کا ہے اور حج کے موقع کی چٹھیاں ۱۸۸۳ء کی ہیں۔ یعنی دونوں میں تقریباً چھبیس سال کا فاصلہ ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کہ وفادارانہ کارناموں کے انعامات ربع صدی گزر جانے کے بعد ملا کرتے ہیں؟ پھر یہ بات بھی نہیں ہے کہ یہ چٹھیاں انگریز افسروں کی طرف سے از خود ملی تھیں، جیسا کہ معترض کے بیان سے مترشح ہوتا ہے، اور شاید اسی لیے انھوں نے ان چٹھیوں کو "صلہ" قرار دیا ہے۔

بلکہ میاں صاحب نے ان چٹھیوں کے حاصل کرنے کی کوشش کی تھی اور یہ کوشش انھوں نے کیوں کی تھی ؟ اور اس کوشش میں ان کو آسانی کے ساتھ کامیابی کیوں ہو گئی

ان باتوں پر مولانا آزاد کے بیان سے روشنی پڑتی ہے ۔ وہ فرماتے ہیں :

" مولانا سید نذیر حسین مرحوم ہندوستان میں درسِ حدیث کے آخری مرکز تھے ، انھوں نے جب سفرِ حج کا ارادہ کیا تو ان کو خیال پیدا ہوا کہ مخالفین مکہ میں ایذا رسانی کی کوشش کریں گے ۔ اس لیے کہ علماء وہابیہ کے ساتھ وہاں پہلے جو سلوک ہو چکا تھا اس سے باخبر تھے اور اب حجاز کی یہ حالت ہو رہی تھی کہ بلا تقیہ کوئی وہابی محفوظ طور پر نہ رہ سکتا تھا ۔ شیعہ و خوارج تو علانیہ جاتے اور حج کرتے کوئی روک نہ پیش آتی ، مگر وہابیہ کے لیے یہ موقع نہ تھا "

" مولانا نذیر حسین نے چونکہ غدر میں مسز لیسنس کی جان بچائی تھی اس لیے حکام سے ان کے تعلقات اچھے تھے ۔ انھوں نے ڈپٹی کمشنر دہلی کے ذریعہ سے فارن آفس میں سلسلہ جنبانی کی اور جدے میں برٹش قونصل کے نام ایک سفارشی چٹھی بھجوائی جس میں لکھا تھا کہ ان کی حفاظت کی جائے اور جو ضرورت انھیں پیش آئے حتی الامکان اس میں پوری طرح مدد دی جائے ۔ اس طرح یہ حجاز روانہ ہو گئے ۔ " (آزاد کی کہانی ص ۱۰۲ ، ۱۰۳)

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ میں علمائے اہلحدیث کے ساتھ جو ناروا اور ظالمانہ سلوک ہو چکا تھا ، میاں صاحب اس سے باخبر تھے ، اس لیے ان کو اپنے متعلق بھی ایذا رسانی کا خطرہ محسوس ہوا ۔ کیونکہ وہ اس وقت ہندوستان میں درسِ حدیث کا آخری مرکز تھے ، دہلی اہلحدیث کے پیشوا اور سرخیل تھے ۔ میاں صاحب کو یہ بھی معلوم تھا کہ ان علمائے

مظلومین کو کوڑوں کی سزا سے برٹش قونصل مقیم جدہ کی مداخلت نے بچایا تھا، اور قونصل ہی نے ان کو پناہ دی تھی۔ اسی لیے اسی قونصل کے نام انھوں نے چٹھی لکھوائی اور اس چیٹھی کے ملنے میں آسانی اس لیے ہوئی کہ مسٹر یسنس کے ساتھ میاں صاحب نے جو احسان کیا تھا انگریز افسر اس کو بھولا نہیں تھا۔ جیسا کہ انسانیت اور شرافت کا تقاضا ہے۔ بتلائیے! اس میں طعن کی کیا بات ہے؟ کیا دشمن کی مضرتوں اور ایذا رسانیوں سے اپنے کو بچانے کی فکر کرنا، اور اس کے لیے مناسب اور مفید تدبیر اختیار کرنا کوئی عیب اور ملامت کی چیز ہے؟۔

میاں صاحب کے خلاف ہیجان انگیز فضا:

میاں صاحبؒ کو اپنے سفرِ حج کے موقع پر مخالفین کی طرف سے ایذا رسانی کا جو خطرہ محسوس ہوا تھا یہ کوئی خیالی خطرہ نہیں تھا، بلکہ اس کی بنیاد حقائق پر تھی۔ جھوٹے عقائد اور غلط مسائل اہلحدیث، بالخصوص میاں صاحب کی طرف منسوب کر کے علمائے احناف کے فتووں نے ہیجان انگیز فضا پیدا کر دی تھی۔ "جامع الشواھد فی اخراج الوھابیین عن المساجد" اور "انتظام المساجد باخراج اھل الفتن والمقاسد"۔ کے نام سے رسالے مرتب ہو چکے تھے، جن کی خوب اشاعت کی جا رہی تھی، اور ان کی بنا پر اہلحدیثوں کو احناف کی مسجدوں میں نماز پڑھنے سے روکا جا رہا تھا طرح طرح سے مطعون اور بدنام کر کے ان کو پریشان کیا جا رہا تھا، ان رسالوں کی فتنہ انگیزیوں کا اندازہ کرنے کیلیے ضروری ہے کہ ان کے مندرجات کے کچھ نمونے ہم آپکے سامنے پیش کریں۔ پہلے "جامع الشواہد" کو لیجیے اس میں جن عقائد اور مسائل کی جھوٹی نسبت اہلحدیث کی طرف کی گئی ہے، ان میں سے نمونۃً کچھ کو یہاں

ذکر کرتا ہوں۔ کیونکہ اس کے متعلق میاں صاحب کو خاص طور سے نشانہ بنایا گیا ہے۔
مستفتی صاحب[1] لکھتے ہیں:

"ایک مسئلہ ان کا یہ ہے کہ پنیر جو شام میں سور کے پنیر مایہ سے بنایا جاتا اوس کا مشہور تھا اور چیزیں کہ جن میں سور کی چربی پڑتی مشہور تھی جب وہ آنحضرت علیہ السلام کے پاس آتی تھیں، آپ بلا دریافت کھاتے تھے"

(جامع الشواہد ص ۴)

اس روایت کو اہلحدیث کا عقیدہ اور مسئلہ بنا کر پیش کیا گیا ہے، اور ثبوت یہ دیا ہے کہ:

"چنانچہ فتویٰ مہری مولوی عطا محمد میں ہے جو رسالہ اظہار الحق مطبوعہ مطبع اتالیق ہند لاہور میں مندرج ہے، اور اوس رسالہ میں مولوی نذیر حسین صاحب وغیرہ کی بھی مہریں موجود ہیں اور اوس رسالہ کے چھپوانے میں مولوی نذیر حسین صاحب نے کوشش تام فرمائی۔ چنانچہ مصنفِ رسالہ مذکور شروع میں اس امر کی تصریح کرتا ہے۔" (حوالہ مذکورہ)

سمجھے آپ اس کا مطلب؟ کیا دلیل دی گئی ہے اس غلیظ اور ناپاک الزام کے ثبوت میں کہ میاں صاحب سید نذیر حسین اس بات کے قائل تھے کہ عیاذاً باللہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مذکورہ بالا پنیر استعمال فرمایا کرتے تھے؟ دلیل یہ دی گئی ہے کہ یہ بات اگرچہ مولوی عطا محمد کے فتوے میں ہے (سید مولانا نذیر حسین کے فتوے میں نہیں ہے)

---

[1] رسالہ میں کسی مستفتی کا نام نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود مفتی ہی مستفتی بھی ہیں ۱۲

مگر مولوی عطا محمد کا یہ فتوی جس رسالے میں شائع کیا گیا ہے، اس رسالے میں مولوی نذیر حسین صاحب کا بھی دستخط اور مہر ہے۔ بلکہ اس رسالے کے چھپوانے میں مولوی نذیر حسین صاحب نے بڑی کوشش کی تھی، جیسا کہ رسالے کے مصنف نے شروع میں اس کی تصریح کی ہے، لہذا معلوم ہوا کہ مولوی نذیر حسین صاحب بھی مولوی عطا محمد کے فتوے کے موید ہیں، یہ ہے اس دلیل کا خلاصہ۔

لیکن نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس دلیل کے بیان کرنے میں "جامع الشواہد" کے مصنف نے ایمان و دیانت کا خون کیا ہے۔ کئی طرح کا فریب دیا ہے۔ اور صریح کذب بیانی اور افترا پردازی سے بھی کام لیا ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے۔

اولاً — تو مولوی عطا محمد کے متعلق معلوم نہیں کہ یہ کون ہیں، کس عقیدہ اور مسلک کے تھے؟ پھر ان کی بات سے اہلحدیث پر کیا الزام؟

ثانیاً — انھوں نے یہ بات کسی اہلحدیث کی کتاب سے نہیں لی ہے بلکہ ایک شافعی المذہب عالم کی کتاب سے لی ہے، اس کتاب کا نام بھی انھوں نے بتا دیا ہے۔ یعنی "فتح المعین شرح قرۃ العین"۔ یہ "جامع الشواہد" کے مصنف کی بددیانتی ہے کہ اس نے اس کتاب کا نام ظاہر نہیں کیا ہے۔

ثالثاً — رسالہ "اظہار الحق" کے مصنف نے نہ اس رسالے کے شروع میں اور نہ اس کے آخر میں کہیں بھی اس کی تصریح نہیں کی ہے کہ اس رسالے کے چھپوانے میں مولوی نذیر حسین صاحب نے بھی کوشش کی ہے۔

"جامع الشواہد" کے مصنف نے یہ بالکل جھوٹ لکھا ہے اور یہ جھوٹ اس نے صرف اس مقصد سے لکھا ہے کہ کسی طرح مولوی عطا محمد والی بات مولانا نذیر حسین صاحب

کے ذمے بھی لگانے کی گنجائش نکل آئے۔

رابعاً "جامع الشواہد" کے مصنف کی یہ عبارت بڑی پُر فریب اور مغالطہ آمیز ہے کہ "رسالہ اظہار الحق" میں مولوی نذیر حسین صاحب وغیرہ کی بھی مہریں موجود ہیں۔ اس سے دھوکا یہ ہوتا ہے کہ یہ مہریں مولوی عطا محمد کے فتوے کی تائید میں ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اس رسالے میں فقط مولوی عطا محمد ہی کا فتویٰ شائع نہیں ہوا ہے، بلکہ یہ رسالہ دہلی، لاہور، امرتسر، کپورتھلہ، ہوشیارپور وغیرہ کے بہت سے علمار کے مختلف فتووں کا مجموعہ ہے۔ اسی میں ایک فتویٰ مولانا سید نذیر حسین صاحب کا بھی ہے۔ اسی فتوے پر مولانا نذیر حسین صاحب اور مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی وغیرہ علمائے اہلحدیث کی مہریں ہیں۔ اس فتوے کا مولوی عطا محمد کے فتوے سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ مولانا سید نذیر حسین صاحب کی مہر اور دستخط ثبت کرنے کی یہ صورت نہیں ہوئی تھی کہ ان کے سامنے پورا رسالہ اظہار الحق، مرتب کر کے پیش کیا گیا ہو۔ بلکہ ان کی خدمت میں الگ ایک استفتار بھیجا گیا تھا، اس کا جواب انھوں نے تحریر فرمایا تھا۔ اور اسی پر اپنا دستخط اور مہر کر دیا تھا۔ وہی دستخط شدہ اور مہر شدہ فتویٰ دوسرے فتووں کے ساتھ شامل کر کے "اظہار الحق" رسالے میں شائع کر دیا گیا ہے۔ رسالہ مذکورہ کے مرتب خان احمد شاہ قائم مقام اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہوشیارپور نے شروع رسالہ میں اس کی تشریح کر دی ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر ہم مولانا سید نذیر حسین صاحب کا وہ فتویٰ نقل کر دیں جس پر ان کی مہر ہے۔ ان کی خدمت میں استفتار یہ پیش کیا گیا تھا کہ:

"نصاریٰ کے کنوؤں اور ظروف کا پانی جو جملہ نجاسات اور منجسات علی اختلاف المذاہب سے یقیناً مبرا ہو، ان لوگوں کے لیے استعمال میں لانا جائز ہے یا نہیں جو اپنے دین سے واقف ہیں اور خوف و ضرر اختلاط و مداہنت سے مامون ہیں۔؟"

"نیز طعام نصاریٰ جو جملہ محرمات و نجاسات مقررہ کل مذاہب اسلامیہ سے محفوظ و خالی ہو مذکورہ بالا اشخاص کے لیے کھا لینا جائز ہے یا نہیں؟"۔

ان دونوں سوالوں کے جواب میں حضرت میاں صاحبؒ نے تحریر فرمایا ہے:

"جائز ہے۔ بدلیل حدیث صحیح بخاری کے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت مشرکہ کے پکھال سے لوگوں کو پانی پلایا اور وضو اور غسل کرایا اور حدیث بخاری اور حدیث رزین کے کہ حضرت عمرؓ نے عورت نصرانیہ کی کھلیا سے وضو کیا۔ اور حدیث ترمذی کے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قبیصہؓ نے سوال کیا طعام نصاریٰ سے تو آپ نے اجازت دی اور فرمایا لا تخلجن فی صدرك طعام ضارعت فیہ النصرانیۃ اور اغاثۃ اللھفان میں بھی آثار منقول ہیں کہ علیؓ وغیرہ صحابہ نے اہل کتاب کا کھانا کھایا اور جو احادیث و آثار اس کے معارض منقول ہیں وہ محمول ہیں مظنۂ نجاست پر یا جہلاء اشخاص پر جن سے خوف سستی دین و تجاوز حدود ہے، نہ اون سے سوال ہے اور نہ اون کے حق میں جواب ہے۔ واللہ اعلم علمہ اتم واحکم فقط"

(دیکھو ابراء اہل الحدیث ص ۸۲ تا ۸۵)

یہ ہے وہ فتویٰ جس پر مولانا سید نذیر حسین صاحب اور مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی وغیرہ چند علمائے اہلحدیث کی مہریں ہیں اور جس کو رسالہ " اظہار الحق " کے مجموعہ میں شامل کر کے شائع کیا گیا ہے ۔ اس میں کہیں نام ونشان بھی نہیں ہے اس خبیث چیز کا ، جس کا ذکر مولوی عطا محمد کے فتویٰ میں ہے ، اور جس کے استعمال کرنے کی نسبت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی گئی ہے ۔

لیکن دھاندلی دیکھیے کہ " جامع الشواہد " کے مصنف نے ایک پر فریب عبارت کے ذریعہ اس مکروہ بات کو حضرت مولانا سید نذیر حسین صاحب وغیرہ کے ذمے لگایا ۔ اس کے بعد حنفی مفتی صاحبان نے قطعاً اس کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ وقت کے ایک باکمال محدث کی طرف ایسی مکروہ بات منسوب کرتے ہوئے تحقیق تو کر لیں کہ حقیقت کیا ہے ؟ اسی قسم کے جھوٹے الزامات کی بنیاد پر فتویٰ دیدیا گیا کہ وہابیوں (اہلحدیثوں) کو احناف کی مسجدوں سے نکال دیا جائے ۔ اس رسالہ میں بہت سے علماء احناف کے فتوے ان کی مہر اور دستخط کے ساتھ موجود ہیں ۔ صفحہ ۹ پر جلی سرخی قائم کی گئی ہے ۔ " مواہیر ودستخط علمائے لدھیانہ ودیوبند " اس کے ذیل میں دیوبند اور لودھیانہ کے علماء کے فتوے درج ہیں ۔ علمائے دیوبند نے جس عبارت پر دستخط کیے ہیں وہ یہ ہے :

" عقائد اس جماعت کے جب خلاف جمہور ہیں ، بدعتی ہونا ظاہر اور مثل تجسیم اور تحلیل چار سے زیادہ ازواج کا اور تجویز تقیہ اور برا کہنا سلف صالحین کا فسق یا کفر ۔ تو اب نماز اور نکاح اور ذبیحہ میں ان کی احتیاط لازم ہے ، جیسے روافض کے ساتھ احتیاط چاہیے ۔

حررہ محمد یعقوب النانوتوی عفی عنہ ، رشید احمد گنگوہی عفی عنہ ، محمود دیوبندی

عفی عنہ، محمود حسن عفا عنہ، ابو الخیرات سید احمد عفی عنہ۔» (ص ۱۱)

یہ اکابر دیوبند کا فتویٰ ہے، کسی حوالے اور ثبوت کے بغیر چند عقائد اور مسائل کو پوری جماعت اہلحدیث کی طرف منسوب کر کے کہدیا گیا ہے کہ یہ بدعتی ہیں، فاسق یا کافر ہیں۔ مثل روافض کے ہیں۔ ان کے ساتھ نماز پڑھنا، نکاح کرنا، ان کا ذبیحہ کھانا ان سب باتوں میں احتیاط کرنا چاہیے۔ سوچیے! کیا یہ فتوے اپنا رنگ دکھائے بغیر رہتے؟

مشہور احراری لیڈر مولانا حبیب الرحمٰن لودیانوی کو تو آپ جانتے ہی ہوں گے، ان کے دادا مولانا محمد لودیانوی کا فتویٰ بھی اسی صفحہ پر درج ہے۔ انھوں نے پہلے تو تمہید یہ قائم کی ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص لہسن کھائے پس نزدیک نہ پھٹکے مسجد ہماری کے۔ اور عمر بن الخطاب سے مروی ہے کہ ایک عورت مجذومہ کو طواف کرنے سے مانع آئے اور فرمایا کہ تو اپنے گھر میں بیٹھ اور لوگوں کو ایذا نہ دے ایک شخص کوفہ کی مسجد میں وعظ کہہ رہا تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس سے پوچھو کہ ناسخ منسوخ کو جانتا ہے؟ اس نے کہا مجھ کو ناسخ منسوخ کا علم نہیں ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس کو مسجد سے نکال دو۔ نیز شاہ عبدالعزیز صاحب نے نیچے آیت واصبر علی ما یقولون۔ کے لکھا ہے کہ طعن کرنا سلف پر سخت ترین ایذا انسانی ہے اور انتباہ میں لکھا ہے کہ موذی کو مسجد میں آنے سے منع کرنا چاہیے اگرچہ ایذاء اس کی لسانی ہو۔"

اس تمہید کے بعد لکھتے ہیں:

"پس جبکہ روکنا مسجد سے بسبب موجود ہونے ایک امر کے امور مذکورہ سے درست ہوا تو غیر مقلدوں کو جو جامع امور مذکورہ ہیں نکالنا بطریق اولیٰ درست ہوا۔ اور بسبب لحوق مرض باطنی کے جو جذام سے بڑھ کر ہے اور

مساجد میں ان کے آنے سے فتنہ وفساد برپا ہوتا ہے اور خدائے تعالیٰ مفسدوں کو دوست نہیں رکھتا۔ قال اللہ تعالیٰ واللہ لا یحب المفسدین۔ باقی تحقیق اس مسئلہ کی رسالہ "انتظام المساجد باخراج اہل الفتن والمفاسد" میں جو اس عاجز کی تالیفات سے موجود ہے۔

واللہ اعلم وعلمہ اتم، الراقم محمد لودیانوی خادم العلماء المرقوم فی سنہ ۱۳۰۰ھ۔

مولانا محمد لودیانوی نے اس فتوے میں اپنی جس تالیف (انتظام المساجد) کا حوالہ دیا ہے، اس میں کیا لکھا ہے؟ اس کو ہم آگے بتائیں گے۔ پہلے جامع الشواہد کے افادات سے فارغ ہو لیجیے۔ کچھ پڑھ چکے ہیں کچھ اور پڑھیے۔ جامع الشواہد کے ص ۱۷ پر موٹے قلم سے سُرخی لکھی ہوئی ہے۔ "مواہیر علمائے مشاہیر دارالاسلام مصطفےٰ آباد عرف رام پور" اس کے نیچے صفحہ ۲۰ تک علمائے رام پور کے فتاویٰ اور دستخط ہیں۔ ان میں سے ایک فتویٰ پڑھیے کتنا زوردار اور پُر وقار ہے۔ میاں صاحبؒ کی شان میں فرماتے ہیں:-

"یہ شخص امام اس گروہ غیرمقلدین کا سُنّی نہیں ہے۔ رافضی ہو تو عجب نہیں۔ یہ بیچارہ عامیوں کو اپنے ساتھ جہنم میں لے جانا چاہتا ہے۔ واللہ اعلم۔" کتبہ سید عبدالحق (ص ۱۷)

مولوی ارشاد حسین صاحب رام پوری (متوفی ۱۳۱۱ھ) جنھوں نے حضرت میاں صاحب کی کتاب "معیار الحق" کی تردید میں "انتصار الحق" لکھی تھی۔ ان کا فتویٰ بھی اس کتاب میں ہے اور انھوں نے بھی اہلحدیث کو "فرقہ ضالہ مخالف فرقہ ناجیہ اہل سنت والجماعت" وغیرہ کہا ہے۔ مگر ان کے ایک شاگرد نے ان سے بھی بکمر ٹپا دیا ہے۔ یا

یوں کہیے کہ بزرگوں کے ان فتووں کا جو مقصد تھا اس کو یہ سعادتمند شاگرد سمجھ گیا۔ اور صاف صاف لفظوں میں ادا کر دیا۔ چنانچہ اس نے لکھدیا کہ "ہندوستان کے اس شیخ نجد کا مقابلہ شمشیر دست و زبان کے ذریعہ کیا جائے۔" لکھتے ہیں:

"ان حضرات مشیخت مآب حاسدین، مفسدین دین و معاندین مجتہدین و مقلدین اور ان کے مریدین و معتقدین کے حق میں جن کو حضرت حق جل جلالہ نم نوالہ نے آزادی کا طوق گلے میں ڈال کر ہندوستان کا شیخ نجد بنا کر چھوڑا ہے۔ جس قدر شمشیر دست و زبان کے ذریعہ سے مقابلہ بر محل کیا جائے تھوڑا ہے۔ فی الحقیقت یہ سب کے سب ضال اور مضل ہیں، اور سلسلہ مذاہب اربعہ فقہ سے خارج ہو کر محمدی بنکر دین محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں رخنہ انداز و مخل اور ان کے عقائد پر مکاید منجر بکفر و شرک و الحاد۔ ۔ ۔ ۔ کتبہ العبد الآثم ابوالمجیس معین الدین محمد عبدالجلیل،" (یہاں موصوف کی مہر ہے جس کے ساتھ یہ عبارت لکھی ہوئی ہے۔) "زہے تلمیذ حضرت مولانا محمد ارشاد حسین صاحب"

(جامع الشواہد ص ۱۹، ۲۰)

بتائیے! "زبان کی تلوار" کا کام تو یہ فتوے کر ہی رہے تھے۔ اس کے بعد "شمشیر دست" (ہاتھ کی تلوار) کے ذریعہ مقابلہ کرنے پر برانگیختہ کرنے کا مطلب اس کے سوا اور کیا تھا؟ کہ ان غیر مقلدوں کو اور ان کے "شیخ" کو ڈنڈوں سے مارا جائے، بلکہ ان کو قتل بھی کر دیا جائے تو تھوڑا ہے۔

اب مولانا محمد صاحب لودھیانوی کی تالیف "انتظام المساجد باخراج

اہل الفتن والمفاسد ، (جس کا ذکر پہلے آیا ہے) کا حال سنیئے : اس میں بھی چند سوالات استفتاء کی شکل میں پیش کر کے ان کے جوابات دیئے گئے ہیں لیکن کسی مستفتی کا نام و پتہ درج نہیں ہے۔ اس لیے کچھ عجیب نہیں کہ مفتی صاحب نے اپنے جوابات ذہن میں رکھ کر انھیں کے مناسب سوالات بھی خود ہی مرتب کیے ہوں۔
بہرحال پہلے سوال میں جو چند عقائد اور مسائل اہلحدیث علماء کی طرف منسوب کر کے ذکر کیے ہیں، انھیں میں یہ مسئلہ بھی بیان کیا ہے کہ :

(جو شخص) واسطے جواز مواکلت و مشارب اہل کتاب کے یہ سند افترائی گزارے کہ جو قروط بآمیزش چربی خنزیر طیار کیے ہوئے اہل کتاب کے یمن سے آیا کرتے تھے معاذ اللہ آنحضرت اون کو کھایا کرتے تھے جیسا کہ مولوی عطا محمد ہوشیار پوری نے رسالہ اظہار الحق میں لکھا ہے اور اس رسالہ پر مواہیر مولوی نذیر حسین اور مولوی محمد حسین لاہوری وغیرہ کی ثبت ہو کر لاہور میں چھپ کر بادریان لودیانہ کے پاس آیا اور اخبار نور افشاں میں دیر تک چھپتا رہا۔ (ص ۲، ۳)

یہی الزام " جامع الشواہد " کے مندرجات کے ذکر کے سلسلہ میں ابھی آپ پڑھ چکے ہیں۔ دونوں کی عبارتوں پر غور کیجیے تو بالکل نمایاں اختلاف بیان نظر آئے گا۔ دونوں کے بیان کا یہ فرق تو غیر معمولی ہے کہ خنزیر ... کی چربی کی آمیزش والی یہ چیزیں ملک شام سے آتی تھیں۔ (جیسا کہ جامع الشواہد میں ہے) یا ملک یمن سے (جیسا کہ انتظام المساجد میں ہے) بڑا فرق جو ہے وہ یہ کہ " جامع الشواہد " کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ رسالہ " اظہار الحق " مولوی عطا محمد کا لکھا ہوا نہیں تھا۔

یہ رسالہ لکھا ہوا، تو کسی دوسرے کا ہے، البتہ اس میں مولوی عطا محمد کا فتویٰ مندرج ہے اور اسی فتوے میں چربی والی چیزوں کی یہ روایت بھی ہے۔ اس کے برخلاف "انتظام المساجد" کی یہ عبارت "جیسا کہ مولوی عطا محمد ہوشیار پوری نے رسالہ "اظہار الحق" میں لکھا ہے" اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ رسالہ اظہار الحق مولوی عطا محمد کا لکھا ہوا ہے، حالانکہ یہ بات غلط ہے۔ اس بارے میں جامع الشواہد ہی کا بیان صحیح ہے۔ رسالہ اظہار الحق خان احمد شاہ قائم مقام اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہوشیار پور کا مرتب کیا ہوا اور شائع کیا ہوا ہے۔ انھوں نے چند فتوے علمائے دہلی و لاہور و امرتسر و کپورتھلہ و ہوشیار پور وغیرہ سے حاصل کر کے اس میں شامل کیے ہیں۔

(دیکھو ابراء اہل الحدیث والقرآن مما فی جامع الشواہد من التہمۃ والبہتان ص ۸۵)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "انتظام المساجد" کے مولف نے خود رسالہ اظہار الحق دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ سنی سنائی باتوں پر اعتماد کر لیا ہے۔ یا ہو سکتا ہے "نور افشاں" میں عیسائیوں نے اس کے نقل کرنے میں کچھ گڑبڑ کی ہو اور موصوف نے اسی کو اپنا ماخذ بنایا ہو لیکن یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ایسے شدید اور سنگین الزام کے لیے جس کی بنا پر کفر و ارتداد کا فتویٰ دیا گیا ہو، اتنے تساہل اور غفلت سے کام لیا جائے۔

اس کے بعد "انتظام المساجد" کی اس عبارت میں کہ "اس رسالہ پر مولوی نذیر حسین اور مولوی محمد حسین لاہوری وغیرہم کی ثبت ہیں۔" وہی تلبیس اور فریب کاری پوشیدہ ہے جس کی تفصیل رسالہ جامع الشواہد کے بیان کے سلسلہ میں گزر چکی یعنی مولانا سید نذیر حسین صاحب وغیرہ اور علمائے اہلحدیث کا دستخط اور مہر سرے سے اس فتویٰ

پر نہیں ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق مذکورہ بالا روایت کا ذکر ہے۔ ان حضرات کی مواہیر اس سے بالکل الگ ایک دوسرے فتوے پر ہیں جس کو ہم نے پچھلے صفحات پر نقل کر دیا ہے، لیکن لودیانوی صاحب نے کسی تحقیق و تفتیش کے بغیر کفر و ارتداد کا فتویٰ داغ دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"اور افترار مندرجہ استفتاء درباب اکل قرط مذکورہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کفر صریح اور ارتدادِ قبیح ہے" (ص ۵)

اس کے بعد "تحفۃ الاخیار فی عصمۃ الانبیاء" سے ایک طویل عربی عبارت نقل کی ہے جس میں کسی نبی کی توہین کرنے والے کے متعلق احکام بیان کیے گئے ہیں، اس کا خلاصہ لودیانوی صاحب ہی کے الفاظ میں یہ ہے لکھتے ہیں۔

"خلاصہ مطلب اس کلام کا یہ ہے کہ آنحضرت پر افترار کرنے والا مرتد ہے اور احکام اہلِ اسلام پر لازم ہے کہ اس کو قتل کریں، اور عذرداری اس کی بایں وجہ کہ مجھ کو اس کا علم نہیں تھا شرعاً قابلِ پذیرائی نہیں بلکہ بعد توبہ کے بھی اس کو مارنا لازم ہے۔ . . . . اور علماء اور مفتیان وقت پر لازم ہے کہ بمجرد مسموع ہونے ایسے امر کے اس کے کفر اور ارتداد کا فتویٰ دینے میں تردد نہ کریں، ورنہ زمرۂ مرتدین میں یہ بھی داخل ہوں گے، اور عوام اہلِ اسلام پر لازم ہے کہ بمجرد وقوع ایسے مفسدہ کے مدعی اور گواہ ہو کر حکام سے سزایابی اس کے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کریں۔" (ص ۱)

اللہ اکبر! کیا ٹھکانہ ہے ان اشتعال انگیزیوں اور فتنہ سامانیوں کا علماء اہلِ زمانہ سے کہا جا رہا ہے ان غیر مقلدوں کو بلا تردد کافر و مرتد ہونے کا فتویٰ دو۔

جو ان کے کفر میں شک کرے اس کو بھی کافر کہو، ان کو مسجدوں سے نکلواؤ۔ عوام سے کہا، ان پر مقدمے دائر کرو ان کے خلاف عدالتوں میں جاکر شہادتیں دو۔ ان کو سزائیں دلواؤ جیل بھجواؤ، الغرض ان کو پریشان کرنے کے لیے اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرو۔ ان کے خلاف جو کچھ کرسکتے ہو کر گزرو۔ ان سب باتوں کے باوجود کلیجہ ٹھنڈا نہیں ہوا تو صاف صاف کہدیا کہ حکام اہل اسلام پر لازم ہے کہ ان کو قتل کریں، توبہ کے بعد بھی ان کو مارنا لازم ہے مانا کہ یہ کسی عربی عبارت کا ترجمہ اور خلاصہ ہے۔ لیکن لودھیانوی صاحب نے تو اس کو چسپاں اہلحدیثوں پر ہی کیا ہے، اور انھیں کو اس کا مصداق ٹھہرا کر اس موقع پر اس کو پیش کیا ہے۔ چنانچہ آگے کے صفحات پر انھوں نے خود ہی اس کو ظاہر کردیا ہے۔ ص۔ ۱ کے اس سوال کو اور اس کے جواب کو پڑھیے، لکھا ہے:

سوال:۔ بعض غیر مقلد امور مذکورہ استفتاء سے اپنی برءیت ظاہر کرتے ہیں۔

جواب:۔ اگرچہ بعض غیر مقلدین بظاہر کلمات مذکورہ سے برءیت اپنی بیان کرتے ہیں، لیکن چونکہ موالات اور معاونت ان کی مدنظر رکھتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی مقدمہ غیر مقلدین کا ساتھ اہل سنت کے ہندوستان یا بنگالہ یا پنجاب وغیرہ میں واقع ہو۔ چندہ جمع ہوکر روانہ ہوتا ہے اور بذریعہ خطوط تحریری مدد پہنچتی ہے۔ پس یہ لوگ بھی بموجب آیت ومن یتولھم منکم فانہ منھم۔ اسی فریق میں داخل ہوئے اگرچہ ایسے اشخاص کی نسبت ہم فتویٰ صراحۃً کفر اور ارتداد کا نہیں دے سکتے لیکن اخراج ان کا بھی مساجد سے ضرور ہے۔ کیونکہ خلط ملط ہونے ان کے سے عقائد عوام کے بگڑ کر اہل سنت کو سخت صدمہ پہنچتا ہے۔ اور اخراج ان کا داخل ظلم نہیں

بلکہ عین عدل ہے ...... الراقم محمد ولد مولوی عبدالقادر صاحب مرحوم لودھیانوی حال وارد عظیم آباد۔"

اس سوال و جواب کے بعد تو کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ لدھیانوی صاحب نے یہ ساری اشتعال انگیزیاں اہلحدیثوں ہی کے خلاف کی ہیں۔ اور انہیں کی ایذار سانی کے لیے علماء اور عوام اور حکام سب کو بھڑکایا ہے۔

اس سوال و جواب کی دسیسہ کاریاں بھی قابل ملاحظہ ہیں، بڑی ہوشیاری سے غیر مقلدوں (اہلحدیثوں) کو اقراری مجرم" بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں: "بعض غیر مقلد کلمات مذکورہ استفتار سے اپنی بریت بیان کرتے ہیں اور وہ بھی "ظاہر میں" گویا اکثریت کو تو "ظاہر" میں بھی ان الزامات سے انکار نہیں ہے۔ اور باطن میں تو سبھی کو تسلیم ہے کہ استفتار میں جتنی باتیں مولانا سید نذیر حسین صاحب یا دوسرے علمائے اہلحدیث کی طرف منسوب کی گئی ہیں، وہ سب حق اور درست ہیں۔ کیا کہنا ہے اس سادگی اور معصومیت کا؟

بتائیے! اگر اس وقت ہندوستان میں حنفی مذہب کی حکومت رہی ہوتی تو ان فتووں کے بعد غریب اہلحدیثوں کو کہیں پناہ ملتی؟ اور حضرت میاں صاحب کو اس سرزمین پر زندہ رہنے کا حق دیا جاتا؟ ہم تو اس کو اپنے ان بزرگوں کی کرامت ہی سمجھتے ہیں، جنہوں نے دیوبندی اور بریلوی دونوں مکتب فکر کے مفتیوں کی اس متفقہ یورش کے باوجود تحریک اہلحدیث کو ہندوستان میں نہ صرف یہ کہ زندہ رکھا بلکہ جان کی بازی لگا کر اس کو فروغ دیا اور پروان چڑھایا ؏

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

لودھیانوی صاحب اور ان کے مؤیدین کی منشا کے مطابق حنفی مفتی صاحبان

اور عوام نے تو اپنا کام جاری کر رکھا تھا، لیکن ان کا وہ آخری منصوبہ جس کے لیے انھوں نے "حکام اہلِ اسلام" کو برانگیختہ کیا تھا، اس کی تکمیل کی ہندوستان میں گنجائش نہیں تھی۔ اس لیے میاں صاحب کو یہ خطرہ محسوس ہوا اور بالکل بجا محسوس ہوا کہ حجاز کی حنفی حکومت کو اس منصوبہ کی تکمیل کے لیے بھڑکایا جائے تو تعجب نہیں۔ جیسا کہ وہ ہندوستانی علماءِ احناف جو اس وقت مکہ معظمہ میں مقیم تھے، ان میں سے بعض کے متعلق حاجیوں کی زبانی اس قسم کی دھمکی کی بات مشہور بھی ہوگئی تھی۔ مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی مرحوم نے مولوی رحمت اللہ صاحب کیرانوی (ضلع مظفر نگر) کی بابت لکھا ہے کہ وہ مکہ مکرمہ میں اہلحدیث کے ساتھ بڑی دشمنی رکھتے تھے اور ان کی ایذا رسانی کے درپے رہتے تھے۔ خصوصاً مولانا سید محمد نذیر حسین صاحب کی تکلیف دہی کے فکر میں رہنا ایک مدت سے مشہور ہے۔ تھوڑا عرصہ ہوا کہ مکہ میں بعض لوگ بارادہ حج پہنچے تو اس کی زبان سے یہ بات سن آئے ہیں کہ اگر مولوی سید نذیر حسین ایک دفعہ یہاں مکہ میں آجاوے تو پھر جان سلامت نہ لیجاوے۔ یہ بات مجھے ایسے اشخاص سے پہنچی ہے جس کو میں ولی مادر زاد کہہ سکتا ہوں اور میں خود بھی جبکہ مکہ میں مقیم تھا مولوی رحمت اللہ کی زبان سے مولانا ممدوح کے حق میں مغلظ دشنام سن چکا ہوں۔ اسی دن سے میں نے مکہ سے کوچ کرنے کا قصد کیا، ورنہ میں حج کے بعد سال بھر کا ارادہ قیام رکھتا تھا، جس سے صرف چار پانچ مہینے کا عرصہ گزرا تھا۔" (اشاعۃ السنۃ ج ۶ ۲ ص ۲۹)

ان تفصیلات سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ میاں صاحب کو جو خطرہ محسوس ہوا تھا وہ محض خیالی نہیں تھا بلکہ وہ ان واقعات پر مبنی تھا جو ان کی نگاہوں کے سامنے تھے۔ تو اب ہمیں انصاف سے بتایا جائے کہ ایسے سنگین حالات

میں کیا انسانی فطرت کا تقاضا یہی تھا کہ میاں صاحب اپنی حفاظت کے لیے مناسب تدابیر پر غور نہ فرماتے؟ اور ان کیلیے جدوجہد نہ کرتے؟ اگر نہیں تو پھر حجازی حکومت (حکومت کے لفظ کو ذہن میں رکھیے) کے کسی فیصلہ پر دباؤ ڈالنے والی تدبیر اس کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی کہ میاں صاحب برطانوی حکومت کی رعایا ہونے کی حیثیت سے برطانوی قونصل مقیم جدہ کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کرتے؟ ان حالات کو نظر انداز کر کے خواہ مخواہ اس معاملہ کو انگریز کی وفاداری کا معنیٰ پہنانا یقیناً تاریخ پر ظلم ہے۔

ہندوستان سے لیکر مکہ تک کے علمائے احناف درپے آزار تھے

اس موقع پر حضرت میاں صاحب قدس سرہ کی عاقبت اندیشی اور ایمانی فراست کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان کی دوربین نگاہوں نے اپنے سفر حج میں پیش آنے والے جن خطرات کو بھانپ لیا تھا وہ آخر ان کو پیش آکر رہے۔ اور کیوں نہ پیش آتے جبکہ ہندوستان سے لیکر مکہ معظمہ تک کے ہندوستانی علماء احناف اس کے درپے تھے۔ مولانا آزاد مرحوم کا یہ بیان ایک بار پھر پڑھیے۔

"ہندوستان میں چونکہ اس وقت تقلید اور عدم تقلید کا فتنہ زور پر تھا۔ اور مولانا نذیر حسین غیر مقلدین کے سب سے بڑے شیخ سمجھے جاتے تھے، فوراً مکے میں اطلاع دیدی گئی کہ وہابیہ کا سب سے بڑا سرغنہ آرہا ہے، اگر یہاں کوئی کارروائی نہ کی گئی تو اس بات کو وہابی حجاز میں اپنی فتح سے تعبیر کریں گے، اور عوام کو اس سے بہت فتنہ ہوگا۔"

اب آیئے ! تاریخ کے اوراق میں ہم ڈھونڈیں کہ اس "اطلاع" کے مطابق کہ میں "وہابیہ کے سب سے بڑے مرغنہ کے ساتھ کوئی "کارروائی" کی گئی یا نہیں؟ اگر کی گئی تو وہ کون سے اصحاب تقویٰ ہیں جنھوں نے یہ خدمت انجام دی ؂

لاؤ تو قتل نامہ ذرا میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مُہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی،

ایک ٹولی نے پیچھا کیا اور راستہ بھر پریشان کرتی رہی:

مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم کے رسالہ "اشاعۃ السنۃ" جلد ششم اور "الحیاۃ بعد المماۃ" میں اس کی تفصیلات شائع ہوئی ہیں۔ انھیں دونوں سے کچھ اقتباس ہم یہاں تلخیص و اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں، مولانا بٹالوی لکھتے ہیں:

" مولانا ممدوح دہلی سے روانہ ہوئے تو آپ کے حریف نے بھی چند اشخاص کو مختلف مواضع پنجاب، دیوبند، دہلی، بدایوں وغیرہ سے گلابی چوورقہ[1] رسالہ کے ساتھ روانہ کیا۔ پہلے تو یاروں نے بمبئی پہنچ کر

---

[1] گلابی چوورقہ رسالہ سے مراد رسالہ "جامع الشواہد" ہے جیسا کہ مولانا بٹالوی نے اشاعۃ السنۃ میں دوسری جگہ لکھا ہے "اور ایک چوورقہ رسالہ گلابی موسومہ بجامع الشواہد فی اخراج الوہابیین عن المساجد۔ تمام دنیا میں مشتہر کیے۔" (ج ۶ شمارہ ۸ ص ۲۲۴) یہ رسالہ پہلے گلابی رنگ کے کاغذ پر چھپا تھا، پھر دوبارہ کچھ فتووں کا اضافہ کرکے زرد رنگ کے کاغذ پر چھپا اور شائع ہوا۔ مولانا بٹالوی کی لکھتے ہیں۔ "اور گلابی چوورقہ ←

مولانا ممدوح پر وار کرنا چاہا۔ اور چند علماء بمبئی کو اپنے ساتھ ملا کر اس گلابی چو ورقہ کے سوالات میں کچھ اور کفریات بڑھا کر مولانا ممدوح کے سامنے پیش کیا، جس سے مقصود ان حضرات کا صرف یہ تھا کہ ان سوالات سراسر افتراءات کو سن کر مولانا ممدوح اور آپ کے رفقاء کو خواہ مخواہ طیش و جوش آوے گا اور اس سے معاملہ طول پکڑے گا۔ مگر مولانا ممدوح ان کی غرض فساد کو تاڑ گئے۔ جب ان سوالات کو پڑھوا کر سنا تو برملا صاف صاف فرما دیا کہ یہ سب باتیں مجھ پر بہتان ہیں اور میں ان کے معتقد کو کافر جانتا ہوں، اس سے زیادہ کچھ اور ان کے ساتھ بحث و مباحثہ میں الجھنا مناسب نہیں سمجھا۔"

جب آپ بمبئی میں جہاز پر سوار ہوئے تو مخالفین بھی اسی اسٹیمر میں سوار ہوئے۔ اور وہاں بھی چھیڑ چھاڑ سے باز نہ آئے بلکہ ہمیشہ ہر قسم کی ایذا رسانی کی تاک میں لگے رہے۔ مگر آپ نے بمصداق واعرض عن الجاھلین، کسی کو بھی منہ نہ لگایا، اور ان لوگوں کو بھی اپنی کسی سازش میں کامیابی نہیں ہوئی، زیادہ تر وجہ اس کی یہ

---

* جو زرد رو ہو کر ۲۰ صفحوں میں مطبع فیض عام دہلی میں دوبارہ چھپا ہے اور اس پر لودھانہ، ہاپوڑ، دیوبند، گنگوہ، رام پور وغیرہ کے علماء کی مہریں زیادہ کی گئی ہیں۔

(جلد ۶، منظ ۲۹۶)

یہی زرد کاغذ والا دار المصنفین اعظم گڈھ میں موجود ہے اور اسی سے ہم نے استفادہ کیا ہے۔ ۱۲ منہ

تھی کہ ان مخالفین کو برٹش قونصل مقیم جدہ کا ڈر لگا ہوا تھا۔ جس نے پھیٹوں کے دیکھنے کے بعد آپ کی بہت تعظیم وتکریم کی، اور جب تک جہاز کامران میں رہا وہ روز آپ کی ملاقات کے لیے آتا رہا۔

مگر افسوس کہ وہ کامران ہی میں مفسدین سوڈان کے ہاتھوں سے قتل ہوگیا، اگر وہ جدہ میں واپس آتا تو یقیناً مکہ معظمہ کے معاملات میں نہایت قیمتی امداد کرتا۔

مکہ معظمہ میں میاں صاحب کے خلاف افسوسناک ریشہ دوانیاں:

جب مولانا ممدوح مکہ شریف پہنچے اور ان کے حریف بھی وہاں داخل ہوئے تو مولانا ممدوح کو جام شہادت پلانے یا مکہ میں قید کرانے کے لیے ان حضرات نے وہاں ایک کمیٹی مقرر کی، جس کے پریسیڈنٹ مولوی رحمت اللہ کیرانوی تھے، اور ممبروں میں حاجی امداد اللہ، مولوی عبدالقادر بدایونی، مولوی خیر الدین اور چند اشخاص دیوبند وغیرہ کے تھے۔ اس کمیٹی کی رات دن کارروائی اور تدبیر آرائی یہ تھی کہ جس طرح ہو سکے مولانا کو یہاں شہید کرادیں، یا حبس دوام میں پھنسا دیں.... مگر حج کے زمانے میں چونکہ عام ساکنان مکہ (مطوف، موذن، مولوی، مفتی، قاضی، گواہ وغیرہ) بھی فلوس کمانے کے لیے حاجیوں کے ارد گرد پھرتے ہیں اور گھر گھر کا طواف کرتے ہیں۔ اس لیے تا فراغ حج کوئی کسی سے تعرض نہیں کرتا۔ اس وجہ سے اس کمیٹی کی کوششوں کا نتیجہ افسوس کے سوا اور کچھ ظاہر نہ ہوا کہ انھوں نے اپنے خیالی اور جعلی مقدمے کے لیے گواہوں کو (جن کی تعداد پاشاہ مکہ کی تقریر آئندہ سے ساڑھے تین سو معلوم ہوتی ہے۔) سکھا پڑھا کر آمادہ کر رکھا تھا اس دوران میں مقدمہ عدالت میں پیش نہ ہوا۔ الحمد للہ مولانا ممدوح نے اطمینان سے

فریضہ حج ادا کیا ۔ دسویں ذی الحجہ کے بعد تین دن (۱۱، ۱۲، ۱۳، ذی الحجہ) تک میاں صاحب نے منیٰ میں قیام فرمایا اور تینوں دن برابر وعظ فرماتے رہے، جس میں شرک و بدعت سے اجتناب اور عمل بالحدیث کی ترغیب، رسومات بد کی تردید اور خاص اہل مکہ کی بدعتوں کی اصلاح کا بیان تھا۔ یہ وعظ عربی اور فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں ہوتا تھا۔ کیونکہ منیٰ میں مختلف ملکوں کے لوگ موجود تھے۔ اس وعظ و تذکیر سے معاندین کی آتش عداوت و حسد اور تیز ہو گئی تو میاں صاحب کے شاگرد اور رفیق سفر مولوی تلطف حسین صاحب عظیم آبادی نے بمنت و سماجت عرض کیا کہ یہ وعظ بند فرما دیں۔ یہ جو کمیٹیاں ہماری نسبت رات دن ہو رہی ہیں یہ اپنا اثر دکھائے بغیر نہ رہیں گی۔ مخالفین کی سازش بہت گہری ہو چکی ہے۔ اب جان کی خیر نظر نہیں آتی۔ آپ حج سے فارغ ہو چکے ہیں۔ آپ کے لیے بہتر یہی ہے کہ (مدینہ طیبہ جانے کا ارادہ فسخ کر دیں) اب بہت جلد وطن واپس ہو جائیں۔

اس کے جواب میں میاں صاحب نے صاف صاف کہدیا: "سنو صاحب! بہت جی چکا اب زندگی کی تمنا نہیں ہے۔ امام نسائی بھی اسی حرم میں شہید ہوئے تھے۔ جہاں میرے قتل کے منصوبے ہو رہے ہیں، میں ہر وقت اپنے قتل کے لیے آمادہ ہوں مگر اس تبلیغ سے باز نہ آؤں گا۔"

اس وعظ کا ذکر میاں صاحب نے اپنے ایک مکتوب میں بھی فرمایا ہے لکھتے ہیں:

"در مکہ و منیٰ متضمن احیاء سنت و اماتت بدعت روزانہ چیزے می گفتم حالانکہ شرغہ دشمنان دین بود، از خدا می خواستم کہ مثل امام نسائی جان را آنجا دہم، چہ کنم کہ خاک ہندوستان و آب و ہوا دہلی مرا نگذاشتہ۔"

مکاتیب نذیریہ ص ۱

یعنی مکہ و منی میں احیارِ سنت اور ردِ بدعت کے بارے میں روزانہ وعظ کہتا تھا۔ حالانکہ دشمنانِ دین کے نرغہ میں تھا۔ خدا سے چاہتا تھا کہ امام نسائیؒ کی طرح میں بھی اپنی جان اسی جگہ دیدوں، لیکن کیا کروں کہ ہندوستان کی خاک اور دہلی کی آب و ہوا نے مجھ کو نہیں چھوڑا۔ "

ان خطرناک سازشوں اور افسوس ناک ریشہ دوانیوں کے باوجود میاں صاحب نے مدینہ طیبہ کی حاضری کا ارادہ فسخ نہیں کیا، اور ۲۳ رذی الحجہ تک مکہ معظمہ میں اسی انتظار میں ٹھہرے رہے کہ حاجیوں کا کوئی قافلہ مدینہ منورہ تک روانہ ہو تو وہ بھی ساتھ ہو لیں۔ ادھر مخالف کمیٹی کے ممبروں کو اپنی گہری اور سازشی کارروائیوں پر ہر طرح اطمینان ہو چکا تھا۔ انھوں نے اپنے خیال میں میاں صاحب کے خلاف پورا مواد جمع کر لیا تھا۔ اس لیے اسی تاریخ کو پاشا رمکہ کے یہاں مخبری کرادی کہ مولوی نذیر حسین معتزلی اور وہابی ہیں اور ان کے ایسے ایسے عقائد ہیں۔

کیس کی تیاری میں ہندوستانی فتووں سے کام لیا گیا:

میاں صاحب کے خلاف جو کیس تیار کیا گیا تھا، اس کا مسالہ کہاں کہاں سے جمع کیا گیا تھا اور اس کو کس "دیانتداری" کے ساتھ ترتیب دیا گیا تھا اس کا حال مولانا آزاد کی زبانی سنیے، فرماتے ہیں:

" اس زمانے میں ہندوستان میں ایک فتویٰ "جامع الشواہد فی اخراج الوہابیین عن المساجد" کے نام سے مرتب ہوا تھا۔ اس میں چند عقائد تو واقعی اس جماعت کے تھے اور بڑا حصہ منسوبات کا تھا، یا خود الزامی

طور پر ان کے عقائد کا استخراج کیا گیا تھا، مثلاً شحم خنزیر کی حلت، بولِ طفل صغیر کی طہارت، مادہ انسانی کا پاک اور قابلِ اکل ہونا، خالہ سے مناکحت کا جواز، اور جوازِ کذب باری تعالیٰ وغیرہ وغیرہ،

والد مرحوم نے مولانا نذیر حسین مرحوم کے عقائد کی فہرست زیادہ تر اسی جامع الشواہد سے اخذ کی تھی۔ البتہ معیار الحق سے تقلید شخصی کے عدم وجوب اور التزام و تعیین تقلید شخصی کے مفاسد اور امام صاحب کی تابعیت سے تاریخی طور پر انکار، اور تحدید دہ در دہ کی عدم صحت، اور تحدید قلتین کی عدم صحت اور بعض دیگر مسائل مختلف فیہ میں مذہب محدثین کی توثیق وغیرہ کو لے کر اہانت رنگ آمیزی کے ساتھ ترجمہ کیا گیا تھا اور یہ استدلال کیا گیا تھا کہ ان سے امام صاحب کی تحقیر و توہین مقصود ہے۔"

(آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی ص ۱۰۴)

اس اقتباس میں مولانا آزاد کا یہ جملہ خاص طور سے قابلِ توجہ ہے کہ "بہت رنگ آمیزی کے ساتھ ترجمہ کیا گیا تھا"۔ یہ اس کیس کا حال ہے جس کی سازش میں حاجی امداد اللہ صاحب جیسے بزرگ بھی شامل تھے جو دیوبندی حضرات کے پیروں کے پیر تھے۔

مخالفین کی مخبری کے بعد میاں صاحب اور ان کے ساتھیوں پر کیا گزری؟ اس کی تفصیلات کیلئے رسالہ "اشاعۃ السنۃ" کے اقتباسات نقل کرنے کے بجائے ہم مولانا آزاد کا بیان نقل کر دینا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔ مولانا آزاد فرماتے ہیں۔

مکہ میں میاں صاحبؒ کی گرفتاری اور شریفِ مکہ کے سامنے پیشی:

بہر حال نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا نذیر حسین اور مولانا تلطف حسین عظیم آبادی مع ایک اور رفیق کے گرفتار کر لیے گئے، اور ایک نہایت تنگ و تاریک مجلس میں قید کر دیے گئے۔

چند دن بعد ان کو شریف نے بلایا، اور جب انھوں نے اپنی گرفتاری کی وجہ پوچھی تو کہا وہابی عقائد رکھنے کی وجہ سے گرفتار کیا گیا ہے۔ مکہ معظمہ اسلام کا اصلی مرکز ہے۔ اس لیے ہمارے لیے ضروری ہے کہ فاسد عقائد رکھنے والوں کا احتساب کریں، تاکہ وہ مسلمانوں کو گمراہ نہ کر سکیں۔

دوسرے دن شریف کے یہاں ایک مجلس منعقد ہوئی، اور اس میں والد مرحوم سے کہا گیا کہ ان کے عقائد کی فہرست پیش کریں۔ فہرست میں سب سے پہلا الزام امام صاحب کی توہین کا تھا، اور باقی مذکورہ الزامات تھے۔ مولانا نذیر حسین مرحوم کی طرف سے مولوی تلطف حسین تقریر کرتے تھے۔ سب سے پہلے انھوں نے اس حالت پر افسوس کا اظہار کیا کہ ہم ایک ایسے ملک میں رہتے ہیں جہاں کفار کی سلطنت ہے، لیکن وہاں ہمارے عقائد کی وجہ سے ہمیں کوئی گزند نہیں پہنچایا جاتا، یہاں اسلامی حکومت ہے، دار الامن ہے اور بلا کسی وجہ کے ہم کو گرفتار کر کے مبتلائے محن کیا جاتا ہے، پھر کہا کہ ہم پر یہ الزام کہ ہم وہابی ہیں اور محمد بن عبد الوہاب کی جماعت سے ہیں بالکل غلط ہے۔ ہم قرآن و حدیث کو مانتے ہیں اور اسی پر عمل کرتے ہیں، اس پر والد مرحوم نے کہا کہ اجماع و قیاس کو بھی مانتے ہو؟ مولانا نذیر حسین نے کہا کہ ہاں ہم اجماع اور قیاس کو اسی طرح مانتے ہیں، جس

طرح ائمہ مجتہدین مانتے تھے، اس پر گفتگو شروع ہوئی اور بہت قال وقیل ہوئی۔ اس کے بعد کہا گیا کہ ائمہ اربعہ کی نسبت تمہارا کیا عقیدہ ہے؟ انھوں نے کہا ہم انھیں اپنا سرتاج و پیشوا اور برسر حق سمجھتے ہیں، اور ان میں امام ابوحنیفہؒ کو سب سے زیادہ قابلِ احترام سمجھتے ہیں۔ اس پر معیار الحق پیش کی گئی۔ انھوں نے کہا کہ اگر اس طرح کے مباحث امام صاحب کے توہین ہیں تو وہ تمام کتابیں بھی توہین پر ہوں گی جن میں مسائل مختلف فیہ پر بحث کی گئی ہے اور خود سلف نے لکھی ہے۔ پھر ایک ایک کر کے تمام الزامات سنائے گئے، انھوں نے بڑے جوش سے اپنی برأت ظاہر کی، اس پر ثبوت میں جامع الشواہد پیش کی گئی، انھوں نے کہا کہ یہ مخالفین کی چیز ہے اور ہم اس کے ذمہ دار نہیں۔ اس پر کسی پشاوری کا ایک رسالہ پیش کیا گیا، جو مولانا نذیر حسین کا شاگرد تھا، مگر انھوں نے اس سے بھی اپنی بے تعلقی ظاہر کی۔"

اس سے آگے مولانا آزاد فرماتے ہیں:

"معلوم ہوتا ہے مولانا نذیر حسین مرحوم، مجمل و مختصر بیان دے کر معاملے کو ختم کرنا چاہتے تھے، کیونکہ سمجھتے تھے، تفصیلات میں پڑنا یا مباحثہ کرنا، طاقت کے مقابلے میں بے کار ہے۔ آخر میں انھوں نے اس بیان پر اکتفا کی کہ ہمارا عقیدہ اہلِ سنت والجماعت کا ہے، ائمہ اربعہ کو ہم مانتے ہیں، چاروں کو ہم حق پر سمجھتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ کو اپنا پیشوا جانتے ہیں۔ ان کے بغض کو خلافِ شیوۂ ایمانی سمجھتے ہیں، اور کتب فقہ پر عمل کرنا جب تک قرآن و حدیث کے

خلاف نہ ہو، خود ہمارا شیوہ ہے۔

مولانا آزاد کے والد میاں صاحب کے اس بیان سے کیوں مطمئن ہوتے، وہ تو میاں صاحب کو مصائب میں مبتلا کرنے کے لیے بہلانے کی تلاش میں تھے۔ اس لیے میاں صاحب کے اس بیان کو انھوں نے "مکاید وہابیہ" قرار دیا۔ چنانچہ مولانا آزاد فرماتے ہیں:

"یہ بیان علمائے حجاز کے لیے ایک حد تک تشفی بخش ہو جاتا، لیکن جیساکہ والد مرحوم کہا کرتے تھے وہ اِن باتوں کو وہابیوں کے "مکاید" تصور کرتے تھے، کہتے تھے کہ میں نے یہ مکاید نہ چلنے دیے اور کہا تفصیلاً بتاؤ کہ ائمہ اربعہ میں کس امام کی تقلید کرتے ہو۔؟ اور فلاں فلاں مسائل میں تمھارا کیا اعتقاد ہے؟۔"

میاں صاحب نے اپنے عقائد کی بابت ایک تحریر پیش کی:

اس پر انھوں نے تیسری مجلس میں ایک تحریر پیش کی جس میں لکھا تھا کہ میں ائمہ اربعہ کی تقلید کو فرائض و واجبات شرعیہ کی طرح فرض نہیں سمجھتا، لیکن عوام کے لیے اور ان کے لیے جو فقہ و حدیث میں نظر نہیں رکھتے ہیں، جبتک قرآن و حدیث کے خلاف کوئی صریح بات پیش نہ آئے، کتب فقہ متداولہ پر عمل کرنے کو مستحسن سمجھتا ہوں، اس کے علاوہ فلاں فلاں عقاید اور الزامات جو میری طرف منسوب کیے گئے ہیں، میں ان سے بری ہوں اور حلفیہ کہتا ہوں کہ میرے اعتقاد وہ نہیں ہیں۔

اس کے آگے مولانا آزاد نے بتایا ہے کہ:

برٹش قونصل کی مداخلت سے میاں صاحب کی رہائی:

اس اثنا میں ان کی گرفتاری کی خبر جدہ میں برٹش قونصل کو پہنچ گئی، اور وہاں سے برابر زور دیا جا رہا تھا، بالآخر نو دن کے حبس کے بعد ان سے اس آخری تحریر پر دستخط کرائے گئے اور انھیں رہا کر دیا گیا۔

مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم نے "اشاعۃ السنہ" جلد ۱۵، ۱۰ میں جو تفصیلات لکھی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ میاں صاحب کے مخالفین و معاندین حضرات کی کمیٹی نے جو تجویز کی تھی۔ اس کے بعد کئی بار پاشاہ مکہ کے یہاں میاں صاحب کی طلبی اور پیشی ہوئی اور ہر بار برٹش کانسل مقیم جدہ کا نائب جو کہ مکہ میں رہتا تھا مداخلت کرتا رہا۔

چنانچہ مولانا موصوف لکھتے ہیں:

"مکہ مکرمہ میں برٹش کانسل مقیم جدہ کا اسسٹنٹ ایک مسلمان رہتا ہے۔ اس نے مولانا ممدوح اور آپ کے رفیقوں کو (جب وہ مکہ پہنچتے ہی ان سے ملے تھے اور اس کو انگریزی چٹھیاں دکھائیں، اور مخالفین کی تجویزات مخالفانہ سے اطلاع دی) یہ ہدایت کر دی تھی کہ آپ اطمینان سے اپنے شعائر مذہبی ادا کریں، اور کسی سے کوئی تعلق نہ رکھیں، اور جب کوئی بازپرس کی نوبت آئے تو مجھے فوراً مطلع کریں، اور اگر طلبی ہو تو بلا توقف پاشا کے ہاں چلے جائیں۔

۲۲ ذی الحجہ قریب دوپہر کے جب پاشا کے یہاں پہونچے تو نائب مذکور نے اپنے وکیل کو پاشا کے پاس بھیج کر دریافت کیا کہ برٹش گورنمنٹ کی رعایا کو آپ نے کیوں عدالت میں طلب کیا ہے؟ پاشا مکہ نے جواب دیا کہ لوگوں نے ان کی نسبت اس قسم کی شکایتیں کی ہیں۔ نائب کانسل کے وکیل نے کہا جن امور کی نسبت وہ شکایت کرتے ہیں، ان امور کے مرتکب یہ اس حدود میں نہیں ہوئے[1]۔ اس لیے اس سلطنت کا مؤاخذہ ناجائز ہے۔ یہ سن کر پاشا نے آپ کو رخصت کر دیا۔ یہ آنا اور جانا، سوال و جواب سب کچھ تقریباً ایک گھنٹہ میں ہو گیا۔

مخالفین کو یہ ناکامی بڑی شاق گزری۔ انھوں نے پھر ایک آخری کوشش کی، ساڑھے تین سو گواہ تیار کر کے پاشا کے سامنے اظہار دلوایا، اسی دن شام کے وقت پھر آپ کو مع ان سابق رفیقوں کے طلب کرایا۔ نائب کانسل کو معلوم ہوا تو خود حرم میں چلا آیا اور اپنے وکیل کو پاشا کے پاس بھیجا۔ پھر اسی طرح سوال و جواب ہونے لگے۔ آخر میں پاشا کی طرف سے جواب ملا کہ ہم نے ان کو حفاظت کے لیے

---

[1] اس جواب کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ مبینہ الزامات صحیح ہیں، بلکہ نائب کانسل کے وکیل نے اپنی بحث کو مختصر طور پر ختم کرنے کے لیے بطور مفروضہ کے یہ جواب دیا تھا، اس کا مقصد یہ تھا کہ بالفرض اگر یہ الزامات صحیح بھی ہوں تو یہ آپکی رعایا نہیں ہیں۔ اور نہ ان امور کا ارتکاب آپ کی حکومت کے حدود میں ہوا ہے۔ اس لیے آپ کو ان پر مؤاخذہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، ورنہ الزامات کی بابت میاں صاحب کا بیان گزر چکا کہ یہ سب جھوٹ اور افترا ہیں۔ ۱۲ منہ

اور مصلحتاً و احتیاطاً اپنے پاس رکھنا چاہا ہے۔ اگر ہم ان کو اس وقت بلا تحقیقات کے چھوڑ دیں گے تو کشت و خون ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ ان کے صدہا دشمن جو اس وقت جوش میں ہیں ان کو زندہ نہ چھوڑیں گے۔ یہ سن کر نائب کانسل اور اس کے وکیل نے مولانا ممدوح سے کہدیا کہ یہاں کسی آئین و قانون کی پابندی نہیں ہے۔ اور ہم اس سے زیادہ پاشا کو کچھ نہیں کہہ سکتے۔ آپ دیوان میں حاضر ہو جائیں، اور اس کی رپورٹ اپنے افسر برٹش کانسل مقیم جدہ کو کردی۔ (ملخص از ۲۹۹ تا ۳۰۱)

غالباً اسی کے بعد میاں صاحب کی گرفتاری عمل میں آئی اور بقول مولانا آزاد ایک نہایت ہی تنگ و تاریک محبس میں قید کر دیے گئے۔ جب برطانوی قونصل مقیم جدہ کو اطلاع ہوئی تو انھوں نے اس کارروائی پر اعتراض کیا۔ اسی کی مداخلت سے نو دن کے بعد ایک تحریر پر دستخط لے کر رہا کیے گئے۔

ان تاریخی واقعات کے سامنے آجانے کے بعد کیا شک باقی رہ جاتا ہے اس بات میں کہ جدہ کے برطانوی قونصل کے نام میاں صاحب نے جو چٹھیاں حاصل کی تھیں وہ ان کی عاقبت اندیشی اور فراست ایمانی کی دلیل ہے۔ ظاہری اسباب کی رو سے بلاشبہ ان چٹھیوں نے میاں صاحب کو بہت کچھ فائدہ پہنچایا۔ ان چٹھیوں ہی کا دباؤ تھا کہ برطانوی قونصل جو کہ رہا اور بار بار مداخلت کی۔ جس کی وجہ سے نہ پاشا؛ مکہ کو کسی خطرناک اقدام کی جرأت ہوئی اور نہ وہاں کے عوام کو۔ اگر ان چٹھیوں کا دباؤ نہ ہوتا تو بظاہر ہمارے علماء کرام کی گہری سازشوں اور خفیہ کارروائیوں کی بدولت میاں صاحب کی جان عزیز بچنے کی توقع نہ تھی۔ مگر اللہ نے ایسے اسباب پیدا کر دیے، جن سے یہ خطرہ پیش نہ آیا۔ یہ سچ ہے۔ ع

دشمن چہ کند چوں مہرباں باشد دوست

میاں صاحب کی بابت غلط بیانیاں

اور مولانا آزاد کی طرف سے ان کا جواب:

اوپر مولانا آزاد کے بیان میں میاں صاحب کی جس تحریر کا ذکر آیا ہے، اس کے متعلق مخالفین نے ہندوستان میں غلط خبریں بھیجیں، اور اس طرح میاں صاحب کی پوزیشن خراب کرنے کی کوشش کی۔ مولانا آزاد نے بڑی صفائی سے اس کا جواب دیا ہے۔ یہاں تک کہ اس معاملہ میں اپنے والد مرحوم کی بھی رعایت نہیں کی ہے فرماتے ہیں:

یہ بات بالکل واضح ہے کہ مولانا نذیر حسین مرحوم نے اس تحریر میں ان اصولوں کے خلاف کوئی بات نہیں کہی ہے جو اہلحدیث کے اصول سمجھے جاتے ہیں۔ نہ تقلید شخصی کے وجوب کو مانا ہے نہ کتب حدیث پر کتب فقہ کی ترجیح کو۔ صرف برأت واظہار ہے تاہم یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ان کے مخالفین نے مکہ سے اس بات کی خبریں بھیجدیں کہ انھوں نے وہابیت سے توبہ کرلی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ خود والد مرحوم باوجود ان تمام تفصیلات کے بیان کرنے کے کہا کرتے تھے: مولانا نذیر حسین نے توبہ کرلی۔ اور زور دیتے تھے کہ انھوں نے تقلید شخصی کو مستحسن تسلیم کرلیا۔ حالانکہ یہ جماعت بھی عوام کے لیے ہمیشہ تقلید کو ضروری بلکہ فرض ٹھہراتی ہے۔ بحث تو صرف التزام و

تعین میں ہے، نہ کہ نفس تقلید میں ۔[1]

---

[1] حضرت میاں صاحب قدس سرہ نے "معیار الحق" میں مسئلہ تقلید پر بہت تفصیل سے بحث کی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر اس کا کچھ خلاصہ پیش کر دیا جائے، تاکہ معلوم ہو جائے کہ مولانا آزاد نے جو بات کہی ہے اس کی تائید خود میاں صاحب کے کلام میں بھی موجود ہے۔ عالم بالقرآن والحدیث کے لیے تقلید جائز ہے یا نہیں؟ اس پر بحث کرنے کے بعد میاں صاحب فرماتے ہیں:

"باقی رہی تقلید وقت لاعلمی، سو یہ چار قسم ہے، قسم اول واجب ہے اور وہ مطلق تقلید ہے اہل سنت کے مجتہدین میں کسے کسی مجتہد کی لاعلی التعیین، شاہ ولی اللہ صاحب نے عقد الجید میں اس کی علامت یہ لکھی ہے کہ مقلد کا عمل مجتہد کے قول پر سنت کی موافقت کے ساتھ مشروط ہو۔ یعنی اگر وہ قول سنت کے موافق ہو گا تو عمل کروں گا اور جب معلوم ہو جائے گا کہ سنت کے خلاف ہے تو اس کو پھینک دوں گا۔ قسم ثانی مباح ہے اور وہ کسی مذہب معین کی تقلید ہے بشرطیکہ مقلد اس تعیین کو امر شرعی نہ سمجھے۔ اس تقلید کی علامت یہ ہے کہ اگر دوسرے مذہب کے کسی مسئلہ پر عمل کر لے تو اس سے انکار نہ کرے اور کسی دوسرے عمل کرنے والے کو برا نہ جانے اور اس پر نکیر نہ کرے۔ قسم ثالث حرام و بدعت ہے، اور وہ تقلید ہے بطور تعیین کے یعنی تعین کو واجب اور لازم سمجھے۔ قسم رابع شرک ہے، اور وہ ایسی تقلید ہے کہ اس طرح کے وقت مقلد نے ایک مجتہد کی اتباع کی پھر اس کو اس مجتہد کے مذہب کے خلاف ایک ایسی حدیث معلوم ہوئی جو صحیح غیر منسوخ ہے اور کسی دوسری حدیث کے معارض بھی نہیں ہے مگر وہ اس حدیث کو قبول نہیں کرتا۔ (ملخص از ص ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۴، منہ)

اس سلسلہ میں مولانا آزاد نے یہ بھی فرمایا ہے کہ:

" ایک اور پہلو بھی اس واقعہ میں قابلِ ذکر ہے کہ جس طرح اس طرف سے غلط بیانی کی گئی، اسی طرح مولانا نذیر حسین مرحوم کے طرفداروں اور ناداں معتقدوں نے یہ سمجھ کر کہ یہ گرفتاری ان کے لیے موجب توہین ہے اس کے واقع ہونے ہی سے انکار کر دیا اور کہنا شروع کر دیا کہ یہ خبریں محض غلط ہیں۔ حالانکہ مولانا نذیر حسین مرحوم کا گرفتار ہونا ایک ایسے مرکز میں جیسا مکہ ہے نہ صرف موجب توہین نہیں ہے بلکہ قدرتی ہے۔"

(آزاد کی کہانی ص ۱۰۷، ۱۰۸)

مخالف کمیٹی کے بعض ممتاز ممبروں کا مختصر تعارف:

"اشاعۃ السنہ" کے پچھلے اقتباس میں ناظرین پڑھ چکے ہیں کہ میاں صاحب کے مخالفین کی جس ٹولی نے ہندوستان سے میاں صاحب کا پیچھا کیا تھا جب وہ مکہ مکرمہ پہنچ گئی تو اس ٹولی کے ساتھ وہ ہندوستانی علماء احناف بھی شامل ہو گئے جو اس وقت مکہ مکرمہ میں موجود تھے۔ ان سب نے مل جل کر ایک کمیٹی مقرر کی اور سازش کی جس طرح ہو سکے حضرت میاں صاحبؒ کو یہاں قتل کرا دیں۔ یا حبسِ دائم میں پھنسا دیں۔

مولانا محمد حسین مرحوم نے اس کمیٹی کے ممتاز ممبروں کے ناموں کی نشاندہی بھی کر دی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر ان حضرات کا مختصر تعارف کرا دیا جائے۔ تاکہ جو لوگ آج میاں صاحب پر زبانِ طعن دراز کر رہے ہیں ان کے پہچاننے میں ہم کو کوئی مغالطہ نہ ہو اور ہم سمجھ جائیں کہ یہ تو ان اسلاف کی "سعادت مندی" ہے جنھوں نے

اپنے اسلاف کے کارناموں کی یاد کو کسی نہ کسی نوع سے باقی رکھا ہے۔

● مولانا بٹالوی نے ان ممتاز ممبروں میں سب سے پہلا نام مولوی رحمت اللہ صاحب کیرانوی کا ذکر کیا ہے، بلکہ ان کو اس کمیٹی کا پریذیڈنٹ (صدر) بتایا ہے۔ مولوی صاحب مذکور مغربی یوپی ضلع مظفر نگر کے ایک قصبہ "کیرانہ" کے باشندے تھے، ان کے ایک رفیق ڈاکٹر وزیر خاں اکبرآبادی عیسائی مذہب کے متعلق بہت وسیع اور گہری معلومات رکھتے تھے، انھی ڈاکٹر صاحب کی رفاقت میں مولوی رحمت اللہ صاحب کو بھی عیسائیت پر کافی عبور حاصل ہو گیا تھا، پادریوں سے بعض اہم مناظرے کیے اور ان کے رد میں کتابیں لکھیں۔ سید سلیمان صاحب ندوی لکھتے ہیں:

"اور خصوصیت کے ساتھ ڈاکٹر وزیر خاں اور مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی کا وجود تو رد عیسائیت کے باب میں تائید غیبی سے کم نہیں، اور کون باور کر سکتا تھا کہ اس وقت پادری فنڈر کے مقابلہ کے لیے ڈاکٹر وزیر خان جیسا آدمی پیدا ہو گا، جو عیسائیوں کے تمام اسرار کا واقف، اور ان کی مذہبی تصنیفات کا ماہر کامل اور عبرانی و یونانی کا ایسا واقف ہو گا جو عیسائیوں کو خود ان ہی کی تصنیفات سے ملزم ٹھہرائے گا اور مولانا رحمت اللہ صاحب کے ساتھ مل کر اسلام کی حفاظت کا ناقابل شکست قلعہ دم کے دم میں کھڑا کر دے گا۔" (دیباچہ حیات شبلی ص ۱۵)

۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں مولوی رحمت اللہ صاحب نے انقلابیوں کا ساتھ دیا تھا، اور انگریزوں سے جنگ کی تھی جب اس جنگ میں ہندوستانیوں کو شکست ہو گئی اور انگریز غالب آ گئے تو انقلابیوں کی گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ گرفتاری کے

بعد ان کو طرح طرح کی ایذائیں اور سزائیں دی جانے لگیں۔ مولوی رحمت اللہ صاحب کی گرفتاری کا بھی حکم ہوگیا۔ مگر مولوی صاحب کسی طرح اپنی جان بچا کر ہندوستان سے نکل گئے اور مکہ معظمہ میں جاکر پناہ گزیں ہوئے۔

مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کی روایت ہے کہ:

"غدر کے زمانہ میں ایک مجذوب صاحب تھانہ بھون میں تھے جب مولوی رحمت اللہ صاحب کی گرفتاری کا حکم ہوا اور ان کا ارادہ ہجرت کا ہوا تو لوگوں نے کہا کہ مجذوب صاحب سے ذرا مشورہ لینا چاہیئے چنانچہ ان کی خدمت میں گئے اور عرض کیا۔ انھوں نے فرمایا۔ رہ جاؤ کچھ نہیں ہوگا۔ اس کے بعد مزید اطمینان کے لیے مولوی رحمت اللہ صاحب پھر ان کے پاس گئے تب مجذوب صاحب فرمانے لگے۔ "چلا جا یہاں نہیں رہ سکتا۔ فاضل ہوکر ایسی چھچوری بات نہیں بھاتی۔" اور اپنے والد صاحب کا نام لے کر کہا، تین روپیہ ان کی طرف سے اور چھ روپیہ میری طرف سے تجھے ملتے رہیں گے۔ پس مولوی رحمت اللہ صاحب نے بھی ہجرت کا قصد کرلیا اور اس تاریخ سے نو روپیہ ماہوار ان کو برابر ملا کیے۔ اس میں کبھی فتور واقع نہیں ہوا۔ مولوی ولایت حسین صاحب نے عرض کیا کہ حضرت! اگر مجذوب صاحب کے کہنے کے موافق مولوی رحمت اللہ صاحب ہندوستان میں رہ جاتے تو کچھ دار و گیر نہ ہوتی؟ حضرت نے ارشاد فرمایا ہاں کوئی صورت برأت کی منجانب اللہ نکل آتی۔

(تذکرۃ الرشید حصہ دوم ص ۲۷۵)

مولانا گنگوہی کی یہ روایت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مولوی رحمت اللہ پر اس وقت بڑی دہشت اور ہیبت طاری تھی۔ اسی لیے مجذوب صاحب کی بات

پیران کو اطمینان نہیں ہوا۔ ورنہ یہ حضرات اپنے مسلک کے خانقاہی مولویوں کی ولایت اور ان کے "کشف و کرامات" پر جیسا عقیدہ رکھتے ہیں اس کے لحاظ سے تو یہ امید نہیں کی جا سکتی تھی کہ اس "کشف" کے بعد بھی مولوی رحمت اللہ صاحب کو اپنی برأت کا یقین نہ ہوتا اور وہ ہندوستان سے باہر نکل جانا ضروری سمجھتے۔ چنانچہ مولانا گنگوہی کو مجذوب صاحب کی بات پر اطمینان ہو گیا تھا اور انھوں نے فرما دیا تھا کہ اگر مولوی رحمت اللہ صاحب رہ جاتے تو کوئی صورت ان کی برأت کی منجانب اللہ نکل آتی۔

مولانا ابو الکلام صاحب آزاد مرحوم کا یہ بیان پہلے نقل ہو چکا ہے کہ:

(مولانا سید محمد نذیر حسین صاحب کے سفر حج سے بہت پہلے)

"علماء وہابیہ کی ایک بڑی جماعت حجاز کو دار الامن سمجھ کر ہندوستان سے ہجرت کر گئی تھی اور مکہ معظمہ میں مقیم تھی، مگر ہندوستانی علماء مقیمین مکہ نے ان کے خلاف فتنہ اٹھایا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ چند دنوں کے بعد اچانک اس جماعت کے اکتیس آدمی گرفتار کر لیے گئے، جن میں مولانا رحمت اللہ صاحب بھی تھے۔ لیکن یہ بعد کو رہا کر دیے گئے۔ کیونکہ انھوں نے اپنی حنفیت کے بہت واضح دلائل پیش کر دیے۔"

اس بیان سے مولانا رحمت اللہ صاحب کا مسلک واضح ہو جاتا ہے کہ وہ حنفی تھے۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ "علمائے وہابیہ" سے مولانا آزاد کی مراد علمائے اہلحدیث ہیں۔ اس کے بعد مولانا بٹالوی مرحوم کا بیان پڑھیے جس سے اندازہ ہوگا کہ موصوف ایسے حنفی تھے جن کے دل میں اہلحدیث اور ان کے مسلک

کے خلاف عداوت اور کدورت بھری ہوئی تھی۔ مولانا بٹالوی لکھتے ہیں:

"مولوی رحمت اللہ مذکور کو اگرچہ عیسائیوں کے رد و جواب میں عانت ڈاکٹر وزیر خاں، بڑا دخل رہا ہے، مگر اسلامی علوم خصوصاً قرآن و حدیث میں اس کو چنداں مہارت نہیں ہے۔ اور اسی وجہ سے وہ بلا واسطہ تقلید سابقین، قرآن و حدیث پڑھنے پڑھانے اور اس پر عمل کرنے کو جائز نہیں سمجھتا، اور جو لوگ بلا واسطہ پچھلے علماء کے قرآن و حدیث پڑھیں یا اس پر عمل کریں ان کو وہ مکہ مکرمہ میں چین نہیں لینے دیتے"

"ایک بزرگ (شیخ محمد نامی) حرم محترم میں حدیث پڑھایا کرتے تھے اس نے ان کو حکماً اس سے ہٹا دیا۔ پھر وہ ایک مدت تک ایک حلوائی (عبداللہ نامی) کی دوکان کی ایک کوٹھری میں چھپ کر حدیث پڑھاتے رہے۔ اس کو بھی اس نے جب مطلع ہوا بند کرا دیا۔"

"ایک دفعہ حدیث کی ایک کتاب "سفر السعادۃ" (تصنیف علامہ مجدالدین صاحب قاموس) مکہ میں آئی، اور شائقین حدیث نے اس کی ترویج و اشاعت چاہی تو اس کو بھی اس نے جاری نہ ہونے دیا۔ خاکسار نے مکہ مکرمہ میں چار مہینے رہ کر اکثر ان حالات کو ... بچشم خود ملاحظہ کیا ہے۔ صرف سنی سنائی باتوں کو بیان نہیں کر دیا۔"

(اشاعۃ السنۃ جلد ۶ نمبر ۱۰ ص ۲۸۹)

یہ سلوک تو عام شائقین حدیث بلکہ خود حدیث کے ساتھ تھا۔ اسی سلسلہ میں مولانا بٹالوی نے میاں صاحب کے ساتھ مولوی رحمت اللہ صاحب کی خصوصی دشمنی کا

کو گرہ بھی کیا ہے، جس کو اس سے پہلے ہم نقل کر چکے ہیں۔

● مخالف کمیٹی کے دوسرے ممتاز ممبر جن کا نام مولانا بٹالوی نے بتایا ہے وہ ہیں حاجی امداد اللہ صاحب، حاجی موصوف کا مولد و منشأ مغربی یوپی ضلع مظفر نگر کا مشہور قصبہ "تھانہ بھون" ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے بھی ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں تھانہ بھون اور اطراف کے علاقوں میں انگریزوں کے خلاف جہاد کا علم بلند کیا تھا لیکن بدقسمتی سے جب شورش ناکام ہو گئی اور انگریزوں کے قدم پھر جم گئے تو باغیوں کی دار و گیر شروع ہوئی۔ حاجی صاحب کی گرفتاری کی بھی پولیس نے کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئی۔ وہ چھپ کر پنجاب اور سندھ کے راستے سے کراچی چلے گئے اور وہاں سے جہاز پر سوار ہو کر مکہ معظمہ پہنچ گئے۔

مولانا عبید اللہ صاحب سندھی فرماتے ہیں:

"حاجی امداد اللہ صاحب کا اصل نام امداد حسین تھا، جسے مولانا اسحاق صاحب نے بدل کر امداد اللہ کر دیا۔ حاجی صاحب کی ذات مرجع خلائق تھی اور آپ سے بے شمار اہل فن نے فیض پایا، ان میں سے مشہور مولانا محمد قاسم، مولانا رشید احمد، شیخ فیض الحسن سہارنپوری اور اور دوسرے نامی گرامی علمائے ہند ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں آپ معرکہ شاملی[1] کے امیر تھے۔ اس کے بعد موصوف چھپ کر حجاز پہنچ گئے اور مکہ مکرمہ میں اقامت پذیر ہو گئے۔ حاجی امداد اللہ دیوبندی جماعت کے امیر تھے۔ آپ نے ۱۳۱۷ھ میں انتقال فرمایا۔"

(شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص ۲۵۶)

---

[1] شاملی ایک مقام کا نام ہے جو اس زمانہ میں ضلع سہارنپور سے متعلق تھا۔ (نقش حیات)

حاجی صاحب کے مخصوص مسترشدین اور مشہور خلفاء میں مولانا اشرف علی تھانوی
مرحوم بھی تھے۔ لیکن ان کی عقیدت مندی صرف خانقاہی تصوف اور بیعت طریقت
تک محدود تھی۔ سیاسی نظریات میں مرید اور پیر میں توافق نہ تھا۔ مولانا اشرف علی
صاحب انگریزی حکومت کے خلاف جہاد کرنا اور انقلابی شورش و ہنگامہ برپا کرنا
جائز نہیں سمجھتے تھے۔ اس معاملہ میں وہ مولانا شیخ محمد تھانوی کے مسلک پر کاربند
تھے، جو شاہ اسحاق صاحب کے شاگرد تھے اور ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کے مخالف
تھے اس کو اسلامی جہاد، ہونے کا فتویٰ نہیں دیتے تھے۔

مولانا عبیداللہ سندھی کا مندرجہ ذیل بیان پڑھیے!

"شیخ محمد تھانوی وہ بزرگ ہیں جن کے مسلک پر مولانا اشرف
علی صاحب تھانوی کاربند ہیں اور شیخ الہند کی جماعت کی سیاست
کو غلط مانتے ہیں۔ مولانا اشرف علی صاحب کے سوانح حیات جو شائع
ہو چکے ہیں، ان میں تصریح ہے کہ آپ مولانا شیخ محمد صاحب کے
مسلک کے پیرو ہیں، مولانا شیخ محمد اور امیر امداد اللہ ایک ہی مرشد
کے خلیفہ ہیں اور اسی مسئلہ جہاد پر آپس میں مخالف ہو گئے اور جماعت
دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تو اب امیر امداد اللہ کی جانشینی کا استحقاق
مولانا اشرف علی صاحب کو کس طرح پہنچ سکتا ہے۔ یہ ایک نہایت ہی
خطرناک استادی ہے جو مولانا شیخ الہند اور ان کے اساتذہ کے خصوصی
کاموں کو بیکار بنا دینا چاہتی ہے۔"

(سیاسی تحریک ص ۲۹۵۔)

یہ سندھی صاحب کا اپنا تاثر ہے، لیکن خود حاجی امداد اللہ صاحب اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کی نظروں میں مولانا اشرف علی کی کیا وقعت تھی، اس کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے ہو سکتا ہے:

"حضرت حاجی صاحب اور حضرت گنگوہی کو آپ سے بہت محبت تھی ہر دو حضرات آپ کی بہت زیادہ رعایت فرماتے اور شفقت و محبت کا برتاؤ بھی کرتے تھے، حضرت گنگوہی تو پیر بھائی ہونے کی وجہ سے احترام بھی کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب آپ (یعنی مولانا اشرف علی) گنگوہ تشریف لے گئے تو حضرت گنگوہی چارپائی سے نیچے اتر کر برابری میں بیٹھ گئے۔ بعض لوگوں نے عرض بھی کیا حضرت! وہ تو اپنے آپ کو حضرت کا مرید سمجھتے ہیں تو حضرت گنگوہی نے فرمایا، تم تو اندھے ہو گئے ہو، میں تو اندھا نہیں ہوں۔ اسی طرح سے حضرت حاجی صاحب سے اگر کوئی پوچھتا تو فرماتے کہ یہ میرا پوتا ہے۔ غرضیکہ ہر دو حضرات سے خصوصی اور گہرے تعلقات تھے۔ ۱۳۱۰ھ میں آپ (یعنی مولانا اشرف علی صاحب) دوبارہ مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور تقریباً چھ مہینے آپ نے قیام کیا اور ذکر و فکر میں مشغول رہے۔ اس قیام میں حضرت حاجی صاحب نے مخصوص توجہات سے نوازا، اور غالباً اسی قیام میں آپ کو اجازت بیعت بھی مرحمت فرمائی۔"

(تذکرہ مشائخ دیوبند ص ۲۷۷)

یہیں سے اس غلط فہمی کا ازالہ ہو جاتا ہے کہ میاں صاحب کے ساتھ امداد اللہ صاحب وغیرہ کی دشمنی اور ان کی ایذا رسانی کا سبب یہ تھا کہ میاں صاحب

نے غدر ۱۸۵۷ء میں شرکت نہیں کی تھی، اور وہ انگریزی حکومت کے خلاف جہاد کرنے کا فتویٰ نہیں دیتے تھے، اس لیے کہ اگر یہ سبب ہوتا تو مولانا شیخ محمد تھانوی اور مولانا اشرف علی کے ساتھ بھی یہی سلوک ہونا چاہیے تھا اور اگر اتنا نہیں تو کم از کم اتنا تو ہوتا کہ ان کے ساتھ احترام اور شفقت و محبت کا برتاؤ نہ ہوتا؟ مگر ہم دیکھ رہے ہیں کہ ایسا نہیں ہے، پس معلوم ہوا کہ میاں صاحب کا یہ "قصور" دراصل کوئی ناقابلِ معافی "قصور" نہ تھا بلکہ ان کا "قصور" جو کچھ تھا وہ یہ کہ عہد نبوی کے چار سو برس بعد کی نکالی ہوئی تقلید کو شرعاً واجب کیوں نہیں کہتے، اور اللہ تعالیٰ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں پر براہ راست عمل کرنے کا شوق اور جذبہ کیوں رکھتے ہیں۔ ع

نکردہ اند بجز پاس حق گناہ دگر

● میاں صاحب کے خلاف مکہ معظمہ کی سازشوں میں حصہ لینے والے تیسرے ممتاز ممبر مولوی عبدالقادر صاحب بدایونی ہیں۔ یہ اہل بدعت کے مشہور عالم مولوی فضل رسول بدایونی کے صاحبزادے ہیں۔ حج ادا کرنے کی نیت سے مکہ معظمہ گئے تھے، وہاں شیخ جمال عمر مکی حنفی سے حدیث پڑھی اور سند حاصل کی۔ چند رسائل کے مصنف بھی ہیں، ایک رسالہ فارسی زبان میں میلاد اور قیام کے ثبوت میں بھی لکھا ہے۔ جس کا نام ہے "سیف الاسلام المسلول علی المناع لعمل المولد والقیام للرسول"، ان کے حالات میں لکھا ہے:

اکثر کتب درسیہ پیش مولوی نور احمد بدایونی و بعض کتب ہم چو شرح سلم العلوم	اکثر درسی کتابیں مولوی نور احمد بدایونی سے پڑھیں، اور بعض کتابیں جیسے شرح سلم العلوم

"شرح اشارات و محاکمات وغیرہ بخدمت مولانا فضل حق خیرآبادی گزرانیدہ مشار الیہ بین الاقران گشت، وبشرف بیعت وخلافت از والد خود سعادت اندوز گردید، وبایمائے والد خود ہنگام زیارت حرمین شریفین زادہما اللہ تشریفاً بخدمت شیخ الفقہاء والمحدثین مولانا شیخ جمال عمر مکی اخذ حدیث فرمودہ، بافادہ علوم دینی و تالیف کتب دینیہ می پردازند۔"

(تذکرہ علمائے ہند ص ۱۶۷)

"اور شرح اشارات اور محاکمات وغیرہ مولانا فضل حق خیرآبادی کے سامنے گزار کر اپنے ہم زمانہ لوگوں میں شہرت پائی۔ اپنے والد سے بیعت اور خلافت کی سعادت حاصل کی، اور جب حرمین شریفین کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے تو اپنے والد کے مشورہ کے مطابق وہاں شیخ جمال عمر مکی سے حدیث پڑھی۔ اب دینی علوم کے افادہ اور مذہبی کتابوں کی تالیف میں مشغول ہیں۔"

موصوف کے ذہن وفکر پر کس باپ کی تربیت کا اثر پڑا تھا، اس کا اندازہ کرنے کے لیے ہم اس موقع پر مولانا آزاد کے "تذکرہ" کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں۔

"مولوی فضل رسول بدایونی مرحوم سوط الرحمان میں لکھتے ہیں:

"داؤد ظاہری شیطان کا متبع تھا، اس کے بعد ابن حزم ظاہری پیدا ہوا، جو خبیث تھا، پھر ابن حزم کا شاگرد ابن قیم ہوا، اور ابن قیم کا شاگرد شقی ابن تیمیہ، ابن تیمیہ نے ایک نیا دین نکالا بعض اشرار بد اطوار جہلہ، فسقہ در حلقہ انقیادش آمدہ در بلاد اسلامیہ طرفہ ہنگامہ برپا نمودند۔" اور ان تمام مورخانہ تحقیقات کے لیے آخر

میں طبقات سبکی کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔

کجا ابن حزم اور کجا ابن قیم بینہما مفاوز تنقطع فیہا اعناق المطی، پھر لطف یہ کہ ابن تیمیہ ابن قیم کے شاگرد تھے اور ابن تیمیہ کے ساتھی صرف اشرار و جہلا رہتے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی کوتاہیاں معاف فرمائے اور جو گزر چکے ہیں ان کی مغفرت۔"

(حاشیہ تذکرہ ص ۲۵۰)

یہ ہیں وہ فضل رسول بدایونی جن کے بیٹے تھے عبد القادر بدایونی۔ ایسے صاحب فکر و نظر، خوش عقیدہ و خوش گفتار محقق باپ کی گود میں پرورش پانے والے فرزند اور ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے والے، ان کی خلافت اور جانشینی کی سعادت حاصل کرنیوالے مرید سے کیا بعید ہے کہ وہ میاں صاحب جیسے متبع کتاب و سنت اور محب ابن تیمیہ و ابن قیم، اکرم داؤد و ابن حزم کے خلاف ریشہ دوانیوں اور انکی ایذا رسانیوں میں حصہ لے۔ جب حاجی امداد اللہ صاحب جیسے صاحب طریقت وارشاد اس فتنہ سے نہ بچ سکے، تو کسی بریلوی اور بدایونی عالم کا کیا کہنا؟ ان کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔

● اس کمیٹی کے چوتھے ممتاز ممبر مولوی خیر الدین صاحب تھے۔ یہ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے والد ہیں۔ ان کے تفصیلی حالات "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" کتاب میں موجود ہیں۔ اسی کتاب سے ہم ان کے کچھ ابتدائی حالات اور اس کے بعد بعض وہ واقعات جن سے ان کے مسلک پر روشنی پڑتی ہے، تلخیص و اختصار کے ساتھ یہاں نقل کر دیتے ہیں۔

"مولانا خیر الدین ۱۸۳۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے، ان کے والدین کا

صغرسنی ہی میں انتقال ہو گیا تھا، اس لیے پرورش ان کے نانا مولانا منور الدین کے یہاں ہوئی۔ مولانا منور الدین حضرت شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمہ کے شاگرد اور مولانا اسماعیل شہید کے ہم درس تھے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کے انتقال کے بعد جب مولانا اسماعیل شہید نے تقویۃ الایمان اور جلاء العینین لکھی، اور ان کے اس مسلک کا ملک میں چرچا ہوا تو تمام علماء میں ہلچل پڑ گئی۔ ان کے رد میں سب سے زیادہ سرگرمی بلکہ سربراہی مولانا منور الدین نے دکھائی۔ مولانا شہید کے ساتھ ان کا مناظرہ بھی ہوا۔

..... غدر سے پہلے علماء دہلی کا یہ حال تھا کہ ہندوستان کی حالت اور بربادیاں دیکھ کر عموماً یہاں کے قیام سے برداشتہ خاطر ہو گئے تھے اور ایک ایک کرکے یہاں سے روانہ ہونے لگے تھے۔ عام طور پر ہر سال بڑی بڑی جماعتیں جایا کرتی تھیں، جو قافلے کے نام سے مشہور تھیں۔ ایک بڑا قافلہ شاہ محمد اسحاق اور شاہ محمد یعقوب کا تھا جو دہلی سے مکہ معظمہ ہجرت کر گیا تھا۔ ان کے بعد مولانا منور الدین بھی ہندوستان سے برداشتہ خاطر ہو گئے اور ہجرت کرکے مکہ معظمہ چلے گئے۔ انھی کے ساتھ میں مولانا خیر الدین بھی تھے، ان لوگوں کے مکہ معظمہ پہنچ جانے کے پانچ برس کے بعد ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کا غدر ہوا تھا اور اسی سال مولانا منور الدین کا مکہ میں انتقال ہو گیا۔ مولانا خیر الدین نے ہندوستان میں قیام کے دوران ہی میں اپنے نانا اور دوسرے مشہور اساتذہ سے علوم کی تحصیل کر لی تھی، لیکن مکہ معظمہ پہنچنے کے بعد حرمین کے علماء سے بھی استفادہ کیا۔ قیام حجاز کے تقریباً دس برس بعد انھوں نے شادی کی۔ مکہ میں کچھ عرصہ وہ وہاں کے اساتذہ سے

مزید تکمیل و اخذ فیض میں مشغول رہے، پھر حرم میں خود اپنی مجلس درس قائم کی۔ اور اپنے نانا ہی کی زندگی میں شریف مکہ اور تمام اعیانِ حجاز سے رسم و راہ پیدا کرلی تھی، کچھ عرصہ کے بعد اچانک ایک حادثہ پیش آگیا۔ جس میں یہ گر پڑے۔ اور بائیں ران کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس وقت مکہ میں ڈاکٹری علاج کا عمدہ انتظام نہ تھا۔ جس ڈاکٹر نے ہڈی جوڑی تھی، اس کی بندش ٹھیک نہ ہوئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سخت تکلیف پیدا ہوگئی۔ مجبوراً علاج کے لیے ہندوستان آنا پڑا۔ چنانچہ حسب عادت مع اہل و عیال کے کلکتہ آگئے اور یہاں علاج کرایا۔ جس سال وہ کلکتہ پہنچے تھے اسی سال ان کی اہلیہ (مولانا آزاد کی والدہ) کا یہیں انتقال ہوگیا۔ اس حادثہ سے مولانا خیرالدین اس درجہ برداشتہ خاطر ہوئے کہ باوجود اس کے کہ علاج ابھی مکمل ہوا تھا فوراً مکہ کا قصد کرلیا۔ مگر حالات کچھ ایسے پیدا ہوئے کہ سال بھر تک مہلت ملی، بہزار وقت دوسرے سال مکہ گئے۔ لیکن اب کی دفعہ زیادہ دنوں تک وہاں قیام نہ ہوسکا۔ پھر کلکتہ واپس آگئے اور ۱۹۰۸ء میں یہیں انتقال کیا۔

"وہابیوں" کے متعلق اپنے والد کے تعصب کا حال مولانا آزاد نے بایں الفاظ بیان کیا ہے۔

"ابتدا ہی سے ان کی طبیعت میں "وہابیوں" کے متعلق سخت تعصب قائم ہوگیا تھا اور یہ آخر تک بڑھتا ہی گیا، اس بارے میں ان کی طبیعت کا کچھ عجیب حال تھا۔ ہر طرح کی رسوم، ہر طرح کی بدعات، جو سخت سے سخت آخری درجہ کی کہی جاسکتی ہیں، ان سب کی وہ توجیہیں کرتے تھے؛ اور کسی کو بھی قابل رد اور قابل اعتراض نہ قرار دیتے تھے، اور اگر کوئی ذرا بھی ان پر اعتراض کرے تو اس کو وہابی

کی طرف منسوب کر دیتے تھے۔ بعد کو میں نے دیکھا تو اس بارے میں مقلدین حنفیہ کے جو مختلف حلقے نظر آتے ہیں، ان میں سب سے زیادہ تنگ حلقہ ان کے مشرب کا تھا اور ہندوستان کے گزشتہ علماء میں صرف مولوی فضلِ رسول بدایونی، جنھوں نے تقویۃ الایمان کے رد میں سوط الرحمٰن لکھی ہے۔ ٹھیک اسی رنگ پر تھے، جو اس بارے میں والد مرحوم کا تھا۔ ان کے علاوہ ہندوستان کا کوئی سخت سے سخت حنفی بھی معیار حنفیت پر نہیں اتر سکتا تھا، جن لوگوں نے اپنی زندگیاں تقلید کی حمایت اور حنفیت کی نصرت میں بسر کر دیں وہ بھی بعض شدید بدعات و رسوم کی مخالفت کی وجہ سے ان کے نزدیک وہابی تھے۔"

انھوں نے وہابیوں کو دو اصولی قسموں میں بانٹ دیا تھا، کہتے تھے دو فرقے ہیں۔ ایک اسماعیلیہ دوسرا اسحاقیہ۔ اسماعیلیہ سے مقصود وہ فرقہ تھا جو بدعات و رسوم کی مخالفت کے ساتھ تقلیدِ شخصی کا بھی تارک ہو۔ جیسا کہ مولانا اسماعیل شہید نے تقویۃ الایمان اور جلاء العینین وغیرہ میں لکھا ہے۔ اسحاقیہ سے مقصود وہ فرقہ ہے جو حنفیت و تقلید سے تو انکار نہیں کرتا، لیکن بدعات و رسوم کا مخالف ہے، اس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ شاہ محمد اسحاق نے مائۃ مسائل میں بدعات و رسوم سے اختلاف کیا ہے مگر تقلید و حنفیت کے خلاف کوئی بات نہیں کہی ہے وہ کہتے تھے کہ جب اسماعیلیہ غیر مقبول ہو گئی تو وہابیت نے اپنے مکاید کی اشاعت کے لیے راہ تقیہ اختیار کی، اور حنفیت کی آڑ قائم کر کے اپنے دیگر عقائد کی اشاعت کرنے لگے، جہاں تک مجھے خیال ہے وہ وہابیوں کے کفر پر وثوق کے ساتھ یقین رکھتے تھے، انھوں نے بارہا فتویٰ دیا کہ وہابیہ یا وہابی کے ساتھ نکاح جائز نہیں۔

کسی حنفی کے لیے کسوٹی یہ تھی کہ اس سے سید احمد صاحب بریلوی، مولانا اسماعیل شہیدؒ، مولانا اسحاق، اور تقویۃ الایمان، صراط مستقیم، مائۃ مسائل اربعین کی نسبت سوال کرتے۔ اگر وہ شخص "بدقسمتی" سے ان بزرگوں اور کتابوں کے خلاف عقیدہ ظاہر کرنے میں ذرا بھی تامل کرتا تو بس یہ وہابیت کا قطعی ثبوت ہوتا، علاوہ بریں بعض اور جزئیات جن پر ان کو اصرار تھا، ان کے انکار کو بھی وہابیت قرار دیتے تھے۔ غالباً ۱۹۰۱ء کی بات ہے کہ مولوی احمد رضا خاں بریلوی ان سے ملنے کے لیے کلکتہ آئے، جن سے ان کے برابر تعلقات رہے تھے اور بار بار ہم لوگوں سے کہا تھا کہ یہ شخص بلاشبہ صحیح الاعتقاد ہے۔ لیکن بدقسمتی سے وہ اپنے ساتھ بعض اپنی تصانیف لائے، اور چونکہ شیخ احمد دحلان والد کے خاص دوست تھے۔ اس لیے انھوں نے خاص طور پر اپنا ایک رسالہ دیا جو ان کے رد میں لکھا تھا۔ اور اس میں عدم ایمان ابوین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ایمان ابو طالب پر زور دیا تھا، چنانچہ اس پر کچھ دیر تک والد نے ان کا ایسا تعاقب کیا کہ آخر وہ ہکا بکا رہ گئے، اور خاموش چلے گئے، جانے کے بعد ہم سے کہا کہ اس شخص کے عقیدے میں بھی فتور ہے۔

البتہ علماء حال میں مولانا عبدالقادر بدایونی کی تعریف کرتے تھے اور ان کی حنفیت پر معترض نہ تھے۔ جس زمانہ میں مولوی ظہیر الحسن شوق مرحوم سے اردو شاعری میں میں اصلاح لیتا تھا اور اس تعلق سے ان سے واقفیت ہوئی تھی، ان کی ایک دو کتابیں میں نے والد کو سنائیں جو تقلید و حنفیت کے اثبات میں لکھی تھیں، اور بڑے ہی غلو کے ساتھ لکھی گئی تھیں، مثلاً حبل المتین میں آمین بالجہر کے جواز ہی سے انکار کیا گیا ہے، لیکن وہ بھی ان کے معیار پر ٹھیک نہ اترے۔ شوق مرحوم اس زمانے

میں آثار السنن لکھ رہے تھے، اور اس کے لیے مالی اعانت کے طلبگار تھے۔ میری تحریک سے کلکتہ آئے اور والد مرحوم سے ملے۔ لیکن انھوں نے جب ان سے معیار حنفیت کے سوالات کیے اور وہ ساکت رہ گئے تو انھوں نے رائے قائم کی کہ ان کی حنفیت بھی مشتبہ ہے۔ تاہم یہ عجیب بات تھی کہ باوجود اس درجہ تشدد اور وہابیوں سے نفرت کے طبیعت میں قدیم سوسائٹی کی وضع داری اور مہمان نوازی کا جذبہ اتنا قوی تھا کہ کوئی ہو خواہ مولانا اسماعیل شہید ہی ان کے مہمان کیوں نہ ہو جاتے لیکن کفر کے فتوے کے ساتھ ان کی خاطر داری اور خدمت بھی کرتے تھے۔ مولوی ظہیر الحسن سے وہ خوش نہ ہوئے، تاہم چلتے وقت ان کو پانچ سو روپئے دیے تاکہ آثار السنن کا پہلا حصہ شائع کریں۔ اس میں تین سو انھوں نے اپنے پاس سے دیے تھے، اور دو سو اپنے ایک معتقد سے دلائے تھے۔"

(ص ۱۶۴ تا ۱۶۷)

وہابیوں کے ساتھ ان کی اس شدید نفرت و عداوت کے اسباب کیا تھے؟ مولانا آزاد نے اس پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں، " اسلام کے اندرونی فرقوں میں انھیں جس قدر کاوش تھی وہ صرف وہابیوں سے تھی، اور اس کا سبب وہ صحبت ہے جس میں غدر سے پہلے ان کا ابتدائی وقت صرف ہوا تھا۔ اتفاق سے ان کے اساتذہ بھی وہی تھے، جنھیں اس بارے میں بہت تشدد تھا، ان کے ہمدرس بھی وہی لوگ تھے جو آگے چل کر اس بارے میں بہت سخت ثابت ہوئے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ اپنی تمام خاندانی باتوں میں اپنے جد مرحوم سے فیض یاب ہوئے تھے، اور مولانا اسماعیل شہید اور مولانا عبدالحی مرحوم سے رنج کی وجہ سے ان کا بھی بڑا

وقت وہابیوں کی مخالفت ہی میں صرف ہوا۔ مکہ گئے، اور وہاں بھی اس وقت سب سے بڑا چرچا یہی تھا۔ نجدیوں کا حملہ ابھی پرانا نہیں ہوا تھا۔ اور بہت سے پولٹیکل اسباب بھی ایسے تھے جن کی وجہ سے عرب و ترک، دونوں وہابیوں سے سخت تعرض و نفرت رکھتے تھے۔ ان اسباب سے روز بروز والد مرحوم کے اندر بھی یہ جذبہ قوی ہوتا گیا اور بالآخر ان کی تقریر و تحریر کا سب سے بڑا موضوع بن گیا۔ شیخ احمد دحلان نے "الرد علی الوہابیین" لکھی، وہ بھی فی الحقیقت والد مرحوم کے خیالات کا عکس ہے۔" (ص ۱۴۰)

یہی وہ چار حضرات ہیں جن کے متعلق مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم نے ہمیں بتایا ہے کہ یہ اس کمیٹی کے نمایاں ممبران تھے جس نے حرم پاک میں بھی حضرت میاں صاحب قدس سرہٗ کو چین نہ لینے دیا، اور جو کہ معظمہ جیسے دار الامن میں بھی دن رات ایسی سازشوں اور تدبیروں میں مصروف تھی ، جن کے ذریعہ وقت کے ایک بہت بڑے محدث کو قتل کرنے یا حبسِ دوام میں پھنسانے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے۔

ان حضرات کے اس مختصر تعارف سے آپ نے اندازہ کر لیا ہو گا کہ یہ کمیٹی دیوبندی اور بریلوی دونوں ہی مکتبِ خیال کے علماء و مشائخ کی مشترکہ کمیٹی تھی۔ گویا اہلحدیث کے خلاف وہاں ایک متحدہ محاذ بنایا گیا تھا۔

معرکۂ شاملی کی حقیقت ؟

پچھلے صفحات پر حاجی امداد اللہ صاحب مرحوم کے مختصر تعارف کے سلسلہ میں "معرکۂ شاملی" کا ذکر آیا ہے۔ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس موقع پر کچھ اس کی تفصیلات پیش کریں۔

اس میں تو مؤرخین کا اختلاف نہیں ہے کہ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جو انقلابی شورش برپا ہوئی تھی اُسی ہنگامے کے زمانے میں یہ جنگ بھی ہوئی تھی، لیکن اس کے بارے میں تذکرہ نگاروں کے بیان میں اختلاف ہے کہ یہ جنگ انگریز کی فوج سے ہوئی تھی؟ یا خود انقلابیوں کے ساتھ ہوئی تھی؟ اور اس کے اسباب و محرکات کیا تھے؟ اس میں حصہ لینے والے دیوبندی علماء انگریز کے مخالف تھے، یا اس کے خیر خواہ اور فرمانبردار تھے؟

پہلا بیان :

اس کے متعلق سب سے پہلے مولانا حسین احمد صاحب مدنی کا بیان پڑھیے، مولانا مدنی لکھتے ہیں :-

"جب انقلاب ۱۸۵۷ء کی تحریک اطراف و جوانب ہند خصوصاً اطراف دہلی میں

چلنی شروع ہوئی تو ان حضرات کے جوش حریت میں نئی حرکت پیدا ہوئی، ان بزرگوں نے محسوس کیا کہ اس انقلاب میں حصہ لینا فرض اور لازم ہے۔ انگریزوں کے افعال ماضیہ اور احوالِ حاضرہ بخوبی مطلع تھے۔ اس تمام جماعت میں حضرت حافظ ضامن صاحب قدس اللّٰہ سرہٗ العزیز زیادہ پیش پیش تھے۔ (حضرت حافظ صاحب قطب العالم میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانوی کے اولین اور اعلیٰ ترین خلفاء میں سے تھے۔)

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب تحریک انقلاب میں حافظ صاحب کے ہمنوا تو ضرور تھے اگرچہ پیش پیش اور اس قدر زیادہ جوش میں نہ تھے۔ اسی قصبہ تھانہ بھون میں میاں جی صاحب کے تیسرے خلیفہ مولانا شیخ محمد صاحب رہتے تھے چونکہ تینوں حضرات پیر بھائی اور ایک ہی مقدس ہستی میاں جی صاحب کے دریوزہ گر تھے، اس لیے آپس میں میل جول اتحاد واتفاق بڑے پیمانہ پر رہتا تھا۔ مگر مولانا شیخ محمد صاحب علوم عربیہ کے باقاعدہ فاضل تھے۔ علماء دہلی سے تمام نصاب علم ظاہر پڑھ چکے تھے۔ بخلاف حضرت حافظ صاحب اور حاجی صاحب کے کہ دونوں حضرات نے علوم عربیہ کی تکمیل نہیں کی تھی، اگرچہ نسبت باطنیہ میں بدرجہا بڑھے ہوئے تھے۔ اس بنا پر مسائل شرعیہ میں ہر دو حضرات مولانا شیخ محمد صاحب ہی کا اتباع کرتے تھے بدقسمتی سے مولانا کی رائے یہ ہی تھی کہ انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا ہم مسلمانوں پر فرض تو درکنار، موجودہ احوال میں جائز ہی نہیں۔ اس اختلاف اور فتویٰ کی بنا پر حضرت مولانا رشید احمد صاحب اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو ان کے اوطان سے دونوں حضرات نے بلوایا۔ جب ہر دو حضرات (مولانا نانوتوی اور مولانا گنگوہی) پہنچ گئے تو ایک اجتماع میں اس مسئلہ پر گفتگو ہوئی حضرت نانوتوی نے نہایت ادب سے مولانا شیخ محمد صاحب سے پوچھا

(چونکہ وہ بچا پیر تھے اس لیے ہمیشہ ان کا ادب کیا جاتا تھا۔) کہ حضرت کیا وجہ ہے
کہ آپ ان دشمنان دین و وطن پر جہاد کو فرض بلکہ جائز بھی نہیں فرماتے ؟ تو انھوں نے
جواب دیا کہ ہمارے پاس اسلحہ اور آلاتِ جہاد نہیں ہیں ہم بالکل بے سروسامان ہیں۔ مولانا نانوتوی نے
عرض کیا کہ کیا اتنا بھی سامان نہیں ہے، جتنا کہ غزوۂ بدر میں تھا؟ اس پر مولانا شیخ محمد صاحب مرحوم نے
سکوت فرمایا۔ اس پر حافظ ضامن صاحب نے فرمایا کہ بس سمجھ میں آگیا، اور پھر جہاد کی تیاری
شروع ہو گئی اور اعلان کر دیا گیا۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کو امام مقرر کیا گیا اور حضرت مولانا نانوتوی
کو سپہ سالار افواج قرار دیا گیا، اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کو قاضی بنایا گیا۔
اور مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی اور حضرت حافظ ضامن صاحب تھانوی کو
میمنہ، میسرہ (دائیں بائیں) کا افسر قرار دیا گیا۔ چوں کہ اطراف و جوانب
میں مذکورہ بالا حضرات کے تقویٰ علم، تصوف و تشرع کا بہت زیادہ شہرہ تھا۔۔۔
لوگ ان پر بہت زیادہ اعتماد کرتے تھے اس لیے بہت تھوڑی سی مدت میں جوق جوق
لوگوں کا اجتماع ہونے لگا، اس وقت تک ہتھیاروں پر پابندی نہ تھی، عموماً لوگوں کے
پاس ہتھیار رہتے۔ مجاہدین ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو گئے اور تھانہ بھون اور
اطراف میں اسلامی حکومت قائم کر لی گئی۔ اور انگریزوں کے ماتحت حکام نکال دیئے
گئے۔ خبر آئی کہ توپ خانہ سہارنپور سے شاملی کو بھیجا گیا ہے۔ ایک پلٹن لا رہی ہے،
رات کو یہاں سے گزرے گی۔ اس خبر سے لوگوں میں تشویش ہوئی، کیونکہ جو ہتھیار
ان مجاہدین کے پاس تھے وہ تلوار، بندوق توڑے والی اور برچھے وغیرہ تھے۔ مگر
توپ کسی کے پاس نہ تھی۔

توپ خانہ کا مقابلہ کس طرح کیا جائے گا۔؟

حضرت گنگوہی نے فرمایا، فکر مت کرو۔

سڑک ایک باغ کے کنارے سے گزرتی تھی، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کو تیس یا چالیس مجاہدین پر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نے افسر مقرر کر دیا تھا۔ آپ اپنے تمام ماتحتوں کو لے کر باغ میں چھپ گئے، اور سب کو حکم کیا کہ پہلے سے تیار رہو، جب میں حکم کردوں سب کے سب ایک دم فیر کرنا، چنانچہ جب پلٹن مع توپخانہ باغ کے سامنے سے گزری تو سب نے ایک دم فیر کیا۔ پلٹن گھبرا گئی کہ خدا جانے کس قدر آدمی یہاں چھپے ہوئے ہیں۔ توپخانہ چھوڑ کر سب بھاگ گئے۔ حضرت گنگوہیؒ نے توپخانہ کھینچ کر حضرت حاجی صاحب کی مسجد کے سامنے لا کر ڈال دیا۔

شاملی اس زمانہ میں مرکزی مقام تھا، ضلع سہارنپور سے متعلق تھا، وہاں تحصیل بھی تھی، کچھ فوجی طاقت بھی وہاں رہتی تھی، قرار پایا کہ اس پر حملہ کیا جائے، چنانچہ چڑھائی ہوئی اور قبضہ کر لیا گیا، جو طاقت پولیس اور فوج کی وہاں تھی وہ مغلوب ہو گئی۔ حضرت حافظ ضامن صاحب اسی ہنگامہ میں شہید ہو گئے۔ حضرت حافظ صاحب کا شہید ہونا تھا کہ معاملہ بالکل ٹھنڈا پڑ گیا، ان کی شہادت سے پہلے روزانہ خبر آتی تھی کہ آج فلاں مقام انگریزوں سے چھین لیا گیا۔ آج فلاں مقام پر ہندوستانیوں کا قبضہ ہوا۔ مگر حافظ صاحب مرحوم کی شہادت کے بعد پہلی خبر آئی کہ دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا، اور یہی حال ہر جگہ کی خبروں کا تھا۔ لوگوں کی ہمتیں پست ہو گئیں، اور سب اپنے اپنے اوطان کو واپس آ گئے۔ اسی کے بعد قصبہ تھانہ بھون اور اس کے اطراف و جوانب کے وہ مقامات جن کی شکایت کسی دشمن نے کر دی برباد کر دیے گئے، دار و گیر پکڑ دھکڑ کا بے پناہ زمانہ آیا۔ چاروں طرف سختیاں

بیکھڑ و بے نہایت وحشی درندوں کی طرح عمل میں لائی جانے لگیں۔ پرانی دشمنیوں کو نکلنے کا لوگوں کو موقع مل گیا، جس کو جس سے کوئی پدرخاش یا رنجش ہوتی انگریز افسر کے یہاں شکایت کر دیتا کہ یہ شخص بغاوت میں شریک تھا... ؟" (نقش حیات ص ۲ ام تا ص ۵ م) "جب دارو گیر اور پکڑ دھکڑ کا زمانہ آیا تو ان حضرات کے خلاف بھی مخبروں نے شکایت کر دی، گرفتاری کا حکم ہو گیا۔ حاجی امداد اللہ صاحب تو خفیہ تدبیروں سے کام لے کر مکہ معظمہ چلے گئے، مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی ہندوستان ہی میں رہے۔ پولیس نے ان کا پیچھا کیا۔ مگر مولانا نانوتوی تو گرفتار نہ ہو سکے۔ البتہ مولانا گنگوہی پکڑے گئے۔ لیکن نہ آپ نے جرم کا اقرار کیا اور نہ کوئی مؤثر شہادت ملی۔ اس لیے رہا ہو گئے۔"

بہر حال مولانا مدنی کے بیان کا جو طویل اقتباس ہم نے اوپر نقل کیا ہے اس میں آپ نے پڑھ لیا کہ یہ حضرات انگریزی حکومت کے مخالف تھے، اس کے خلاف جہاد کرنا فرض جانتے تھے، لیکن ان حضرات کے ایک دوسرے عقیدتمند مولانا عاشق الٰہی میرٹھی مرحوم کا تاثر اور بیان اس سے مختلف ہے۔ وہ مولانا گنگوہی کی بابت لکھتے ہیں:

دوسرا بیان:

"حضرت مولانا کو یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ آپ کا نام بھی مشتبہ اور قابلِ اخذ مجرموں کی فہرست میں درج ہو چکا ہے اور آپ کی گرفتاری و تلاش میں دوش آیا چاہتی ہے۔ مگر آپ کو وہ استقلال بنے ہوئے خدا کے حکم پر راضی تھے اور سمجھے ہوئے تھے کہ میں جب حقیقت میں سرکار کا فرمانبردار رہا ہوں تو جھوٹے الزام سے میرا بال بھی بیکا نہ ہو گا۔ اور

اگر مارا بھی گیا تو سرکار مالک ہے، اسے اختیار ہے جو چاہے کرے۔۔۔"

(تذکرۃ الرشید ج ۱ ص ۸۰)

دوسری جگہ ان حضرات کے متعلق لکھتے ہیں:

" ہر چند کہ یہ حضرات حقیقۃً بے گناہ تھے، مگر دشمنوں کی یاوہ گوئی نے ان کو باغی و مفسد اور مجرم و سرکاری خطاوار ٹھہرا رکھا تھا۔ اس لیے گرفتاری کی تلاش تھی۔ مگر حق تو کی حفاظت بر سر تھی۔ اس لیے کوئی آنچ نہ آئی اور جیسا کہ آپ حضرات اپنی مہربان سرکار کے دلی خیر خواہ تھے تا زیست خیر خواہ ہی ثابت رہے۔ ہاں چند روز کی تفریق بین الاحباب مقدر تھی، وہ اٹھانی تھی سو اٹھائی۔" (تذکرۃ الرشید حصہ اول ص ۷۹)

اب رہا یہ سوال کہ جب "یہ حضرات اپنی مہربان سرکار کے دلی خیر خواہ تھے اور تا زیست خیر خواہ ہی رہے۔ اور اس سرکار کو اپنا مالک سمجھتے تھے۔ اس کے فرمانبردار تھے"! تو پھر تھانہ بھون اور شاملی میں انگریزی فوج سے جنگ کیسے کی؟۔ وہاں سے انگریز افسروں کو نکال کر "اسلامی حکومت" کیسے قائم کر لی تھی؟ اس کا جواب معلوم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم تذکرۃ الرشید کے مصنف مولانا عاشق الٰہی کی زبانی وہ ساری داستان سنائیں جو انھوں نے بیان کی ہے۔ تب یہ راز کھلے گا کہ در حقیقت بات کیا ہے؟ موصوف لکھتے ہیں:

" اصل قصہ یوں سنا تھا کہ قاضی سعادت علی خاں پسر نجابت علی خاں رئیس اعظم زمیندار تھانہ بھون ضلع مظفر نگر کے دو بیٹے تھے، جن میں بڑے لڑکے عنایت علی خاں نے باپ کے مرنے پر ریاست کا

کام سنبھال رکھا تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی عبدالرحیم خان جو بڑے بھائی کو باپ کی جگہ سمجھتے تھے باطمینان حسب خواہش جہاں جی چاہتا چلے جاتے اور امیرانہ زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ حقیقت میں دونوں بھائی ایک دوسرے کے جاں نثار اور شیدا و عاشق زار تھے۔ اسی گھٹاٹوپ اندھیاؤ میں جبکہ کئی جگہ غدر پڑ چکا اور دہلی اس کا آشیانہ بنا ہوا تھا۔ عبدالرحیم خان مع چند احباب کے سہارنپور گئے اور سرائے میں کسی دوست کے پاس ٹھہرے۔ زمیندارانہ قصبوں میں آدمی کے دشمن بہتیرے ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک بنیا جس کو قدیم سے اس ریاست کے ساتھ عداوت تھی۔ اتفاق سے وہاں مقیم تھا۔ اس نے زمانہ غدر کو غنیمت سمجھا اور یہ مخبری صاحب انگریز سے جو باغیوں کی سرکوبی کے لیے حکم موت کا مجاز بنا کر انتظاماً ضلع سہارنپور میں معین کیا گیا تھا، جا مخبری کی کہ تھانہ کا رئیس بھی کمپنی سے باغی ہو گیا۔ چنانچہ اس کا بھائی دہلی میں کمک بھیجنے کے لیے ہاتھی خریدنے آیا اور کئی دن سے سرائے میں ٹھہرا ہوا ہے۔ ادھر یہ جھوٹی مخبری ہوئی اور ادھر گلی کوچوں میں دشمنوں نے اس افواہ کو پھیلا دیا۔ یہاں تک کہ ایک گارد بسمت سرائے روانہ کیا گیا، اور عبدالرحیم خان مع ہمراہیان بالزام بغاوت جیل خانہ بھیج دیئے گئے۔ زمانہ تھا احتیاط کا، فوراً ناکردہ گناہ جماعت کو پھانسی کا حکم ہو گیا۔ اور اگلے دن قاضی عنایت علی خان کو اپنے بھائی کے دنیا سے رحلت کی اطلاع ملی۔ اس صدمہ سے عنایت علی پر رنج و غم کے پل ٹوٹ پڑے، اور جوش و حزن میں

بھائی کے انتقام کا خیال پختہ ہوگیا۔ اتفاق سے چند سوار کہاروں کے کندھوں پر سرکاری توسوں کی بہنگیاں لدوائے بہادر پور سے کیرانہ کی طرف جا رہے تھے کہ قاضی صاحب کو اطلاع ہوئی اور یہ اپنے جنون میں مست چند رفقاء و رعایا کو ساتھ لیے شیر علی کے باغ کی سمت سڑک پر جا پڑے، اور جس وقت سوار سامنے سے گزرے، ان کا اسباب لوٹ لیا، ایک سوار اس جنگ میں زخمی ہو کر بسمت مشرق جنگل کو بھاگا، مگر تھوڑے ہی فاصلہ پر گھوڑے سے گر کر مر گیا۔ اس فساد کی خبر مظفر نگر پہنچی تو حاکم ضلع کی طرف سے تھانہ پر فوج کشی کا حکم ہو گیا جس پر عنایت علی خاں نے علم فساد کو کھلم کھلا بلند کیا۔ چنانچہ شاملی کی طرف انگریزی فوج کے جانے کی جھوٹی خبر (بلکہ نقارہ بجایا گیا) اور جتھہ کا جتھہ تحصیل شاملی پر چڑھ دوڑا اور کیا جو کچھ کیا۔ جس وقت گورنمنٹ کو اہل کاران تحصیل کے مارے جانے اور خزانہ کے لوٹے جانے کی اطلاع ملی تو حاکم شاملی پہنچا اور چار طرف نعشوں اور قصبہ کی ویرانی و بربادی دیکھ کر غصہ سے تھرا اٹھا۔ آخر یہ کہہ کر "تھانہ بھون بھی اسی طرح مسمار کرا کر چھوڑوں گا۔" مظفر نگر واپس ہو گیا، اس لیے کہ تنہا تھا، اور اس بدامنی کے وقت میں جان کا خطرہ قوی —— چند ماہ بعد جب امن ہوا اور دہلی کے فتح ہو جانے کی خبر مشہور ہوئی تو قاضی صاحب کو اپنی جان کا فکر ہوا۔ یہاں تک کہ تھانہ میں یہ خبر گرم ہوئی کہ علی الصباح انگریزی فوج یہاں پہنچا چاہتی ہے۔ اس وحشت اثر اطلاع سے لوگوں کے تلوے کے نیچے سے زمین نکل گئی، اور بھاگنے کی سوجھی کہ جدھر منہ سمائے نکل جائیں۔ چنانچہ آدھی رات کے وقت قاضی صاحب نے مع چند ہمراہیان کے تھانہ بھون کو خیرباد کہی اور

بہ سمت نجیب آباد روانہ ہوئے اور وہیں سے خدا جانے کہاں گئے اور کیا ہوئے کچھ پتہ نہ چلا۔

سنا گیا ہے کہ قاضی عنایت علی کو ہمارے اکثر دینی حضرات نے اس کارروائی سے منع کیا، اور کمپنی کی طرف سے بھی پیام پہنچا کہ تم فساد سے باز آو، اپنے بھائی کو صبر کرو، غلطی سے یہ حرکت ہوگئی۔ اگر تم انتقام سے باز آگئے تو تم کو تھانہ کا نواب بنا دیا جائے گا۔ مگر تقدیر کے مضبوط پنجوں سے بھاگ جانا طاقت سے باہر ہے۔ حق تعالیٰ کے علم میں جب اس گھرانے کی تباہی و جلاوطنی اور گمشدگی و خانہ ویرانی اسی طرح مقدر تھی تو قاضی عنایت علی کیا سمجھتے۔ صبح صادق نمودار ہوئی تو بلانے کیلئے دریاں اپنے ساتھ لائی۔ تھانہ بھون سرکاری فوج سے گھیر لیا گیا۔ اور مشرقی جانب سے گولہ باری شروع ہوگئی، دن نکلنے پر فوج قصبہ میں داخل ہوئی، قتل و قتال لوٹ مار کا بازار گرم ہوگیا۔۔۔ خلاصہ یہ کہ رات کی تاریکی چھانے سے پہلے پہلے حاکم ضلع کا قول پورا ہوگیا کہ شاملی کی طرح تھانہ بھون کو بھی مسمار کر دوں گا۔ اللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

(حاشیہ تذکرۃ الرشید حصہ اول ص ۷۴،۷۳)

قصے کی اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ تھانہ بھون اور شاملی میں جو جنگ ہوئی اس کا محرک جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ نہ تھا بلکہ تھانہ بھون کے رئیس اور زمیندار قاضی عنایت علی خاں نے اپنے بھائی کا انتقام لینے کے لیے غصہ اور جوش میں یہ ہنگامہ برپا کیا تھا، اور اس ہنگامے میں ان کے ساتھ ان کے کچھ رفقاء اور ان کی رعایا شریک تھی، نہ حاجی امداد اللہ صاحب کی شرکت کا اس میں ذکر ہے اور نہ مولانا

قاسم نانوتوی اور نہ مولانا رشید احمد گنگوہی کا۔ ان حضرات کی لڑائی کا قصہ دوسرا ہے جو آگے آرہا ہے لیکن اس سے پہلے تھانہ بھون اور اس کے اطراف میں "اسلامی حکومت" قائم کرنے کا جو افسانہ بیان کیا جاتا ہے اس کے متعلق مولانا عاشق الٰہی مرحوم کی تحقیق پڑھیے۔ مولانا موصوف لکھتے ہیں:

"اس بد امنی کی حالت میں جس کو قصہ کی اصلیت ظاہر کرنے کے لیے مختصر الفاظ میں حاشیہ پر درج کردیا گیا ہے عام باشندگانِ قصبہ کی یہ حالت ہوئی گویا ان کا مربی و منتظم بادشاہ سر سے اٹھ گیا، اور شرعی و طبعی ضروریات و مخصمات میں بھی کوئی جرگہ گراں نہ رہا جس کی رائے پر عمل کریں، پس یہ لوگ اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ بلا کسی حاکم کی سرپرستی کے گزران دشوار ہے۔ گورنمنٹ نے باغیوں کی بغاوت کے باعث اپنا امن اٹھا لیا اور بذریعہ اشتہار عام اطلاع دیدی ہے کہ اپنی اپنی حفاظت ہر شخص کو خود کرنی چاہیے، اس لیے آپ چونکہ ہمارے دینی سردار ہیں اس لیے دنیاوی نظم حکومت کا بھی بار اپنے سر رکھیں اور امیر المومنین بن کر ہمارے باہمی قضیے چکا دیا کریں۔ اس میں شک نہیں کہ اعلیٰ حضرت کو ان کی درخواست کے موافق ان کے سروں پر ہاتھ رکھنا پڑا اور آپ نے دیوانی و فوجداری کے جملہ مقدمات شرعی فیصلے کے موافق چند روز تک قاضی شرع بن کر فیصل بھی فرمائے، اسی قصہ نے مفسدوں میں شریک ہونے کی راہ چلائی اور مخبروں کو جھوٹی سچی مخبری کا موقع دیا۔ حضرت امام ربانیؒ قدس سرہ دس برس ہوئے اعلیٰ حضرات

ؒ امام ربانی سے مراد مولانا رشید احمد گنگوہی ہیں، اس کتاب میں انکو بار بار اسی لقب سے یاد کیا گیا ہے۔

کو آپ نے دین و دنیا کا سردار بنا ہی چکے تھے، ہمیشہ آمد و رفت رہتی ہی تھی۔ اب جبکہ ہر چہار طرف بدامنی تھی آپ کے لیے یہاں حاضر رہنے سے زیادہ بہتر کوئی جگہ دنیا میں نہ تھی، ادھر اعلیٰ حضرت کو حکومت کے فیصلے اور شرعی قضایں مولوی کی ضرورت تھی کہ حق بات میں اعانت کرتا ہے، اس لیے آپ اور مولانا محمد قاسم صاحب مع دیگر خدام کے یہیں رہ پڑے۔"

(تذکرۃ الرشید حصہ اول ص ۷۷)

اس بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ "اسلامی حکومت" قائم کرنے کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ گورنمنٹ کی اس عام اطلاع کے بعد کہ "اپنی اپنی حفاظت ہر شخص کو خود کرنی چاہیے۔" قصبہ تھانہ بھون کے لوگوں نے حاجی امداد اللہ صاحب کو (جن کے وہ پہلے سے معتقد تھے) تنازعات اور خصومات وغیرہ کا فیصلہ کرنے کے لیے انتظاماً اپنا سربراہ بنا لیا اور حاجی صاحب کے ساتھ عقیدت اور تعلقات کی بنا پر اس بدامنی کے زمانے میں مولانا گنگوہی اور مولانا نانوتوی نے بھی یہیں اقامت اختیار کر لی، خود حاجی صاحب کو بھی اپنے تعاون کے لیے ان حضرات کی رفاقت کی ضرورت تھی، اس لیے ان کی اقامت کو پسند کیا۔

سرداری اور ماتحتی کے اس نظام کی مثالیں ہندوستان کے پچھلے دور میں نادر نہیں ہیں لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ وہ بیچارے پروپیگنڈے کے اس فن سے ناواقف تھے کہ اپنے گھریلو نظام کو "اسلامی حکومت" اور مقامی سردار کو "امیر المومنین" کے خطاب سے نوازتے، اس لیے گمنام ہو کر رہ گئے۔

اب مولانا عاشق الٰہی جیسے عقیدت مندی کی زبانی وہ قصہ بھی سن لیجیے جس میں

ان حضرات کے دست بدست جنگ کرنے کا واقعہ مذکور ہے۔ مولانا موصوف لکھتے ہیں:

"اتنی بات یقینی ہے کہ اس گھبراہٹ کے زمانے میں جبکہ عام لوگ بندکواڑوں گھر میں بیٹھے ہوئے کانپتے تھے۔ حضرت امام ربانی اور نیز دیگر حضرات اپنے کاروبار نہایت ہی اطمینان کے ساتھ انجام دیتے اور جس شغل میں اس سے قبل مصروف تھے۔ بدستور ان کاموں میں مشغول رہتے تھے، کبھی ذرہ بھر اضطراب نہیں پیدا ہوا اور کسی وقت جب برابر تشویش لاحق نہیں ہوئی۔ آپ کو اور آپ کے مختصر مجمع کو جب کسی ضرورت کے لیے شاملی، کیرانہ مظفر نگر جانے کی ضرورت ہوئی نہایت درجہ سکون و وقار کے ساتھ گئے اور طمانیت قلبی کے ساتھ واپس ہوئے۔

ان ایام میں آپ کو ان مفسدوں سے مقابلہ بھی کرنا پڑا جو غول کے غول پھرتے تھے۔ حفاظت جان کے لیے تلوار البتہ پاس رکھتے تھے۔ اور گولیوں کی بوچھاڑ میں بہادر شیر کی طرح نکلے چلے آتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسا بھی اتفاق ہوا کہ حضرت امام ربانی اپنے رفیق جانی مولانا قاسم العلوم اور طبیب روحانی اعلیحضرت حاجی صاحب ونیز حافظ ضامن صاحب کے ہمراہ تھے کہ بندوقچیوں سے مقابلہ ہوگیا۔ یہ نبرد آزما دلیر جتھا اپنی سرکار کے مخالفت باغیوں کے سامنے سے بھاگنے یا ہٹ جانے والا نہ تھا۔ اس لیے اٹل پہاڑ کی طرح پرا جما کر ڈٹ گیا، اور سرکار پر جانثاری کے لیے تیار ہوگیا، اللہ رے شجاعت و جوانمردی کہ جس ہولناک منظر سے شیر کا پتہ پانی اور بہادر سے بہادر کا زہرہ آب ہو جاتے وہاں چند فقیر ہاتھوں میں تلوار لیے جم غفیر بندوقچیوں کے

سامنے ایسے جمے رہے گویا زمین نے پاؤں پکڑ لیے ہیں، چنانچہ آپ پر فیر یں ہوئیں اور حضرت حافظ ضامن صاحب زیر ناف گولی کھاکر شہید بھی ہوئے۔ حضرت مولانا قاسم العلوم ایک مرتبہ یکایک سر پکڑ کر بیٹھ گئے، جس نے دیکھا جانا کہ کنپٹی میں گولی لگی اور دماغ پار کر کے نکل گئی۔ اعلیٰ حضرت نے لپک کر زخم پر ہاتھ رکھا اور فرمایا: "کیا ہوا میاں؟" عمامہ اتار کر سر کو جو دیکھا کہیں گولی کا نشان تک نہ ملا اور تعجب یہ ہے کہ خون سے تمام کپڑے تر....

... آخر جب مفسدوں کی معرکہ آرائی سے پیچھا چھٹا تو حضرت اپنے شہید وفا روحانی مربی کی نعش کو کاندھے پر لے کر اٹھے اور چارپائی پر لٹا کر کے بعد دیگرے تھانہ میں بہ سمتِ مغرب زمین کی گود کے حوالے کیا۔

جب بغاوت و فساد کا قصہ فرو ہوا، اور رحم دل گورنمنٹ کی حکومت نے دوبارہ غلبہ پاکر باغیوں کی سرکوبی شروع کی تو جن بزدل مفسدوں کو سوائے اس کے اپنی رہائی کا کوئی چارہ نہ تھا کہ جھوٹی سچی تہمتوں اور مخبری کے پیشہ سے سرکاری خیر خواہ اپنے کو ظاہر کریں، انھوں نے اپنا رنگ جمایا اور ان گوشہ نشین حضرات پر بھی بغاوت کا الزام لگایا، اور یہ مخبری کی کہ تھانہ کے فساد میں اصل الاصول یہی لوگ تھے اور شاملی تحصیل پر حملہ کرنے والا یہی گروہ تھا۔ بستی کی دو کالوں کے چھپر انھوں نے تحصیل کے دروازہ پر جمع کیے اور اس میں آگ لگا دی، یہاں تک کہ جس وقت آدھے کواڑ جل گئے، ابھی آگ بجھنے بھی نہ پائی تھی کہ ان نڈر طاقتوں نے جلتی آگ میں قدم بڑھائے اور بھڑکتے ہوئے شعلوں میں گھس کر خزانہ سرکار کا لوٹا تھا، حالانکہ یہ کمبل پوش، فاقہ کش، نفس کش حضرات فسادوں سے کوسوں

دور تھے ......

(تذکرۃ الرشید حصہ اول ص ۷۴ تا ۷۶)

اس بیان کو غور سے پڑھیے! کتنی وضاحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ان حضرات نے جو جنگ لڑی تھی وہ انگریزی سرکار کے خلاف اور بغاوت کی جنگ نہ تھی بلکہ اس کے برعکس وہ تو سرکار کی حمایت میں "جاں نثارانہ" اور "وفادارانہ" جنگ تھی۔ ان کی یہ نبرد آزمائی انگریزی فوج اور پلٹن کے مقابلے میں نہ تھی بلکہ سرکار کے مخالف "باغیوں" کی سرکوبی کے لیے تھی، ان حضرات کے حق میں یہ کہنا "تہمت" اور "جھوٹی مخبری" ہے کہ انھوں نے تھانہ بھون کے فساد میں حصہ لیا تھا اور شاملی تحصیل پر چڑھائی کی تھی۔

درسِ عبرت:

"تذکرۃ الرشید" کے ان تمام اقتباسات میں ہمارے ان مہربانوں کے لیے درسِ عبرت ہے۔ جو بعض سوانح نگاروں کے ذاتی تاثرات اور طبعی رجحانات کی آڑ لے کر حضرت میاں صاحبؒ کو اپنے مطاعن کا نشانہ بنانا چاہتے ہیں۔ ابھی بعض کتابیں ہم کو نہیں مل رہیں، ان کی تلاش جاری ہے۔ مل جانے کے بعد مزید سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔

اس ضمنی گفتگو کے بعد ہم پھر اپنے سابق سلسلۂ بحث (میاں صاحب کے سفرِ حج کے واقعات) کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

ایک فرضی اور جعلی توبہ نامہ :

حضرت میاں صاحب قدس سرہ کے سفرِ حج کے واقعات کے سلسلہ میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان کے خلاف مکہ معظمہ میں جو "متحدہ محاذ" بنایا گیا تھا جب وہ ان کو قتل کرا لینے یا حبسِ دوام میں پھنسا لینے کے منصوبے میں ناکام ہو گیا تو پھر اس نے دوسرے عنوان سے حضرت کے وقار کو گرا لینے کی کوشش کی۔

مکہ سے یہ جھوٹی خبر ہندوستان بھیجی گئی کہ مولانا سید نذیر حسین صاحب نے پاشائے مکہ کے سامنے "وہابیت" سے توبہ کر لی اور اپنے حنفی ہونے کا اقرار کر لیا ہے، عربی اور اردو عبارت میں ایک فرضی اور جعلی توبہ نامہ بھی تیار کر لیا گیا، اور اسی کو چھپوا کر شائع کیا گیا۔ مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی مرحوم نے "اشاعۃ السنۃ" جلد ۶ ۱۲ص ۳۴۴ میں اس کا ذکر کیا ہے، اس کی اردو عبارت یہ ہے :

"سید محمد نذیر حسین متبع سنت والجماعت عقیدۃً و فعلاً اور اس کے خلاف جتنے مذاہب ہیں خواہ رافضی خواہ خارجی خواہ وہابی سب کو برا سمجھتا ہوں اور موافق مذہبِ حنفی کے فتویٰ دیتا ہوں۔ اور حنفی المذہب ہوں۔ "وَتُبْتُ مَا أَخْطَأْتُ"

حضرت میاں صاحب کے قلم کے لکھے ہوئے دو سو سے زائد خطوط کا ایک مجموعہ "مکاتیبِ نذیریہ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے، جس میں فارسی اور اردو دونوں قسم کے خطوط موجود ہیں۔ "توبہ نامہ" کی مذکورہ بالا عبارت کو ان

خطوط سے مقابلہ کر کے دیکھ لیجیے، اگر ادب و انشاء کا معمولی ذوق بھی ہوگا تو آپ خود پکار اٹھیں گے کہ ایسی بودی، بے ربط اور گنجلک عبارت مولانا نذیر حسین محدث دہلوی کی نہیں ہو سکتی۔ رہ گیا اس کی تاریخی حیثیت کا معاملہ، سو اس کی بابت مولانا آزاد مرحوم کا بیان پڑھیے، فرماتے ہیں:

"ایک توبہ نامہ بھی مولانا نذیر حسین مرحوم کا بعض رسالوں میں میری نظر سے گزرا ہے اور وہ مباحثہ مرشد آباد میں پیش بھی کیا گیا تھا، لیکن اس کے فرضی ہونے پر میں ایسی شہادتیں رکھتا ہوں جس سے زیادہ قابلِ اعتبار شہادتیں اور نہیں ہو سکتیں، کیونکہ جو تحریر مولانا نذیر حسین نے دی تھی وہ بارہا والد مرحوم نے مجھے حرف بحرف سنائی ہے، اور وہ وہی ہے جس کا ابھی ذکر کر چکا ہوں[1]۔ زیادہ سے زیادہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں فتنے سے بچنے کے لیے ایجابی طور پر جس وضاحت سے انھیں اپنے عقائد بیان کرنا چاہیے تھا، اس سے انھوں نے گریز کی، لیکن منفی طور پر انھوں نے اپنے اصلی عقائد سے ہرگز انکار نہیں کیا۔ اور ان حالات کو دیکھتے ہوئے جو انھیں وہاں پیش آئے تھے، ان کے اس تسامح کو کوئی بھی قابلِ الزام کمزوری نہیں قرار دے سکتا۔

---

[1] یہ تحریر ص ۴۰۶ و ص ۴۰۷ پر نقل ہو چکی ہے۔ ۱۲

یہ صاف ظاہر ہے کہ اگر وہ حریف کے ساتھ بحث و جدال میں اتر کرتے تو نتیجہ نہایت ہولناک ہوتا۔"

(آزادی کی کہانی ص ۱۰۸)

اس بیان میں مولانا آزاد نے اپنے مختصر اور محتاط جملوں میں جامعیت کے ساتھ چند بڑی اہم باتوں کی طرف اشارے فرمائے ہیں، ہم ان کا تجزیہ کرکے بتاتے ہیں۔

پہلی بات جو مولانا نے پورے وثوق اور جزم و یقین کے ساتھ فرمائی ہے وہ یہ کہ جو "توبہ نامہ" مولانا سید نذیر حسین کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کو بعض رسالوں میں شائع کر دیا گیا ہے وہ بلا شبہ فرضی ہے، اس کے فرضی اور جعلی ہونے کی وہ اتنی معتبر اور قطعی شہادتیں اپنے پاس رکھتے تھے کہ جس سے زیادہ معتبر شہادت کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی، لیکن آپ کو یہ معلوم کرکے حیرت ہوگی کہ اس کے باوجود بڑے بڑے "ثقہ" حضرات اس فرضی توبہ نامہ کی تشہیر میں مصروف تھے، چنانچہ مولانا رشید احمد گنگوہی ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں۔

"غیب کی بات تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے مگر اصل حال یہ ہے کہ اس زمانہ میں غیر مقلد تقیہ کرکے اکثر اپنے آپ کو حنفی کہدیتے ہیں اور واقع میں حنفیہ کو مشرک بتلاتے ہیں۔ خود مولوی نذیر حسین نے مکہ معظمہ میں غیر مقلد ہونے سے تبری اور حلف کیا اور حنفی اپنے آپ کو بتلایا، اور ہندوستان میں وہ ہر روز سخت غیر مقلد تھے اور اب بھی ویسے ہی ہیں، سو جب امام کا یہ حال ہو تو ان کے مقتدی کیسے کچھ ہوں گے" اور مولوی نذیر حسین کا حنفیوں کو بدتر از ہنود کہنا معتبر لوگوں سے

سنا گیا ہے ..... " (تذکرۃ الرشید حصہ اول ص ۱۷۸)

بتائیے جب " ابو حنیفۃ الزماں، جنید الدوراں امام ربانی "[1] کا یہ حال ہے تو ان کے مقتدی کیسے کچھ ہوں گے، کتنی دیدہ دلیری کے ساتھ، افسوسناک اور بے بنیاد الزامات میاں صاحب سمیت سب "غیر مقلدوں کے ذمے لگا دیے گئے ہیں، کس دنیا میں رہتے ہیں وہ "غیر مقلد جو واقع میں حنفیہ کو مشرک بھی بتلاتے ہیں " اور پھر " تقیہ کر کے اپنے آپ کو حنفی بھی کہہ دیتے ہیں " اور وہ ایسا " اکثر " کرتے ہیں ؟ کتنا فساد انگیز، مکروہ اور جھوٹا ہے مولانا گنگوہی کے " معتبر " راویوں کا یہ بیان کہ مولانا سید نذیر حسین حنفیوں کو ہندوؤں سے بھی بدتر کہتے تھے[2]؟ بھلا ایسی باتیں مجہول اور گمنام شخصوں کی طرف منسوب کر کے کتابوں میں نقل کر دینے کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اہلحدیثوں اور میاں صاحب کے خلاف لوگوں میں بدظنی اور نفرت پھیلائی جائے ؟

تعجب ہوتا ہے کہ مولانا گنگوہی کے سوانح نگار نے تو اہلحدیث اور میاں صاحب کے متعلق گنگوہی صاحب کے یہ خیالات نقل کیے ہیں۔ لیکن " فتاویٰ رشیدیہ " میں اس کے برخلاف گنگوہی صاحب نے میاں صاحب کے بارے میں اپنی ناواقفیت کا اظہار کیا ہے، مندرجہ ذیل سوال و جواب پڑھیے :

---

[1] یہ سب القاب مولانا گنگوہی کی شان میں مولانا مدنی نے استعمال کیے ہیں ملاحظہ ہو شہاب ثاقب ص ۱۲

[2] اس الزام کے جھوٹ ہونے کی ایک واضح دلیل یہ ہے کہ میاں صاحب جمعہ کی نماز ہمیشہ دہلی کی مشہور جامع مسجد میں حنفی امام کے پیچھے ادا کرتے تھے دیکھو الحیاۃ بعد المماۃ ص ۱۳۸، ۱۱۱ طبع اول ۱۲

سوال: مولانا سید نذیر حسین صاحب کو جو دہلی میں محدث ہیں جو لوگ ان کو مردود اور خارج اہلِ سنت جانتے ہیں اور لامذہب کہتے ہیں، آیا یہ کہنا صحیح ہے یا نہیں؟ باوجود صحیح نہ ہونے کے ایسے لوگ فاسق بدکار ہیں یا نہیں؟ اور مولانا صاحب کے عقائد اور اعمال موافق اہلِ سنت والجماعت ہیں یا نہیں؟ ... جواب بطور ربط کے ارقام فرما دیں کیونکہ ایک عالم ان کو لعن طعن کرتا ہے اور بدتر فاسقین سے جانتا ہے۔ فقط

جواب: بندہ کو ان کا حال معلوم نہیں اور نہ میرے ساتھ ان کی ملاقات ہے، لیکن جو لوگ ان کے حال کے بیان میں مختلف ہیں، اگرچہ ان کو مردود اور خارج اہلسنت سے کہنا بھی سخت بیجا ہے، عقاید میں سب متحد مقلد غیر مقلد ہیں البتہ اعمال میں مختلف ہوتے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

رشید احمد گنگوہی (فتاویٰ رشیدیہ طبع کراچی ص ۱۸۵)

اگر جواب کی عبارت کا مطلب سمجھنے میں کچھ الجھن محسوس ہو تو اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے کیونکہ نقل بالکل اصل کے مطابق ہے غالباً یہ لاعلمی والی بات گنگوہی صاحب نے پہلے فرمائی ہوگی، پھر بعد میں جب "معتبر لوگوں" سے سن سنا کر "واقف" ہو گئے تب وہ الزامات عائد کیے جو ان کے سوانح نگار نے ذکر کیے ہیں۔

دوسری بات مولانا آزاد کے مذکورہ بالا بیان میں یہ بتائی گئی ہے کہ "یہ توبہ نامہ مباحثہ مرشد آباد میں پیش بھی کیا گیا تھا" اس مباحثہ کی دو روئیدادیں اہلِ حدیث کی طرف سے شائع کی گئی ہیں۔ ایک مولانا محمد سعید صاحب بنارسی مرحوم

کی مرتب کی ہوئی ہے، اور دوسری مولانا عبدالعزیز صاحب رحیم آبادی مرحوم کی ان دونوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مباحثہ مقام گورا بازار ضلع مرشد آباد (بنگال) میں بماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۰۵ھ (مطابق مارچ ۱۸۸۸ء) ہوا تھا۔ موضوع بحث مسئلہ وجوب تقلید شخصی تھا۔ یہ مناظرہ کئی دنوں تک ہوتا رہا، فریقین کے اکابر علماء کا اجتماع تھا۔ اہلحدیث کی طرف سے شروع سے آخر تک مولانا عبدالعزیز صاحب رحیم آبادی ہی مناظر رہے مگر احناف کے مناظر بدلتے رہے، شروع میں مولانا ہدایت اللہ خاں صاحب جونپوری، مولانا کریم بخش صاحب کلکتہ، مولوی شیر علی صاحب ملا عارف ولایتی باری باری سامنے آتے رہے آخر میں مولانا عبدالحق صاحب (تفسیر حقانی والے) دہلی سے پہنچے، انھی نے یہ "توبہ نامہ" پیش کیا تھا۔ اس کے جواب میں مولانا رحیم آبادی نے فرمایا تھا۔

"ہمارے مخاطب نے یہ کہا ہے کہ ان لوگوں کے استاد (جو ان کے بھی استاد ہیں) مولانا سید محمد نذیر حسین صاحب نے مکہ معظمہ میں توبہ کیا ہے۔ اصل حال یہ ہے کہ دلیل دینے و مباحثہ کرنے میں جب یہ لوگ بر نہیں آتے تو جھوٹ لوٹ کر بہتان باندھ کر بازی لیجانا چاہتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ یہ لوگ رسول کی عظمت نہیں کرتے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء نہیں جانتے، سور کی چربی حلال کہتے ہیں۔ خالہ، پھوپھی سے نکاح جائز سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ہم لوگ ایسے عقیدہ و مذہب والے کو کافر جانتے ہیں۔ پہلے مشہور کر دیا، اخباروں میں چھاپ دیا کہ مولانا نذیر حسین صاحب قتل کیے گئے پھر مشتہر کیا کہ وہ مکہ معظمہ میں قید ہیں، جب جناب مولانا سفر حج سے مکان پر واپس آگئے اور یہ لوگ صاف طور سے جھوٹے بن گئے، تو یہ توبہ نامہ جعلی بنا کر

مشتہر کیا ہے، جس کی عربی تک صحیح نہیں، اور دفتر وہاں کا ترکی زبان میں ہے، اور یہ عربی [1] بنا در اس پر مہر وغیرہ ندارد، اس کی تکذیب کے واسطے اہلحدیث نے خاص دفتر سے وہاں کے پروانۂ عام یومزین بہ مہر و دستخط ہے، اس کا فوٹو گراف منگوا کر ان کو جھوٹا ثابت کر دیا، وہ فوٹو گراف بعینہٖ موجود ہے۔ الحضور ثالثین میں پیش کیا گیا اگر ساتھ اس کے ان لوگوں کو جھوٹ بولتے شرم نہیں آتی۔ شاید سمجھا ہوگا کہ وہ فوٹو گراف یہاں کہاں سے آئے گا۔ ہمارا جھوٹ چل جائے گا۔ فقط

(روئداد مناظرہ مرشد آباد ص ۳۳)

مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی مرحوم نے اس فرضی اور جعلی توبہ نامہ کی بابت بڑی تفصیل سے بحث کی ہے اور اچھی طرح اس کی کھال ادھیڑ کر رکھ دی ہے ملاحظہ ہو اشاعۃ السنہ جلد ششم ۱۰۱۱ از ص ۳۴۳ تا ص ۳۴۰

---

[1] عربی توبہ نامہ کا پورا متن ابھی ہماری نظر سے نہیں گزرا، اس کی دو تین ابتدائی سطریں اشاعۃ السنہ جلد ششم ۱۱۰ ص ۲۴۲ میں نقل کی گئی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل پاشا مکہ کی تحریر ہے جس میں میاں صاحب کے متعلق "وہابیت" سے توبہ کرنے کا ذکر کیا ہے، غالباً یہی عربی تحریر مباحثہ مرشد آباد میں پیش کی گئی تھی۔ اس زمانہ میں حجاز ترکوں کی حکومت کے ماتحت تھا اور سرکاری کاغذات ترکی زبان میں ہوتے تھے، اس لیے مولانا رحیم آبادی نے گرفت کی کہ اگر یہ تحریر پاشا مکہ کی ہے اور سرکاری ہے تو ترکی زبان میں ہونا چاہیے نہ کہ عربی میں۔ عربی بھی صحیح نہیں ہے اور نہ اس پر سرکاری مہر ہے نہ دستخط۔

تیسری خاص اور اہم بات جس کی مولانا آزاد نے نشاندہی فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ مولانا سید نذیر حسین صاحب نے اپنے عقائد کی بابت جو تحریر دی تھی، اس میں انھوں نے منفی طور پر تو اپنے اصلی عقائد سے ہرگز انکار نہیں کیا ہے، البتہ ایجابی طور پر اپنے عقائد کے اظہار میں کچھ تسامح سے کام لیا ہے، لیکن ایسا انھوں نے "فتنے" سے بچنے کے لیے کیا تھا، اور جن حالات میں وہ وہاں گھرے ہوئے تھے، ان کو دیکھتے ہوئے اس تسامح کو کوئی بھی قابلِ الزام کمزوری نہیں قرار دے سکتا، کیونکہ اگر ایجابی طور پر وہ صاف صاف اپنے عقائد کا اظہار کرکے بحث و جدال پر اتر آتے تو اس کا نتیجہ نہایت ہولناک ہوتا۔

مولانا آزاد کا یہ آخری فقرہ کہ "نتیجہ نہایت ہولناک ہوتا" بڑا معنی خیز ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ میاں صاحب علیہ الرحمہ کو قتل کرانے کے بارے میں علمائ دیوبند و بریلی کی سازش اپنا پورا کام کر چکی تھی۔ اس لیے یہ ہولناک حادثہ حرم پاک میں پیش آ کر رہتا۔

توبہ نامہ کی بابت "الحیاۃ بعد المماۃ" کی بحث کا تحقیقی جائزہ:

اس موقع پر حضرت میاں صاحبؒ کے سوانح نگار مولوی فضل حسین صاحب مظفر پوری نے "الحیاۃ بعد المماۃ" میں جو بحث کی ہے اس کو پڑھ کر مجھے تعجب بھی ہوا اور افسوس بھی۔ ان کی تحریر بہت سے ناظرین کے لیے غلط فہمی کا باعث ہو سکتی ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بحث کا تحقیقی جائزہ لیا جائے۔

موصوف کا تاثر یہ ہے کہ "توبہ نامہ" کے واقعہ کو چھپانے کی کوشش کی گئی ہے۔

انھوں نے لکھا ہے کہ مخالفین نے توبہ نامہ کی جو نقل پیش کی ہے اس کو اس بنا پر جعلی قرار دینا کہ اس پر بادشاہ مکہ کا دستخط اور دفتر کی مہر نہیں ہے، یا مخالفین سے یہ مطالبہ کرنا کہ میاں صاحب کے اصلی اور دستخطی توبہ نامہ کا فوٹو شائع کرو ـــــ یہ سب مناظرانہ ڈھنگ کی باتیں ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

"اور مخالفین کو خطاب کر کے بہ آوازِ بلند منادی کر دی کہ اگر توبہ نامہ دستخطی شیخ مکہ ہے تو اس کا فوٹو بھی اسی طرح شائع کرو جس طرح ہم نے شائع کیا ہے۔ مخالفین توبہ نامہ اصلی اب لاتے ہی کہاں سے؟ وہ تو تھا بادشاہ مکہ کے دفتر میں جو پیچھے ضائع کر دیا گیا ہوگا، وہ لیک قلمی نقل اس کی لے کر یہ لوگ چلے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مخالفین فوٹو شائع نہیں کر سکے اور نقلی توبہ نامہ جعلی قرار دیا گیا۔ یہ ڈھنگ ہیں مناظرے کے۔"

اس کے بعد لکھتے ہیں:

"اب میرا سوال یہ ہے کہ اس واقعۂ توبہ کے چھپانے کی کوشش کیوں کی گئی؟ اور اس کے ظاہر کرنے میں میاں صاحب کی کرشان ہی کیا تھی؟ کسی ناکردہ گناہ سے اگر جبراً توبہ کرائی جائے تو توبہ کرنے والے کی ذلت ہی کیا ہوئی۔ مثل مشہور ہے۔ اپنی عزت اپنے ہاتھ۔ ذلت ہے تو ناجائز دباؤ ڈالنے والے کی جس نے غیر مجرم کو مجرم فرض کر لیا اور اس سے جبراً توبہ بھی کرالی۔" (ص ۹۸، ۹۹)

بلاشبہ کسی تاریخی واقعہ کو چھپانے کی کوشش کرنا سعی نامحمود ہے، اگر

ایسا کیا گیا ہے تو ہم بھی اس کو ناپسند کرتے ہیں، لیکن ساتھ ہی یہ بھی گزارش ہے کہ اسی طرح کسی تاریخی واقعہ کی صورت کو مسخ کر کے پیش کرنا بھی مذموم اور ناپسندیدہ حرکت ہے۔ اس لیے کسی واقعہ کی نسبت صرف اس کے ہونے اور نہ ہونے ہی کی جانچ کافی نہیں ہے، بلکہ اس کی بھی تحقیق ہونا ضروری ہے کہ واقعہ اگر پیش آیا تھا تو اس کی اصلی صورت کیا تھی؟ اس لحاظ سے یہاں ہمارے لیے غور طلب مسئلہ صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ میاں صاحب نے حالات کے دباؤ سے مجبور ہو کر توبہ کی تھی، یا نہیں؟ بلکہ اصل جھگڑا تو اس بات کا ہے کہ توبہ نامہ کا مضمون کیا تھا؟

مخالفین کا دعویٰ یہ ہے کہ "مولانا سید نذیر حسین صاحب نے غیر مقلد ہونے سے تبری اور حلف کیا اور اس بات کا اقرار کیا کہ میں حنفی المذہب ہوں حنفی مذہب کے مطابق فتویٰ دیتا ہوں، اہل سنت والجماعت کے خلاف جتنے مذاہب ہیں، خواہ رافضی خواہ خارجی خواہ وہابی سب کو برا سمجھتا ہوں۔" توکیا واقعی توبہ نامہ کا مضمون یہی تھا؟ مصنف "الحیاۃ بعد المماۃ" کے بیان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ توبہ نامہ کے اس مضمون کو صحیح سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ان کا وہ مذکورہ بالا بیان ایک بار پھر پڑھیے جس میں انھوں نے صاف طور سے یہ تسلیم کیا ہے کہ "مخالفین کے پاس اصلی توبہ نامہ تو نہیں ہے، مگر اس کی دو ایک قلمی نقل لے کر یہ لوگ چلے تھے" (اور اب ہندوستان میں اسی کو پیش کرتے ہیں) (یہ نقل اگرچہ اصل کے مطابق ہے) لیکن اصل کا فوٹو نہیں ہے، اس لیے اس نقلی توبہ نامہ کو جعلی قرار دیدیا گیا۔

مصنف "الحیاۃ" نے اپنے اس بیان کے ثبوت میں اگر تاریخ کی کوئی

قابلِ اعتماد شہادت پیش کی ہوتی تو ہمیں اس کے ماننے میں کوئی عذر نہ ہوتا۔ اور ہم بھی یہی کہتے کہ چونکہ یہ جبراً ہوا تھا اس لیے اس کا کوئی وزن نہیں ہے، اور نہ اس میں میاں صاحب کی کوئی ذلت ہے لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ اتنے شدید الزام کی تائید کرتے ہوئے مصنف "الحیاۃ" مرحوم نے اپنی کوئی ذمہ داری محسوس نہیں کی اور بلا کسی تاریخی ثبوت اور شہادت کے یہ تسلیم کر لیا کہ مخالفین جو توبہ نامہ پیش کرتے ہیں یہ اصل کے مطابق ہے، اس کو جعلی قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ حد یہ ہے کہ واقعہ کی جو اصلی اور سچی "روئیداد" انھوں نے خود پیش کی ہے، اس میں بھی مخالفین کے شائع کردہ توبہ نامہ کے ایک لفظ کی بھی تائید و تصدیق موجود نہیں ہے۔ مندرجہ ذیل بیان غور سے پڑھیے:

مصنف "الحیاۃ" لکھتے ہیں:

"میرے پاس کافی دلائل اس کے موجود ہیں کہ واقعات پبلک سے چھپائے گئے۔ جس کا مختصر مگر اصلی اور سچا بیان یہ ہے کہ میاں صاحب کے ہموطن و مہاجر ہموطن نے پاشا مکہ کے ہاں نہایت موثق اور موثر طریقہ پر مخبری کی کہ مولوی نذیر حسین دہلوی جو ہندوستان سے حج کو آئے ہیں وہ معتزلی اور وہابی ہیں، اگر ان کی تنبیہ اور سرزنش نہیں کی جائے گی تو اہلِ مکہ بلکہ اہلِ عرب کا عقیدہ فاسد ہو جائے گا۔ اور تین سو سے زیادہ آدمیوں نے پاشا کے سامنے اس کی گواہی دی۔ چونکہ اہلِ عرب اور ترک اعتزال کو نہایت ہی برا سمجھتے ہیں، پاشا نے آپ کو مع ان لوگوں کے جن کا ذکر اوپر گزر چکا دو بارہ طلب کیا۔

اور تین روز تک اپنے مکان میں نظر بند رکھا، اور پوچھا کہ آپ معتزلی ہیں ؟ میاں صاحب نے جواب دیا کہ نہیں ۔ پوچھا کہ اعتزال کو آپ کیسا سمجھتے ہیں ؟ آپ نے کہا نہایت برا۔ تب پاشا نے کہا کہ اچھا اعتزال سے آپ تحریری طور پر توبہ کیجیے، اور اس توبہ نامہ پر اپنا دستخط کیجیے ۔ کچھ دیر کی ردوکد کے بعد میاں صاحب نے اپنا دستخط کر دیا اور لکھ دیا کہ میں معتزلی نہیں ہوں اور اعتزال سے توبہ کرتا ہوں ۔" (الحیاۃ بعد المماۃ ص ۹۷)

اس موقع پر مصنف "الحیاۃ" نے حاشیہ میں میاں صاحب کا ایک خط بھی نقل کیا ہے، جس سے غالباً اپنے بیان کی تائید مقصود ہے ۔ یہ خط میاں صاحب نے سفر حج سے واپس آنے کے بعد اپنے ایک شاگرد مولوی سید عبدالعزیز صاحب ساکن موضع صمدن ضلع فرخ آباد (یوپی) کو لکھا تھا، اس کا ضروری حصہ یہ ہے ۔

"الحمد للہ میں سفر حجاز سے واپس آیا ۔ آپ نے اخبار میں سب حال دیکھے ہوں گے، نصرۃ السنہ نے جو چھاپا ہے وہ صحیح کیفیت سمجھو ۔ برادران ہند کی عنایت تھی، میرا جو اعزاز و تعظیم و تبجیل عرب میں ہوا، اس کا شکریہ بجناب باری تعالیٰ کرتا ہوں ۔ بے شک سعایت معاندین و منافقین سے مجھے ابتداءً بہت دشواریاں پیش آنا محسوس ہوئی تھیں، مگر الحمد للہ کہ وہ بالکل کچھ نہ تھیں ۔ یہ تم پر ظاہر ہے کہ میں معتزلی نہیں ہوں ۔ بس مجھ پر کیا حصر ہے، بلکہ تمام

لہ مسلمانوں کے گمراہ فرقوں میں ایک فرقہ "معتزلہ" بھی ہے انھی کو "قدریہ" ←

مسلمین پر اس سے توبہ کرنا واجب ہے، میں نے بھی توبہ کی۔ عرب میں اعتزال کو بہت خراب سمجھتے ہیں اور فی الواقع وہ بری چیز بھی ہے ....."

پڑھ لیا آپ نے مصنف "الحیاۃ" کا وہ بیان جس کی بابت انھوں نے خود اقرار کیا ہے کہ یہ "اصلی اور سچا" ہے۔ اسی کے ساتھ حضرت میاں صاحب کا وہ مکتوب گرامی بھی آپ کے ملاحظہ میں آگیا جس کو مصنف "الحیاۃ" ہی نے نقل کیا ہے۔ اب بتلایئے ان سے مصنف "الحیاۃ" کے اس دعویٰ کی کس طرح تائید و تصدیق ہوتی ہے کہ مخالفین کے شائع کردہ توبہ نامہ کا مضمون اصلی توبہ نامہ کی نقل ہے، اس کو جعلی قرار دینا مناظرانہ ڈھنگ کی بات ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ "اصلی توبہ نامہ" میں تو صرف اعتزال سے توبہ کرنے کا ذکر ہے، جس کا "نقلی توبہ نامہ" میں کہیں نام و نشان بھی نہیں ہے، تو پھر اس کے بعد اب کیا شبہ باقی رہ جاتا ہے، اس بات کے تسلیم کر لینے میں کہ مخالفین کا شائع کردہ توبہ نامہ یقیناً فرضی اور جعلی ہے، جو لوگ اس کے اصلی ہونے کا یا نقل کو اصل کے

← بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ لوگ انسانوں کے افعال کو انسانوں کی قدرت کی طرف منسوب کرتے ہیں، یعنی خود انسانوں کو اپنے افعال کا خالق مانتے ہیں اور تقدیر کے بھی منکر ہیں، ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ کلام الٰہی مخلوق ہے۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو صرف خیر کا خالق مانتے ہیں، ان کے نزدیک گناہ کبیرہ کا مرتکب اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، ان سے اسی قسم کے عقائد کی ہیں جو ظاہر کتاب و سنت کے خلاف ہیں۔ اس لیے اہلحدیث ان سے اپنی براءت اور بیزاری کا اعلان کرتے ہیں۔

مطابق ہونے کا دعویٰ کریں، ان سے اس کا قابلِ اعتبار ثبوت طلب کرنا مناظرانہ قسم کی دھاندلی نہیں ہے بلکہ قرآن حکیم کے اس قانون کی تعمیل ہے۔

یا یھا الذین اٰمنوا ان جاء کم فاسق بنبأ فتبینوا ان تصیبوا قوماً بجھالۃ فتصبحوا علی ما فعلتم نادمین۔

اے ایمان والو اگر کوئی شریر آدمی تمھارے پاس کوئی خبر لاوے تو خوب تحقیق کر لیا کرو، کبھی کسی قوم کو نادانی سے کوئی ضرر نہ پہنچا دو، پھر اپنے کیے پر پچھتانا پڑے۔

یہ ترجمہ مولانا اشرف علی صاحب کی تفسیر بیان القرآن سے لیا گیا ہے۔ موصوف نے اس آیت میں "فاسق" کا ترجمہ "شریر" کیا ہے۔ کیا میاں صاحب کو بدنام کرنے اور ان کے توسط سے پوری جماعت اہلحدیث کو بلاوجہ مطعون کرنے کے درپے ہونا، شرارت کی بات نہیں ہے؟ اور ایسے لوگوں کو "شریر" کہنا غلط ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر ان کی کسی خبر کو بلا تحقیق کیسے مان لیا جائے؟۔

ایک شبہہ اور اس کا جواب:

اگر کہا جائے کہ غیر مخالفین کا شائع کردہ توبہ نامہ تو واقعی جعلی اور فرضی ہے، مگر یہ تو ثابت ہوا کہ میاں صاحب نے "اعتزال" سے توبہ کی تھی تو کیا وہ معتزلی تھے؟ اگر نہیں تو پھر اس سے توبہ کرنے کا کیا مطلب ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ مصنف "الحیاۃ" کے بیان میں گزر چکا کہ باشارہ کم

کے سوال کرنے پر میاں صاحب نے صفائی کے ساتھ فرمایا تھا کہ میں معتزلی نہیں ہوں اور اعتزال کو نہایت برا سمجھتا ہوں، اس کے باوجود پاشا نے مطالبہ کیا کہ آپ تحریری طور پر اعتزال سے توبہ کریں۔

میانصاحب نے اس پر اس کے ساتھ ردوکد کی۔ مگر جب وہ نہیں مانا تو میاں صاحب نے دستخط کر دیا اور لکھ دیا کہ "میں معتزلی نہیں ہوں اور اعتزال سے توبہ کرتا ہوں۔" میاں صاحب کی تحریر کے ان دونوں فقروں پر غور کیجیے۔ پہلا فقرہ میانصاحب کا یہ ہے کہ "میں معتزلی نہیں ہوں" اسکے بعد یہ فقرہ لکھا ہے کہ "میں اعتزال سے توبہ کرتا ہوں۔" ظاہر ہے کہ پہلے فقرے میں میانصاحب نے اپنا مستقل اور مستمر عقیدہ بیان کیا ہے، اس کے بعد اسی عقیدے کی بنا پر دوسرے فقرے میں اعتزال سے اپنی برأت اور نفرت کا اظہار کیا ہے۔ لیکن برأت اور نفرت کے بجائے "توبہ" کا لفظ اس لیے استعمال کیا کہ اسی کی بابت پاشا رکہ کا اصرار تھا۔ گویا ان دونوں فقروں سے میانصاحب کا مقصد یہ تھا کہ "میں معتزلی نہیں ہوں (بلکہ اعتزال کو نہایت برا سمجھتا ہوں) اس لیے اس سے اپنی بیزاری اور نفرت کا اظہار کرتا ہوں۔" اس توجیہ کی تصدیق خود حضرت میانصاحب کے کلام سے ہوتی ہے۔ حضرت کے جس مکتوب گرامی کا اقتباس اوپر ہم نے نقل کیا ہے، اس میں وہ فرماتے ہیں:

"یہ تم پر ظاہر ہے کہ میں معتزلی نہیں ہوں، پس مجھ پر کیا حصر ہے۔ بلکہ تمام مسلمین پر اس سے توبہ کرنا واجب ہے۔ . . ."

کون عاقل کہہ سکتا ہے کہ اس سے میاں صاحب کی مراد یہ ہے کہ تمام مسلمان معتزلی ہیں، اس لیے ان پر واجب ہے کہ اس سے توبہ کریں؟ -

لہٰذا اس کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہاں "توبہ کرنے" سے میاں صاحب کی مراد یہی ہے کہ جب کبھی اس کا موقع آئے اس وقت مسلمانوں پر واجب ہے کہ اعتزال سے اپنی نفرت اور بیزاری کا اظہار کریں۔ بس یہی مراد اور مقصد اس "توبہ" سے بھی ہے جس پر باشار رکہ نے میاں صاحب سے دستخط کرایا تھا۔

شمسُ العلماءٔ کا خطابؔ

حاسدین و معاندین کی طرف سے حضرت میاں صاحب قدس سرہٗ کی ذات گرامی کو جن مطاعن کا نشانہ بنایا گیا ہے، ان میں سے ایک طعنہ یہ بھی ہے کہ ان کو گورنمنٹ انگلشیہ کی طرف سے ۲۲ رجون ۱۸۹۷ء مطابق ۲۱ محرم ۱۳۱۵ھ روز سہ شنبہ کو "شمس العلماء" کا خطاب ملا تھا۔ اس واقعہ کو میاں صاحب کے سوانح نگار نے "الحیاۃ بعد المماۃ" میں خصوصی اہتمام سے ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس کی بابت میاں صاحب نے گویا اپنی خوشنودی کا اظہار کیا تھا چنانچہ مصنف "الحیاۃ" لکھتے ہیں:

"شمس العلماء کے خطاب کا تذکرہ جب کوئی شخص میاں صاحب کے روبرو کرتا تو آپ نہایت ہی سادگی سے فرماتے کہ میاں خطاب سے

کیا ہوتا ہے، ہمارے لیے تو پورا خطاب قرآن مجید میں حنیفاً مسلماً کا موجود ہے۔ دنیاوی خطاب سلاطین سے ملا کرتا ہے، یہ گویا ان کی خوشنودی کا اظہار ہے۔ مجھے تو کوئی نذیر کہے تو کیا اور شمس العلماء کہے تو کیا۔ میں نہایت خوش ہوں کہ ہر ایک میاں صاحب مجھے کہتا ہے۔ بھائی سادات کے لیے پیارا لفظ اس سے بڑھ کر نہیں ہے، اس لفظ کی برکات سے میری درویشانہ طرز میں فرق نہ آئے۔ بس خدا کا یہی فضل ہے۔" (الحیاۃ بعد المماۃ ص ۳ ۱۰)

منقولہ بالا اقتباس میں خط کشیدہ فقرہ مصنف "الحیاۃ" کا اپنا ذاتی تاثر اور استنباط ہے۔ یہ حضرت میاں صاحب کے الفاظ نہیں ہیں۔ اس لیے اس فقرے سے ہم پر کوئی بحث نہیں قائم کی جاسکتی، ہمارے لیے قابل غور تو صرف وہ جملے ہیں جو میاں صاحب نے فرمائے ہیں، تاہم ہم پوری دیانت داری سے عرض کرتے ہیں کہ بار بار غور کرنے کے باوجود ہماری سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہ آئی کہ مصنف الحیاۃ نے آخر میاں صاحب کے کس جملے سے اپنا یہ تاثر مستنبط کیا ہے کہ "یہ گویا ان کے خوشنودی کا اظہار ہے"۔ اس کے برخلاف ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ اس موقع پر حضرت میاں صاحب نے جتنے جملے ارشاد فرمائے ہیں وہ سب کے سب ان کی باوقار اور پُر عظمت شخصیت کے بالکل شایانِ شان ہیں۔ ان کے لفظ لفظ سے اس قسم کے دنیاوی خطابات اور شاہی اعزازات کی بابت استغنا اور بے نیازی کا مظاہرہ ہو رہا ہے، انھوں نے سب سے پہلے اس خطاب (حنیفاً مسلماً) کو اپنا سرمایۂ افتخار قرار دیا جو قرآن مجید

یعنی شہنشاہ دو جہاں کی طرف سے پوری امت مسلمہ کو ملا ہے۔ اس کے بعد یہ کہہ کر "دنیاوی خطاب سلاطین سے ملا کرتے ہیں۔" میاں صاحب نے ایسے خطابات کی وقعت کو گرا دیا ہے، اور ان کی اہمیت کو گھٹا دیا ہے۔ اس لیے کہ احکم الحاکمین کے عطا کردہ خطاب کے مقابلہ میں دنیاوی سلاطین کے خطابات کے ذکر کرنے کا منشا اس کے سوا کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا۔

پس اس سے اس خطاب (شمس العلماء) کی بابت میاں صاحب کی پسندیدگی اور خوشنودی کا اظہار تو ہرگز نہیں ہوتا۔ ہاں اس سے ان کی نگاہ میں اس خطاب کی بے وقعتی کا اظہار البتہ ہوتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے صاف صاف فرما دیا کہ "مجھے کوئی نذیر کہے تو کیا، اور شمس العلماء کہے تو کیا۔" یعنی اگر نذیر کہنے سے میری عزت افزائی نہیں ہوتی تو شمس العلماء کہنے سے بھی میری شان نہیں بڑھتی۔ میری نگاہ میں یہ دونوں ہی لفظ برابر ہیں، اتنا ہی نہیں بلکہ اس سے آگے یہ بھی فرمایا "میں نہایت خوش ہوں کہ ہر ایک میاں صاحب مجھے کہتا ہے۔" گویا مقصد یہ تھا کہ دنیاوی عزت افزائی کے لحاظ سے یہ شاہی خطاب میرے لیے خوشنودی کا باعث نہیں بلکہ اس لحاظ سے میرے لیے خوشنودی کا باعث وہ خطاب ہے جو خاندان ولی اللہی کی جانشینی کے طفیل میں زبان خلق کی طرف سے مجھے ملا ہے، اور سادات کے لیے لوگوں نے اختیار کیا ہے۔ کتنی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ فرماتے ہیں۔ "وہ بھائی سادات کے لیے پیارا لفظ اس سے بڑھ کر نہیں ہے۔"

سوچنے کی بات ہے کہ جو اللہ کا بندہ "میاں صاحب" جیسے سادہ لفظ کو

اپنے حق میں سب سے بڑھ کر پیارا لفظ" سمجھا ہو اور اپنی فقیرانہ اور درویشانہ زندگی کو اس لفظ کی برکات میں شمار کرتا ہو، جس کا جذبہ یہ ہو کہ "اس لفظ کی برکات سے میری درویشانہ طرز میں فرق نہ آئے۔ بس خدا کا فضل یہی ہے۔" بھلا وہ اس اونچے خطاب پر اپنی خوشنودی کا کیا اظہار کرے گا؟ جو کسی دنیادار حاکم کی طرف سے محض اپنے دنیاوی اغراض و مصالح کے پیش نظر ملا ہو۔ اور جس کی بابت اس بات کا پورا خطرہ موجود ہو کہ اس کی وجہ سے نفس امارہ تفوق اور برتری کے احساسات میں مبتلا ہو کر جاہ پسندی، شہرت طلبی اور نام و نمود کا رسیا بن جائے گا۔ حضرت میاں صاحب اپنی فقیرانہ زندگی پر کس طرح مطمئن اور قانع تھے اس کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ مصنف "الحیاۃ" لکھتے ہیں:

"نواب سکندر بیگم مرحومہ والیہ بھوپال اپنے مدار المہام منشی جمال الدین مرحوم کے ساتھ دہلی آئیں اور میاں صاحب سے عہدۂ قضائے ریاست کے قبول کرنے کی استدعا کی۔ مگر آپ نے ملازمت سے قطعاً انکار کیا اور فرمایا کہ میں تو وہاں کا قاضی القضاۃ ہو کر امیرانہ ٹھاٹھ سے مسند لگائے حاکم بنا ہوا بیٹھا رہوں گا۔ یہ غریب طلبہ چٹائی کے بیٹھنے والے مجھ کو کہاں ڈھونڈتے پھریں گے؟"

(الحیاۃ بعد المماۃ ص ۱۳۱)

بتائیے! جس مرد خدا نے ایک مسلمان ریاست کے بخشے ہوئے اعزاز کو پا کر اپنی خوشی کا اظہار نہ کیا ہو اور نہ رضا و رغبت کے ساتھ اس کو قبول کر لینا گوارا کیا ہو، اس کی نسبت ہم کس طرح باور کر لیں کہ اس نے انگریز کے دیے ہوئے

اعزاز کو پاکر اپنی خوشی کا اظہار کیا ہوگا؟ اور رضا و رغبت کے ساتھ اسے منظور کیا ہوگا؟ یہ صحیح ہے کہ میاں صاحب نے اس خطاب کو واپس نہیں کیا۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کا سبب یہی تھا کہ وہ اس سے خوش تھے، اس کے دوسرے اسباب بھی ہوسکتے ہیں اور وہی قرین قیاس ہیں، جیسا کہ ہم آگے بتائیں گے۔ اس سے پہلے ایک دوسرا واقعہ بھی سن لیجیے، جس سے معلوم ہوسکے گا کہ کس طرح میاں صاحب اپنی فقیری میں بھی شاہی آن بان کی شان رکھتے تھے، انھیں منشی جمال الدین مرحوم مدار المہام ریاست بھوپال نے، جن کا ذکر ابھی اوپر گزرا ہے، ایک مرتبہ حضرت میاں صاحب کو مشورہ دیا کہ آپ اپنے مدرسہ کی امداد کے لیے بھوپال کی رئیسہ کی خدمت میں کوئی تحریر بھیجیں، اس کے جواب میں میاں صاحبؒ نے ان کو لکھا:

" دربارۂ اعانت مدرسہ مرا کہ نوشتہ اند کہ تحریرے بجناب سرکار عالیہ والیۂ ملک باید نوشت تا معاملہ رو باصلاح گیرد مرا از ہمچوں لغو تحریکہا ہمیشہ اجتناب است، بر در خداوند تعالیٰ نشستہ درس دلی دہم، وے تعالیٰ شانہ از خزانہ غیب اعانت مدرسہ و متعلمین خواہد کرد، چہ کرمرا از رجوع خدمت اغنیاء کراہتے بخشیدہ است بندۂ فقیر برائے خود نہ می خواہد ہر کہ دریں جا آورد مراد طالبان علم روزی کافی وافی می رساند بس مایۂ قناعت خود فروختن کار ابلہان است۔

(مکاتیب نذیریہ ص ۱۷)

ترجمہ: (آپ نے میرے مدرسہ کی امداد کے بارے میں جو تحریر فرمایا ہے کہ

سرکارِ عالیہ والیہ ریاست کو لکھنا چاہیے تاکہ معاملہ درست ہو جائے، تو مجھ کو ایسی لغو تحریکوں سے ہمیشہ پرہیز رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے دروازہ پر بیٹھ کر پڑھاتا ہوں۔ وہی اپنے خزانۂ غیب سے مدرسہ اور طالب علموں کی مدد کرے گا مجھے اللہ تعالیٰ نے امیروں کے دروازے پر جانے سے کراہت بخشی ہے۔ بندہ فقیر اپنی ذات کے لیے کچھ نہیں چاہتا ہے، جو یہاں لایا ہے وہی مجھ کو اور میرے طالبعلموں کو پوری روزی بہم پہنچاتا ہے۔ ایسی صورت میں صبر و قناعت کی پونجی کو فروخت کر دینا نادانوں کا کام ہے۔)

جس صاحب صدق و صفا، مومنِ باخدا کی خودداری کا یہ عالم ہو کہ ایک مسلمان اور عقیدت مند والیۂ ملک کی خدمت میں اپنے لیے نہیں اپنے مدرسہ اور طلبہ کی اعانت کے لیے بھی درخواست پیش کرنا، لغو اور بیکار حرکت سمجھتا ہو۔ جو پوری بے نیازی اور اطمینان قلب کے ساتھ یہ اعلان کرتا ہو کہ "مرا از رجوع خدمتِ اغنیا کراہتے بخشیدہ است" (مجھے اللہ تعالیٰ نے امیروں کے درباروں اور مالداروں کے دروازوں پر اپنی حاجت لے کر جانے سے کراہت اور نفرت کی نعمت بخشی ہے۔) اس کے حق میں میں تو یہ سوچنا بھی اس کی خودداری اور بے نیازی کی توہین سمجھتا ہوں کہ کسی انگریز افسر کے عطا کردہ خطاب کو اس نے اپنی رفعتِ شان کا ذریعہ سمجھا ہو، اور اس بنا پر اس کی بابت اپنی خوشنودی کا اظہار کیا ہو۔ حاشا ثم حاشا۔

مصنف "الحیاۃ" ہی نے نقل کیا ہے کہ:

"مولوی ابوسعید محمد حسین صاحب لاہوری فرماتے تھے کہ میں جب دہلی میں پڑھتا تھا تو میاں صاحب اکثر میری فرودگاہ پر تشریف لاتے

اور اسی صف نعال کے قریب چٹائی پر بیٹھ جاتے۔ میں بااصرار
عرض کرتا کہ حضور ادھر فرش پر بیٹھیں۔ تو فرماتے ؎

بر بساطِ اغنیاء ہرگز نیایند اہلِ فقر
زانکہ نقشِ بوریا ایں قوم را زنجیر پاست

(الحیاۃ بعد المماۃ ص ۱۳۳)

ذرا سوچیے! جس بوریا نشین فقیر کی طبیعت کا یہ رنگ ہو کہ وہ اپنے، شاگردوں کے سامنے بھی جوتوں کے قریب چٹائی پر بیٹھ جانے ہی کو اپنی عزت سمجھتا ہو، اس کے مزاج کے ساتھ یہ بات کس طرح میل کھا سکتی ہے کہ وہ کوئی دنیاوی اعزاز و خطاب پاکر خوش ہوا ہوگا، اور اپنی اس خوشی کا دوسروں پر اظہار بھی کیا ہوگا۔ "شمس العلماء" کا خطاب حاصل کرنے کی میاں صاحب کوشش تو کیا کرتے، ان کو تو کبھی اس کا وہم و گمان بھی نہ گزرا تھا کہ ان پر انگریز کی یہ نوازش ہوگی۔

مصنف "الحیاۃ" لکھتے ہیں:

"معلوم ہوا ہے کہ جس وقت کمشنر دہلی نے بحکم لفٹنٹ گورنر پنجاب گورنمنٹ کی طرف سے اس خطاب کی خبر آپ کو دی اس سے ایک منٹ آگے میاں صاحب کے وہم و گمان میں بھی کبھی یہ بات نہ آئی تھی کہ میں اس نام لقب سے ملقب ہوں گا۔" (الحیاۃ ص ۱۰۳)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ میاں صاحب نے اپنے دعوائے دشوہ کے ساتھ بالقصد انگریزی حکومت کی خیر خواہی کی نیت سے کبھی کوئی ایسی خدمت انجام نہیں دی تھی جس کے صلہ میں خود ان کو کسی خصوصی انعام و اکرام کی توقع ہوتی۔

کیونکہ اگر ان کا اپنا کوئی ایسا کارنامہ ہوتا، تو پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ اس اعزازی خطاب، یا اس قسم کے کسی دوسرے انعام و اکرام کے ملنے سے بالکل خالی الذہن ہوتے۔

درحقیقت یہ انگریز کی ایک حکمتِ عملی اور پالیسی تھی، اس لئے اپنے معتقد کی خاطر میاں صاحب کو یہ اعزاز دیا تھا، غالباً میاں صاحب بھی اس کو بھانپ گئے تھے، جیسا کہ ان کے بعض وہ فقرے اس پر دلالت کرتے ہیں جو اس خطاب کی خوشخبری سنانے والوں کے سامنے انھوں نے پہلی بار فرمائے تھے۔ چنانچہ مصنف "الحیاۃ" کا بیان ہے کہ :

"جب لوگ خلعت و خطاب کے ساتھ میاں صاحب سے ملے اور آپ کو اس سے آگاہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ ہم غریب آدمی خلعت و خطاب لے کر کیا کریں گے۔ خلعت و خطاب تو بڑے آدمیوں کو ملنا چاہیے، ہم کو دنیا لاحاصل ہے۔ لہٰذا اس کثرت و تشدید کے آپ نے اسی قدر فرمایا، اچھا صاحب آپ حاکم ہو جو چاہو کہو۔" (الحیاۃ بعد المماۃ ص ۱۰۳)

میاں صاحب کا یہ فقرہ اپنی جگہ بڑا ذو معنی ہے کہ "ہم کو دنیا لاحاصل ہے"، یعنی خلعت و خطاب دے کر بڑے آدمیوں کو خریدا جاتا ہے اور موقع بموقع، ان کو اپنے مقصد برآری کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے مجھ جیسے آدمی کو خلعت و خطاب دینا لاحاصل ہے، کیونکہ مجھے اس خطاب کے ذریعہ نہ خریدا جاسکتا ہے اور نہ اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے، یوں تم حاکم ہو اپنے منہ سے کہنے کو جو تمہارا جی چاہے کہو۔ نذیر حسین کہو یا شمس العلماء، مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میرے نزدیک یہ دونوں ہی برابر ہیں۔

اسی مقصد کو میاں صاحب نے ایک سنجیدہ انداز میں ادا کیا ہے۔ اور یہی انداز ان کی باوقار شخصیت کے لیے مناسب بھی تھا، اس لیے کہ وہ کوئی ہنگامہ پسند لیڈر تو نہیں تھے کہ تیز و تند جملے استعمال کر کے "زندہ باد" کے نعرے لگواتے اور پھولوں کے ہار سے اپنا استقبال کراتے۔

ایک صاحب کا کہنا ہے کہ میاں صاحب کو یہ خطاب مولانا بٹالوی مرحوم نے دلایا تھا۔ معلوم نہیں وہ اپنے اس دعوے پر کیا ثبوت رکھتے ہیں۔ مجھے تو ابتک تاریخ سے اس کی کوئی شہادت نہیں ملی۔ ۔ بہر حال یہ یقینی ہے کہ میاںصاحب کی ایسی کسی کوشش کو اس خطاب کے ملنے میں قطعاً کوئی دخل نہیں تھا۔ اب رہا یہ شبہ کہ پھر میاں صاحب نے اس کو صاف لفظوں میں رد کیوں نہیں کر دیا۔؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس خطاب کے ملنے پر میاںصاحب نے اپنے تاثرات کا اظہار جن الفاظ میں فرمایا تھا، جب اُن سے معلوم ہوتا ہے (جیسا کہ ہم نے اوپر بتایا) کہ میاں صاحب کی نظر میں اس کی کوئی وقعت نہیں تھی، اور نہ انھوں نے اس سے کوئی دلچسپی لی تھی، تو نتیجہ کے اعتبار سے میاں صاحب کا یہ طرزِ عمل اس کے رد کر دینے ہی کے مرادف ہے، البتہ صاف و صریح لفظوں میں رد نہیں کیا، اس لیے کہ ابھی چند ہی سال گزرے تھے کہ اہلحدیث انگریزی حکومت کی نگاہوں میں سخت معتوب تھے، کیونکہ بقول مولانا غلام رسول مہر "اہلحدیث اور وہابیوں کو مترادف سمجھا جاتا تھا۔[1]" بغاوت کے الزام میں ان پر کئی مقدمات چل چکے تھے،

---

[1] ملاحظہ ہو سرگذشتِ مجاہدین ص ۴۰۲ ۔ ۱۲

اور ان مقدمات کی وجہ سے ان میں سے بہتوں کی بڑی بڑی جائدادیں ضبط ہو چکی تھیں، کتنوں کو کالا پانی اور حبسِ دوام کی سزا ہو چکی تھی۔ خود میاں صاحب بھی ایک مقدمہ کے سلسلے میں گرفتار ہو کر تقریباً ایک سال تک جیل میں نظر بند تھے ادھر علمائے احناف کی اشتعال انگیزیوں کی وجہ سے حنفی عوام برابر موقع کی تاک میں رہتے تھے۔ انگریز افسروں کے پاس جا جا کر "وہابیوں" کے خلاف مخبری کرتے تھے ان کو بھڑکاتے تھے کہ "وہابی" آپ کے باغی اور بدخواہ ہیں۔

الغرض سالہا سال کی پریشانیاں اور مصیبتیں جھیلنے کے بعد اب بظاہر فضا میں کچھ سکون پیدا ہوا تھا، اور اہلحدیث کے خلاف انگریز کی بدگمانیوں میں کمی آگئی تھی، ایسی حالت میں اگر صاف و صریح لفظوں میں میاں صاحب اس خطاب کو رد کر دیتے تو یہی حنفی حضرات جنھوں نے آج تک میاں صاحب کا پیچھا نہیں چھوڑا ہے، اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے اور انگریز افسروں کے پاس جا کر ان کے کان بھرتے کہ اگر یہ آپ کے باغی اور بدخواہ نہیں ہیں تو آپ کا خطاب انھوں نے کیوں واپس کر دیا؟ اس طرح خطرہ تھا کہ میاں صاحب اور پوری جماعت اہلحدیث پر پھر مصیبت کا دور شروع ہو جاتا۔ یہ مصلحت تھی جس کے باعث میاں صاحب نے اس معاملہ میں بظاہر اغماض اور چشم پوشی سے کام لیا۔

میاں صاحب کی خانہ تلاشی اور جیل کی نظر بندی

حضرت میاں صاحب علیہ الرحمۃ کی زندگی کے ان واقعات کے سلسلہ میں جو ان کے زمانہ کی حکومت اور سیاست سے متعلق ہیں، یہ واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ سنہ ۱۸۶۴ء و سنہ ۱۸۶۵ء (مطابق سنہ ۱۲۸۰، ۸۱ھ) میں پٹنہ اور انبالہ وغیرہ میں بہت سے مسلمان اس الزام میں گرفتار کیے گئے، اور ان پر سنگین مقدمات چلائے گئے کہ یہ لوگ خفیہ طریقے سے سرحد پار کے ان مجاہدین کی مدد کر رہے ہیں جو انگریزوں سے برسرپیکار ہیں۔ ان ماخوذین میں بڑی تعداد اہلحدیثوں کی تھی۔ اسی لیے یہ مقدمات "وہابی کیس" کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ ان کی تفصیلات بڑی دردانگیز ہیں، جو ان شاء اللہ اپنے موقع پر پیش کی جائیں گی۔ حضرت میاں صاحب قدس سرہٗ اہلحدیث کے سرخیل اور سرتاج تھے۔ اس لیے وہ بھی ان مقدمات کی لپیٹ میں آئے۔ پہلے ان کے مکان اور مسجد کی تلاشی ہوئی۔ کچھ خطوط اور کاغذات پولیس اپنے ساتھ لے گئی، اس کے بعد خود میاں صاحب کو دہلی سے پنڈی طلب کیا گیا، اور پنڈی سے پھر راولپنڈی لے جایا گیا۔ راولپنڈی ہی کے جیل خانے میں ایک سال تک نظر بند رکھے گئے۔ مولانا

غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

"..... (ان مقدمات میں) شیخ الکل میاں نذیر حسین محدث دہلوی بھی ہدفِ ابتلا بنے تھے، میاں صاحب مرحوم اہلِ حدیث کے سرتاج تھے۔ اہلِ حدیث اور "وہابیوں" کو مترادف سمجھا جاتا تھا۔ مخبروں نے میاں صاحب کے خلاف بھی شکایتیں حکومت کے پاس پہنچائیں، ان کے مکان کی تلاشی ہوئی اور بہت سے خط ملے گئے، جو ہندوستان کے مختلف حصوں سے آتے رہتے تھے۔ ان میں یا تو مسئلے پوچھے جاتے تھے یا مختلف دینی کتابوں کے متعلق دریافت کیا جاتا تھا۔ میاں صاحب سے پوچھا گیا کہ آپ کے پاس اتنے خطوط کیوں آتے ہیں؟ انھوں نے بے تکلف جواب دیا کہ یہ سوال خط بھیجنے والوں سے کرنا چاہیے نہ کہ مجھ سے۔ ایک خط میں مرقوم تھا کہ "نخبۃ الفکر" (اصولِ حدیث کی ایک کتاب) بھیج دیجیے۔ مخبر نے کہا کہ یہ خاص اصطلاح ہے جس کا مفہوم کچھ اور ہے۔ اور یہ لوگ خطوں میں اصطلاحی الفاظ سے کام لیتے ہیں۔

میاں صاحب نے یہ سنا تو جلال میں آگئے اور فرمایا "نخبۃ الفکر" کیا؟ توپ، نخبۃ الفکر کیا؟ بندوق، نخبۃ الفکر کیا؟ گولہ بارود۔[1]

بہرحال آپ کو دہلی سے راولپنڈی لے گئے اور وہاں کم و بیش ایک سال جیل خانے میں نظر بند رکھا ..... میاں صاحب نے سرکاری

---

[1] حاشیہ "الحیاۃ بعد المماۃ"، ص ۸۱، ۸۲)

لائبریری سے کتابیں منگوانے کی اجازت مل گئی تھی اور ان کا بیشتر وقت مطالعہ میں گزرتا تھا ...... میاں صاحب کے خلاف کوئی الزام پایۂ ثبوت کو نہ پہنچ سکا تو تقریباً ایک سال کے بعد انھیں ابتلا سے نجات ملی۔ میاں صاحب کے صاحبزادے مولانا سید شریف حسین کے ایک مکتوب سے واضح ہوتا ہے کہ چیمبرلین صاحب تحقیقات پر مقرر ہوئے تھے، پہلے چند آدمی دہلی آئے تھے اور میاں صاحب سے مجاہدین یا ان کے معاونین کے متعلق پوچھا۔ انھوں نے جواب دیا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ پھر چیمبرلین کے حکم سے انھیں پشاور طلب کیا گیا۔ میاں صاحب پشاور پہنچے تو معلوم ہوا کہ چیمبرلین راولپنڈی چلا گیا۔ چنانچہ میاں صاحب کو راولپنڈی آنا پڑا۔ اس اثنا میں چیمبرلین کسی سرکاری کام کے سلسلے میں انبالہ گیا اور وہاں فوت ہو گیا۔ میاں صاحب اس کے قائم مقام کے انتظار میں راولپنڈی ہی میں ٹھہرے رہے۔ قائم مقام نے میاں صاحب سے مجاہدین کا نام اور حال پوچھا، انھوں نے بے خبری ظاہر کی تو وہ بہت خفا ہوا۔ یہ خط اس زمانے میں لکھا گیا تھا جب میاں صاحب کی ابتلا پر پانچ مہینے گزر چکے تھے۔[۱]

(سرگزشتِ مجاہدین ص ۴۰۲، ۴۰۳)

ان مقدمات کے ایک خاص ملزم، جناب مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ راولپنڈی جیل میں میاں صاحب پر جبر کیا جاتا تھا کہ

---

[۱] مکاتیب نذیریہ ص ۳۲۰

(۵) ان کل ممبران اہلحدیث کے نام ظاہر کریں جو اس باغیانہ تحریک میں شریک ہیں۔

(ملاحظہ ہو کالا پانی ص ۱۰۸ شائع کردہ مسلمان اکیڈمی کراچی)

اور مصنف "الحیاۃ" نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ "راولپنڈی جیل میں میاں صاحب کو روزانہ پھانسی کی دھمکی دی جاتی تھی۔"

(الحیاۃ بعد المماۃ ص ۱۳۶)

تلاشی میں جو خطوط اور کاغذات برآمد ہوئے تھے، ان میں سے بعض کے متعلق ایک سرکاری رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ مولوی محمد جعفر تھانیسری (تین خط) مبارک علی ساکن پٹنہ (دو خط) عطاء اللہ (میرٹھ) محمد عثمان کانپور، امین الدین کلکتہ، ابوسعید محمد حسین بٹالوی۔ محمد سوداگر المورٹہ کے خطوط تھے۔ خود میاں صاحب کے خطوط کی نقولیں جو مختلف حضرات کو لکھے گئے تھے۔ بہادر شاہ ظفر بادشاہ دہلی کے غدر ۱۸۵۷ء کے دوران کے پانچ فرمان بھی نکلے۔ (ضمیمہ کالا پانی از ایوب قادری شائع کردہ مسلمان اکیڈمی کراچی)

ایک عجیب اعتراض:

جماعت اہلحدیث کے ایک خصوصی کرم فرما جو سرتاج اہلحدیث حضرت میاں صاحب علیہ الرحمۃ کے خلاف طرح طرح کی باتیں پھیلانے اور ان کے وقار کو لوگوں کی نگاہوں میں گرانے ہی کو ایک بڑی دینی خدمت سمجھ رہے ہیں، ان کے سامنے میاں صاحب کی نظربندی کے اس واقعہ کو کسی نے پیش کر کے کہا کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میاں صاحب انگریز نواز نہیں تھے، تو اس کے جواب میں انھوں نے

فرمایا:

"آپ کو معلوم ہوگا کہ ۱۸۶۴، ۶۵ء کے بعد بھی سازش کے مقدمات ۱۸۷۰ء مالدہ راج محل، اور آخری مقدمہ سازش ۱۸۷۱ء پٹنہ چلے لیکن ان تمام مقدمات میں میاں صاحب مرحوم پر کوئی الزام نہیں لگا، اور نہ وہ پھر کبھی ماخوذ ہوئے۔"

بتائیے یہ جواب دھاندلی بازی کے سوا اور کیا ہے؟ یہ بھی کوئی اعتراض ہے کہ ایک ہی دفعہ تو پکڑے گئے؟ میں پوچھتا ہوں کہ حاجی امداد اللہ صاحب، مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی، مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی (جن کے بارے میں کچھ لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ وہ انگریز کے مخالف تھے) کتنی بار ماخوذ ہوئے تھے؟ غدر کے بعد بغاوت کے سیکڑوں مقدمات چلائے گئے۔ بتایا جائے کہ ان میں سے کتنے مقدمات میں یہ حضرات ملزم بنے تھے اور کتنی بار جیل گئے تھے؟۔

اگر تاریخ ان سوالوں کا جواب نفی میں دیتی ہے تو کیا ان حضرات کے خلاف بھی کبھی کوئی "نجویٰ" کیا گیا؟ ان کے عقیدت مندوں کو بھی کبھی یہ طعنہ دیا گیا کہ تمہارے فلاں بزرگ تو بغاوت کے کسی مقدمہ میں کبھی نہیں پکڑے گئے، اور فلاں تو صرف ایک ہی دفعہ ماخوذ ہوئے تھے، آخر اہلحدیث اور میاں صاحب ہی کے خلاف اب ہی "تاریخ دانی" کے مظاہرے کا شوق کیوں پورا کیا جا رہا ہے؟

مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ درحقیقت یہ دل کا ایک ارمان ہے۔ جو شعوری یا غیر شعوری طور پر اعتراض کی صورت میں زبان قلم پر آگیا ہے۔ دراصل ملال اس بات کا ہے کہ میاں صاحب کو یہ موقع کیوں ملا؟ کہ کسی قدر اطمینان کے ساتھ

وہ توحیدِ خالص کی اشاعت اور سنت کے احیاء میں لگے رہے، جس کے نتیجے میں رسمی حنفیت پر زوال آیا۔ ایسا کیوں نہیں ہوا؟ کہ وہ بار بار پکڑے جاتے، ان پر طرح طرح کے مقدمات چلا کر خوب پریشان کیا جاتا، وہ سالہا سال تک جیلوں میں پڑے رہتے تا آنکہ علمائے احناف کی اشتعال انگیزیوں کی بدولت کسی حنفی "مجاہد" کے ہاتھوں شہید کر دیے گئے ہوتے، یا ان کے خلاف جھوٹی شہادتیں گذار کر ان کو پھانسی دلوا دی گئی ہوتی۔ یا کم از کم یہ ہوا ہوتا کہ "کالے پانی" ہی بھیج دیے گئے ہوتے۔

اگر ایسا نہیں ہے تو پھر بات کا رخ پھیرنے کی کوشش کیوں کی گئی ہے؟

سوال تو یہ تھا کہ اگر واقعی میاں صاحب انگریز نواز تھے تو انگریز کی نگاہ ان پر اتنی کڑی کیوں تھی بلکہ بغاوت کے ملزموں کی گرفتاری دہلی میں نہیں انبالہ اور پٹنہ میں ہوتی ہے لیکن تلاشی میاں صاحب کے گھر میں ہوتی ہے اور اتنے اہتمام کے ساتھ ہوتی ہے کہ گھر کا کونہ کونہ چھان ڈالتے ہیں، مسجد کی چٹائیاں تک الٹ پلٹ کر دیکھتے ہیں۔ ایک ایک چٹھی پڑھی جاتی ہے، پرزہ پرزہ ٹٹولا جاتا ہے۔ "نخبۃ الفکر" کو اصطلاحی لفظ کہہ کر جرح کی جاتی ہے۔ اس کے باوجود معاملہ یہیں ختم نہیں کر دیا جاتا، بلکہ میاں صاحب کو دہلی سے پشاور طلب کیا جاتا ہے، وہاں افسرِ تفتیش سے ملاقات نہیں ہوتی تو راولپنڈی جانا پڑتا ہے، وہ افسرِ تفتیش مر جاتا ہے تو اس کی جگہ دوسرا افسر مقرر کیا جاتا ہے، یہ افسر اہلحدیث ممبروں کے نام بتلانے کے لیے میاں صاحب پر جبر کرتا ہے وہ نہیں بتلاتے تو ناراض ہوتا ہے، پھانسی تک کی دھمکی دیتا ہے۔ مگر میاں صاحب کی استقامت میں فرق نہیں آتا۔ تفتیش و تحقیق اور جبر و تشدد کے یہ سارے مراحل طے ہو جاتے ہیں۔ کوئی قابلِ گرفت چیز انگریز کے ہاتھ نہیں لگتی۔

تب بھی اس کی بے اطمینانی کا یہ عالم ہے کہ وہ میاں صاحب کی رہائی کا حکم جاری نہیں کرتا: بلکہ کامل ایک سال تک ان کو جیل میں بند رکھتا ہے۔

انصاف سے کہیے! کیا ایک "خیر خواہ اور وفادار" ایسی سلوک کا مستحق ہوتا ہے؟

واقعہ کی اس صورت حال سے کترا جانا اور یہ کہکہ مغالطہ دینے کی کوشش کرنا کہ اس کے بعد تو پھر کبھی نہیں پکڑے گئے۔ محض بغض و عناد کی بات ہے، بعد کی گفتگو بعد میں ہوگی۔ پہلے اس واقعہ کی نسبت بتایا جائے کہ کیا اس میں میاں صاحب نے کوئی کمزوری دکھلائی تھی؟ اگر انھوں نے کوئی کمزوری نہیں دکھلائی، اور انگریز اپنی تفتیش میں ناکام رہا، اس بنا پر بعد کے مقدمات میں وہ ماخوذ نہیں ہوئے تو اس سے میاں صاحب کی طرف سے "انگریز نوازی" کا ثبوت کیسے ہوگیا؟ یہ کیوں نہیں کہا جاسکتا کہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی حکمت ان کے شامل حال تھی۔ وہ میاں صاحب کے درس قرآن اور درس حدیث کے فیض اور ان کے وعظ و تبلیغ کی برکات سے اصلاح عقائد و اعمال کی خدمت لینا چاہتا تھا۔ اس لیے ان کو اس کی توفیق بخشی اور پریشانیوں میں ڈالنے کے بجائے سکون کے ساتھ کام کرنے کا موقع عنایت فرمایا۔

کیا لطف کی بات ہے کہ حاجی امداد اللہ صاحب اور مولانا محمد قاسم نانوتوی اپنی خفیہ تدبیروں میں کامیاب ہوجائیں اور ایک بار بھی انگریز کی گرفت میں نہ آئیں۔ مولانا رشید احمد گنگوہی صرف ایک مرتبہ پکڑے جائیں اور اس میں بھی توریہ کرکے اپنے آپ کو مواخذہ سے بچالے جائیں تو اس کو تو ان بزرگوں کا روحانی تصرف اور ان کی کرامت سمجھا جائے لیکن اگر میاں صاحب باربار ماخوذ نہ ہوں تو اس کو ان کی "انگریز نوازی" کہا جائے، واہ رے انصاف!!

میاں صاحب کے بعض عقیدتمندوں کا غلط حسنِ ظن:

ان معاندانہ ریشہ دوانیوں کے مقابلہ میں کچھ دوستانہ حسن ظنیاں بھی ہیں۔ جو آج میاں صاحب کے حق میں غلط فہمی پیدا کرنے کا باعث بن رہی ہیں۔ ہمارے خیال میں اس موقع پر ان کا ازالہ بھی ضروری ہے۔ قصہ یہ ہے کہ جب ہندوستان میں انگریز کا ستارہ چمک رہا تھا اور پورا ملک اس کے استبدادی پنجے کے نیچے دبا ہوا تھا اس وقت ایک مدت تک اہلحدیث "وہابی" کے نام سے بحیثیت فرقے کے انگریز کے معتوب رہ چکے تھے، اس لیے جن کے دل و دماغ پر اس ماحول کا رعب چھایا ہوا تھا انھوں نے اپنے زعم میں میاں صاحب کی خیر خواہی اور بھلائی کے لیے اور میاں صاحب کے ساتھ اپنی محبت و عقیدت ظاہر کرنے کے لیے یہی مناسب سمجھا تھا کہ حضرت میاں صاحب کو انگریزی حکومت کا "خیرخواہ" اور "وفادار" بتائیں۔ چنانچہ انگریزی حکومت کے استبدادی دور میں بعض ایسی کتابیں لکھی گئیں جن میں میاں صاحب کے بعض عقیدتمندوں نے میاں صاحب کی شان میں ایسے ہی کلمات استعمال کیے اور ان کے متعلق بعض واقعات کی بنا پر اپنے ذاتی تاثرات کو اسی انداز میں پیش کیا ہے۔ میاں صاحب کے سوانح نگار مولوی فضل حسین صاحب مظفر پوری مرحوم بھی انھیں لوگوں میں سے ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب میں، خانہ تلاشی اور نظر بندی کے مذکورہ بالا واقعہ کا جہاں ذکر کیا ہے، وہاں یہ دکھانے کے بعد کہ "تلاشی میں کوئی قابلِ گرفت چیز برآمد نہیں ہوئی" اپنے تاثرات کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

الغرض بعد تحقیقاتِ کامل یہ بات روزِ روشن کی طرح کھل گئی کہ

ان پر (یعنی میاں صاحب پر) مواخذہ محض ناجائز ہے اور یہ بالکل بری الذمہ ہیں۔ اس لیے رہا کر دیے گئے۔ یہ باتیں ہیں جو میاں صاحب کے ظاہر و باطن کے یکساں ہونے پر دلالت کرتی ہیں، وہ جس طرح غدر ۱۸۵۷ء میں مسز لیسنس کی جان بچانے سے وفادار ثابت ہوئے تھے اسی طرح ۱۸۶۴، ۶۵ء کے مقدمات میں بھی بے لگاؤ ٹھہرے۔"

(الحیاۃ بعد المماۃ ص ۸۲)

"میاں صاحب کے ظاہر و باطن کے یکساں ہونے سے موصوف کا مقصد یہ ہے کہ وہ جس طرح ظاہر میں انگریزی حکومت کے "وفادار" تھے، ویسے ہی باطن میں بھی اس کے وفادار ہی تھے۔ ظاہر میں وفاداری کا ثبوت ان کے زعم میں مسز لیسنس کا واقعہ ہے، اور باطن میں وفاداری کا ثبوت تلاشی اور تفتیش کا واقعہ ہے۔ مصنف "الحیاۃ" کے اس تاثر اور فیصلہ پر تو ہمیں کوئی تعجب نہیں ہے، اس لیے کہ ان کے دل و دماغ پر اپنے زمانہ کے حالات اور خارجی اثرات کا دباؤ تھا مگر جو لوگ آج اس استدلال کی کمزوری کو محسوس نہیں کر رہے ہیں یا جان بوجھ کر اس کمزور استدلال سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں، ان کے فکر و نظر پر تعجب اور ان کی ذہنیت پر افسوس ضرور ہے۔ چنانچہ جن اہل نظر حضرات نے ان واقعات پر منصفانہ غور کیا ہے، انھوں نے مصنف "الحیاۃ" کے استدلال کی کمزوری کو محسوس کیا ہے اور اس کا صاف صاف اعتراف کیا ہے۔ مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی لکھتے ہیں:

"فضل حسین مظفر پوری نے "الحیاۃ بعد المماۃ" میں میاں صاحب کو وقت کا لحاظ رکھ کر وفادار ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کی ہے۔"

دیکھیے مفتی صاحب نے کتنی صفائی سے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے کہ مولوی

فضل حسین صاحب (مصنف "الحیاۃ بعد المماۃ") نے "وقت کالحاظ رکھ کر" یہ بات لکھی ہے ورنہ ان کی دلیل میں کوئی جان نہیں ہے۔ مفتی صاحب کا بیان پورے حوالہ کے ساتھ پہلے بھی ایک جگہ نقل ہو چکا ہے:

مجھے تو رحم آتا ہے ان حضرات کی بے بسی پر جو خواہش اور کوشش کے باوجود میاں صاحب کی زندگی بھر کے واقعات میں سے ایک واقعہ کے سوا کوئی دوسرا ایسا واقعہ پانے میں کامیاب نہیں ہو سکے جس کو وہ ظاہری طور پر میاں صاحب کی "وفاداری" کے ثبوت کی دلیل بنا سکیں۔ صرف ایک مظلوم اور زخم خوردہ عورت کی جان بچانے کا واقعہ ہے۔ جس کو بار بار پیش کیا جاتا ہے اور پھیر پھیر کر اسی کو دہرایا جاتا ہے۔ اس واقعہ کی بابت ہم بہت تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں۔ خود میاں صاحب کے الفاظ اور بیان سے اس بات کو ثابت کر چکے ہیں کہ اس معاملہ کو انگریزی وفاداری اور خیر خواہی سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کا محرک انسانی ہمدردی اور اسلامی احکام کی بجاآوری کے سوا ہرگز دوسرا جذبہ نہیں تھا۔

اور اب تو میں یہ کہتا ہوں کہ اگر مصیبت زدہ انگریز عورت کو پناہ دینے کا اتفاقی واقعہ انگریزی حکومت کی وفاداری اور خیر خواہی کی دلیل ہے تو بہادر شاہ ظفر مرحوم کو (جن پر بغاوت کا مقدمہ چلایا گیا اور پوری بیدردی کے ساتھ جلاوطنی کی سزا دی گئی۔) انگریز کا سب سے بڑا خیر خواہ اور وفادار کہنا چاہیے، جنہوں نے اپنے شہزادوں کو خصوصیت کے ساتھ اس کی نصیحت کی تھی اور حکم دیا تھا کہ انگریز عورتوں اور بچوں کو انقلابیوں کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچایا جائے۔ ان کی حفاظت اور نگہداشت کی جائے، جیسا کہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے واقعات کے ایک چشم دید گواہ (عبد اللطیف) کا تاریخی روزنامچہ، ندوۃ المصنفین دہلی نے شائع کیا ہے۔ عبد اللطیف، دہلی کے معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے روزنامچہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس ہنگامہ کے زمانہ میں بھی دہلی کے لال قلعہ میں آمد و رفت رکھتے تھے، اور شاہی دربار کے بہت سے واقعات سے ذاتی طور پر واقف تھے۔ اسی روزنامچہ سے ۲۸ رمضان ۱۲۷۳ھ مطابق ۲۴ مئی ۱۸۵۷ء کا ایک واقعہ جو قلعہ میں بہادر شاہ کے دربار میں پیش آیا تھا، ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔ اصل روزنامچہ فارسی زبان میں ہے۔ لیکن اس کے مرتب (خلیق احمد نظامی) نے اس کا ترجمہ کر دیا ہے، اور وہ ترجمہ بھی اصل کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ ہم اختصار کے خیال سے صرف ترجمہ یہاں ذکر کرتے ہیں۔ عبد اللطیف مذکور کا بیان ہے کہ ہنگامہ کی افسوس ناک خبریں سن کر)

"درد سے بھری ہوئی اور نصیحت آمیز باتیں بادشاہ کی زبان پر جاری ہوئیں۔ خصوصاً مرزا مغل[1]، مرزا عبد اللہ[2] اور مرزا خضر[3] کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ متواتر معتبر خادموں کی زبانی (خبریں) سن کر ہماری طبیعت

---

[1] بہادر شاہ کے بیٹے تھے۔ ہنگامہ کے زمانہ میں سپہ سالار بنائے گئے تھے، دہلی کا نظم و نسق ان کے سپرد تھا۔ ہڈسن نے گولی مار کر شہید کر دیا تھا۔ ۱۲

[2] بہادر شاہ کے پوتے اور مرزا محمد شاہ رخ کے بیٹے تھے۔ ۱۲

[3] بہادر شاہ کے بیٹے تھے۔ ہڈسن نے نہایت بے رحمی کے ساتھ گولی کا نشانہ بنایا تھا۔ ۱۲

پریشان ہوگئی۔ ہم حیران ہیں۔ اس کا علاج ہمارے پاس نہیں۔
اس لیے کہ نہ کوئی ہماری بات سنتا ہے اور نہ کوئی ہماری بات کا اثر
قبول کرتا ہے۔ تمھیں چاہیے کہ اس وقت کسی مہدی کی تلاش نہ کرو۔
خود سوئے نہیں، بیکار نہ بیٹھو۔ بہادروں کی طرح اٹھو۔ اگر ہماری نصیحت
کا اثر لوگے تو یقیناً پسندیدۂ خدا ہوگے اور موروثی خزانہ پاؤگے۔ پس
سب سے پہلے مردانگی اور فرزانگی کے ساتھ انگریزوں کی عورتوں اور
بچوں کو ان ظالموں کے پنجے سے رہائی دلانے کا عزم کرو۔ ان
سفاکوں کا کام آزار دینا ہے اور ہماری نیت ان کی حفاظت اور
خدا کی رضا جوئی ہے۔ ایسا کرو کہ ان کی کوئی عورت، لڑکا یا کمزور اور معذور
آدمی ہلاک نہ ہو، ان سب کی نگہداشت کرو۔ ان کے کھانے پینے کا
سامان کرنے کے واسطے کسی نیک سرشت کو مقرر کرو جو ہر ایک کو کما حقہ
دے تاکہ وہ بھوک پیاس سے نہ مریں۔ ان کا قتل کرنا کریم النفسی کے
خلاف ہے اور شریعت کی بنیاد گرانے کے مترادف ہے۔ کیونکہ اس طرح
دین سے رشتہ منقطع ہو جاتا ہے اور انسان عذاب اور وبال میں گرفتار
ہو جاتا ہے۔ گناہگاروں کے شفیع ہمارے نبی ﷺ نے عورتوں اور
بچوں کے قتل سے منع فرمایا ہے۔ حضرت ابن عمر سے روایت
ہے کہ ایک عورت کی نعش حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے
زمانے میں کسی میدان کارزار میں پائی گئی۔ پس آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم نے اعتراض فرمایا اور عورتوں اور بچوں کے قتل سے منع کیا۔[1]

---

[1] مسلم ج ۲ ص ۸۴

اگر چہ یہ بات ظاہر ہے کہ یہ حکم و ممانعت ہماری جانب سے نہیں،
(شریعت کی جانب سے ہے) لیکن ان میں سے ہر ایک سرکش اور
خود بین ہے۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ ان مظلوموں پر جو ستم ہوا ہے وہ
دفتر قضا و قدر میں کہیں ہمارے نام نہ لکھا جائے۔ مولانا نظامی فرماتے
ہیں ؎ پذیرا سخن بود شد جائے گیر
سخن کز دل آید بود دل پذیر
کلام دل گیر تھا، اس لیے شہزادوں پر بھی اثر کر گیا۔ انھوں نے ہمت
کے قدم بڑھائے اور کامیاب ہوئے۔ مظلوموں کو خود لا کر کوتوالی کو سونپ
دیا اور ان کی حفاظت کی ہدایت کی، پس کوتوالی کے گھروں کو ان
کی جائے پناہ بنایا اور بعض کو قلعہ میں پناہ دی کہ کچھ مدت وہ وہاں زندگی
بسر کر لیں۔

(۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ص ۱۲۷)

اس اقتباس کو پڑھیے اور اندازہ کیجیے کہ انگریز عورتوں اور بچوں کے ساتھ سفاکی
اور بے رحمی کے برتاؤ سے بہادر شاہ مرحوم کے دل کو کتنا صدمہ تھا اور اس بارے میں
شریعت کے احکام کی خلاف ورزی کو دیکھ کر وہ کتنے رنجیدہ اور آخرت کے مواخذہ کے ڈر سے
کتنا پریشان تھے؟ پس بہادر شاہ کی طرح حضرت میاں صاحب کے دل میں بھی یہی دینی
جذبات اور ملی احساسات موجزن تھے، جنھوں نے ان کو مسز لیسنس کے ساتھ ہمدردی
کرنے پر آمادہ کیا تھا، جیسا کہ انھیں کے الفاظ سے ہم اس کو پہلے ثابت کر چکے ہیں۔ پس
ان جذبات کے پیش نظر اگر بہادر شاہ کا ہمدردانہ سلوک ان کے متعلق "وفاداری" اور

انگریز نوازی کا تصور نہیں پیدا کرتا تو پھر میاں صاحب کے متعلق یہ تصور پیدا کرنے والے یا تو ان کے معاند اور حاسد ہیں یا انگریزی استبداد سے بری طرح مرعوب ہیں۔ اللہ ان کی لغزشوں کو معاف کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں بہادر شاہ اور میاں صاحب دونوں کے جذبات میں موافقت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مسز لیسنس کو پناہ دینے کی بنا پر جب لوگوں نے میاں صاحب کو پریشان کیا اور بہادر شاہ کو اس کی اطلاع ملی تو وہ اس خبر کو سن کر بہت برہم ہوئے۔ فوراً شہزادوں کو ان کی خدمت میں بھیجا کہ جاکر اس کا انتظام کریں۔ اور ساتھ ہی شہزادوں کے ذریعہ اپنے حق میں میاں صاحب سے دعا کرنے کی التدعا کی، چنانچہ مذکورہ بالا "روزنامچہ" میں اس واقعہ کا بھی ذکر موجود ہے۔ ۱۲ر محرم ۱۲۷۴ھ مطابق ۳ر ستمبر ۱۸۵۷ء کے روزنامچہ میں عبداللطیف مذکور نے لکھا ہے:

"معز الملک رضی الدولہ بہادر مرزا محمد قدرت اللہ بیگ خاں بادلے پر دردآمدہ بہ خسرو برگزارد کہ مولوی سید نذیر حسین مردے از آلِ رسول است، ورع و تقوی مر او راست، شبانہ روز ہنگامۂ درس و تدریس بجائے تعالِ من مولوی محمد عبد الخالق مرحوم گرم می دارد، امروز ستم پروران بیگانگان پناہ دہی زنے نصرانیہ سوئے او سوءِ ظن آوردہ بخانہ اش شورشے بیہودہ ناپسندیدہ و نابجیدہ کردہ دلش را آزار دادہ۔ وقتش را ربودہ جور بے اندازہ و بدعتے تازہ روا داشتہ اند کہ از ان اہلِ عقیدتش را دل محزون و خاطر اندوہ ناک است۔

خسرو بلکنج گرامی ایشاں بر آشفت و بہ شاہزادگاں فرمود کہ مولوی

سید محمد نذیر حسین را کہ از شدت ناکساں پراشیدہ حال بودہ است وا رہانند و علیہ بے جا ازاں جا بردارند و استدعائے دعا برائے ما کنند کہ دعائے صلحاء و علماء موجب فلاح دین و دنیاست ۔ ایکے با بوقت بے کسی از اتقیاء و زہاد امداد دعامی خواستند، بعون اللہ نقش مراد بر چہرے کارمی دیدند، ہمانا مولانا از سادات حسنی و حسینی است، در حدیث پایہ اجتہاد گرفت ۔ در فقہ برتری مایہ ۔ در اصول آگاہی کمال دارد، در علم تفسیر بے مثال است، امروز در علم و عمل بے نظیر است، شب بازو سیف کار ایست، ہر آئینہ در پرستش ایزدی بزرگی گرفت، بہ پرورش ایزدی سرگی یافت، پسرش مولوی سید شریف حسین ہم باحادیث و تفاسیر سرمایۂ افزونے داشت، حیف کہ ہم دریں سال بعالم اعلیٰ شتافت و منظور برحق شد ۔ (ص ۱۰۳، ۱۰۴)

اسی کتاب کے صفحہ ۷۰ پر اس کا ترجمہ بھی ہے جو درج ذیل ہے ۔

"معز الملک رضی الدولہ بہادر مرزا محمد قدرت اللہ[1] بیگ خاں غمزدہ ہو کر آئے اور بادشاہ سے عرض کیا کہ مولوی سید نذیر حسین آل رسول سے ہیں، پارسا اور پرہیزگار ہیں ۔ میرے ماموں مولوی محمد عبد الخالق[2] مرحوم

---

[1] مرزا قدرت اللہ بیگ دہلی کے عمائدین میں شمار ہوتے تھے، ان کا خاندان عرصہ سے شاہان مغلیہ کے دربار میں اعلیٰ مراتب رکھتا تھا ۔ ۱۲

[2] مولوی سید عبد الخالق صاحب میاں صاحب کے استاد بھی تھے اور خسر بھی ۔ ۱۲

کی جگہ دن رات درس و تدریس کا ہنگامہ گرم رکھتے ہیں ۔ آج ظالموں نے ایک عیسائی عورت کو پناہ دینے کا ان پر شبہ کیا اور ان سے بدظن ہو گئے ۔ ان کے مکان پر بیہودہ شورش اور غیر سنجیدہ حرکتیں کیں ۔ ان کو آزار پہنچایا ، ان کا وقت ضائع کیا ، بے اندازہ جور و ستم اور بدعتیں روا رکھیں ، جس کی وجہ سے ان کے عقیدتمندوں کا دل غمگین اور المناک ہے ۔

بادشاہ ان کی کجروی پر غصہ ہوئے اور شاہزادوں سے فرمایا کہ مولوی سید محمد نذیر حسین کو جو نالائقوں کی سختی سے پریشان حال ہیں ، نجات دلائیں اور ان کے بیجا اور ناجائز غلبہ کو ختم کریں ۔ (مولوی صاحب سے) ہمارے لیے دعا کی التدعا کریں ۔ کیونکہ نیک لوگوں اور عالموں کی دعا ، دین و دنیا کی بہبود کا باعث ہے ۔ ہمارے آبا و اجداد بے کسی کے وقت ارباب زہد و تقوی سے دعا کے طالب ہوتے تھے ۔ اور مدد الٰہی سے اپنی مرادیں پاتے تھے ۔

یقیناً مولانا سادات حسنی و حسینی سے ہیں ۔ حدیث میں انھوں نے مجتہد کا مرتبہ حاصل کیا ۔ فقہ و اصول فقہ میں کافی کمال بہم پہنچایا ۔ علم تفسیر میں بے مثال ہیں ۔ موجودہ زمانے میں علم و عمل میں بے نظیر ہیں ۔ شب بیدار اور نیکوکار ہیں ۔ بے شبہ عبادت الٰہی میں انھوں نے بزرگی حاصل کی ہے ۔ معرفت خداوندی میں بھی عظمت پائی ہے ۔ ان کے صاحبزادے مولوی سید شریف حسین بھی تفاسیر و احادیث کا اچھا علم رکھتے ہیں ۔ افسوس کہ اس سال عالم بالا کو سدھارے اور " منظور حق " ہوئے ۔ "

۱۳۰۴

عبداللطیف کے اس بیان سے صاف عیاں ہے کہ بہادر شاہ کے دل میں میاں صاحب کی بڑی قدر و منزلت تھی، وہ میاں صاحب کے صلاح و تقویٰ، اور علم و فضل کی جلالت کے معترف و معتقد تھے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ بہادر شاہ کی نظر میں میاں صاحب انگریز نواز اور اس کے وفادار نہ تھے۔ ورنہ اس حریت پسند کی نگاہ میں ان کی وقعت گر جاتی۔

رہ گیا تلاشی اور تفتیش کا معاملہ (جس کو مولوی فضل حسین صاحب نے اپنے خیال میں وقت کی مصلحت کے لحاظ سے میاں صاحب کی "باطنی وفاداری" کی دلیل قرار دیا ہے) تو اس کی بابت عرض ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ جو بات ثابت ہو سکتی ہے۔ وہ یہ کہ سرحد پار کے مجاہدین کے پاس ہندوستان سے خفیہ طور پر جو امدادی رقوم وغیرہ بھیجی جاتی تھیں اور ان کے لیے جن جن لوگوں کو واسطہ اور جن جن مقامات کو مرکز بنایا گیا تھا، ان واسطوں اور مرکزوں میں سے میاں صاحب کی ذات کوئی واسطہ اور ان کی قیامگاہ اس کا کوئی مرکز نہ تھی۔ اس سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ میاں صاحب اس کام کے مخالف تھے؟ اور اس کے مقابلہ میں وہ انگریز کے وفادار تھے۔

ہم یہ کیسے مان لیں جب کہ مولانا عبید اللہ سندھی جیسے شخص نے اس کا اقرار کیا ہے کہ:

"مولانا نذیر حسین دہلوی اور مولانا عبد اللہ غزنوی مولانا ولایت علی کی پارٹی سے خاص تعلق رکھتے تھے۔" (سیاسی تحریک ص ۱۳۲)

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"اسی لیے مولانا نذیر حسین اور نواب صدیق حسن جیسے عالم بھی ان کا

(مولانا ولایت علی کا) ساتھ دیتے ہیں۔،،

(سیاسی تحریک ص ۱۳۴)

،،مولانا ولایت علی کی پارٹی، ان مجاہدین اوران کے معاونین کے علاوہ دوسری کون سی تھی جو سرحد کے پار انگریز کے خلاف محاذِ جنگ بنائے ہوئے تھے؟ تو پھر اس پارٹی سے خاص تعلق رکھنے اور اس کا ،،ساتھ دینے،، کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوا کہ پارٹی کے جملہ مقاصد کو بروئے کار لانے میں یہ حضرات بھی شریک تھے۔؟

مولانا سندھی اہلِ حدیث کے خیر خواہ نہ تھے، ان کی تحریریں شاہد ہیں کہ وہ اہلحدیث کے مخالف تھے۔ ہمیشہ اہلحدیث کی تنقیص اور توہین کے درپے رہتے تھے۔ حتیٰ کہ یہ بات بھی انھوں نے تنقید و تنقیص ہی کے ضمن میں کہی ہے۔ مگر اللہ کی شان ہے کہ یہ ہمارے حق میں مفید ثابت ہوئی، اسی کو کہتے ہیں ؏

عدو شود سببِ خیر گر خدا خواہد

